# اور اوکھے لوگ

ممتاز مفتی

بانو
شقّو

اور

داستان سرائے

کے نام

جہاں میں نے زندگی کے بہترین لمحے جئے

# مندرجات

-☆-

# مشکل بات

اصل میں، میں پہلی بات لکھنا چاہ رہا تھا مگر یہ میرے لئے اتنا مشکل کام ہے کہ میں اسے آج سے مشکل بات ہی کا عنوان دیتا ہوں۔ ممتاز مفتی نے اپنی کسی کتاب میں لکھا ہے کہ چوہدری برکت علی اُن کے مربی اور محسن تھے جنہوں نے اپنی ذہانت سے بوجھ لیا تھا کہ ممتاز حسین ہی ممتاز مفتی ہے۔

یہی صلاحیت شاید ممتاز مفتی میں بھی در آئی تھی اور شاید انہوں نے بھی بہت پہلے بوجھ لیا تھا کہ اصل میں اُن کا قاری کون ہوگا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آج انہیں پڑھنے والا ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ ممتاز مفتی نے میرے لئے ہی کہانی لکھی ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ ایسا صرف اس لئے ہے کہ انہوں نے بڑی عام فہم اور آسان زبان میں وہ کچھ لکھ دیا جو حقیقت میں ہوتا ہے۔ انہوں نے روزمرہ واقعات کو علمی و ادبی رنگ دینے اور مشکل الفاظ کا جامہ پہنانے کی بجائے جو جیسا ہے ویسے ہی بیان کر دیا۔ یہی اُن کی انفرادیت ہے کہ بات سمجھ آتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں آج اگر وہ لاکھوں لوگوں کے دلوں میں اپنی تحریروں کی وجہ سے زندہ ہیں تو اس کی واحد وجہ یہی عام فہم ابلاغ ہے۔ یہی بات میں نے بھی اُن سے سیکھی کہ موثر اور جامہ ابلاغ ہی سب سے اہم ہے۔ بات سمجھ آنی چاہیے۔ عالم اپنی بات کسی جاہل کو نہ سمجھا سکے تو قصور جاہل کا نہیں۔

دوسری اہم بات کہ ممتاز مفتی کی کتابوں کی بے حد مانگ ہونے کی بنا پر اب اُن کی

تمام کتابوں کی اشاعت و تقسیم کا نیا انتظام کرتے ہوئے یہ ذمہ داری الفیصل ناشران، لاہور کو سونپی گئی ہے جو پہلے ہی اُن کی مقبول کتابوں "علی پور کا ایلی" اور "الکھ نگری" کے پبلشر ہیں۔

مجھے اُمید ہے کہ اب الفیصل ناشران کے تحت شائع ہونے والی کتب نہ صرف طباعت کے لحاظ سے معیاری اور جاذبِ نظر ہوں گی بلکہ قیمت اور ہر جگہ دستیابی کے حوالے سے بھی بہتری ہوگی۔

عکسی مفتی

جولائی ۲۰۰۸ء، اسلام آباد

# پیش لفظ

دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۰ء

۱۹۸۶ء میں مَیں نے ''اوکھے لوگ'' آپ کی خدمت میں پیش کی تھی۔ اب ''اور اوکھے لوگ'' پیش کر رہا ہوں۔ اس مجموعے میں بارہ پرانی اور بارہ نئی شخصیتیں شامل ہیں۔ اسی وجہ سے کتاب کا نام بدل دیا گیا ہے۔ نئی شخصیتوں میں چند ایک جھلکیوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ تشنہ سہی لیکن جھلکیاں زیادہ پُراثر ہوتی ہیں۔ شخصیتوں کے یہ خدوخال وہ ہیں جو مَیں نے دیکھے، محسوس کیے، یہ میرا سچ ہے۔ حتمی سچ نہیں۔ مجھے شخصیت نگار ہونے کا زعم نہیں ہے۔ میرا علم خام ہے۔ میں صاحب نظر بھی نہیں ہوں لیکن میں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں میرا خلوص ضرور شامل ہے۔ ان تمام شخصیتوں کے لیے میرے دل میں بے حد عزت ہے۔ میں نے جان بوجھ کر کسی کی دل آزاری نہیں کی، ہوگئی ہو تو میں معافی کا خواستگار ہوں۔ یہ مضامین مختلف تقاریب رونمائی میں پڑھے گئے۔

ممتاز مفتی

☆

## پیش لفظ

پہلا ایڈیشن ۱۹۸۷ء

اُردو ادب میں شخصیت نگاری کا سہرا محمد طفیل کے سر پر ہے۔ طفیل نے اس صنفِ تحریر کو باقاعدہ طور پر اپنایا۔

پھر احمد بشیر نے بھی چند ایک تیکھی شوخ اور چونکا دینے والی شخصیتیں لکھیں۔ کاش کہ احمد بشیر سنجیدگی سے اس صنف کو اپناتا۔۔۔ لیکن اسے صحافت کھا گئی۔

اس کتاب میں مَیں بھی چند ایک شخصیتیں پیش کر رہا ہوں۔

طفیل کا انداز مجھ سے مختلف ہے۔ وہ جوڑ جوڑ کر کُل پیش کرتا ہے۔ میں توڑ توڑ کر جزو دکھاتا ہوں۔

جوڑ جوڑ کر کُل دکھانے کی عظمت کو میں مانتا ہوں۔ اس کے علاوہ طفیل کی طنز میں کاٹ نہیں اور اس کے اشاروں میں راج نرتکی کی نزہت ہے۔

دُکھ انسانی شخصیت کا جزوِ اعظم ہے، ہماری خوشیاں اور عیاشیاں آنسوؤں کی جھیل میں اُگے ہوئے کنول ہیں۔ شخصیت نگار شخصیت پر بات نہیں کر سکتا جب تک اس کے دل میں شخصیت کے لیے ہمدردی نہ ہو۔

شخصیت کی گہرائی کی بات کریں تو وہ جادوگر کے ڈبے کی مصداق ہے۔ ایک ڈبہ کھولو تو اندر سے دوسرا ڈبہ نکل آتا ہے۔ دوسرا کھولو تو تیسرا۔ ڈبے میں ڈبہ۔ ڈبے میں ڈبہ۔

تضاد کو دیکھیں تو شخصیت فقیر کی گدڑی ہے۔ پیوند ہی پیوند۔ بُنت میں رنگ میں کوالٹی میں شکل میں ہر ٹکڑا دوسرے سے مختلف ہے۔



انسانی شخصیت کا حیران کن پہلو اس کی پرکار سادگی ہے۔ یہ شمع ہر رنگ میں نہیں جلتی۔ بظاہر ایک رنگ۔ اس رنگ کے پردے میں ہفت رنگی۔

مجھے انسانی شخصیت کو سمجھنے کا زعم نہیں۔ نہ علم ہے۔ اور نہ وہ خصوصی حس جس کے بغیر شخصیت کو سمجھنا ممکن نہیں۔ اس لیے یہ مضامین جھلکیاں ہیں۔ دھندلی جھلکیاں۔

اس مجموعے میں زیادہ تر ادیبوں کی شخصیتیں شامل ہیں۔ ادیب کی شخصیت عام شخصیتوں سے اتنی ہی مختلف ہوتی ہیں جتنا پانی مٹی سے۔ اس میں لہریں اٹھتی ہیں، چھینٹے اڑتے ہیں، گھمن گھیریاں گھومتی ہیں۔

ادیب میں تین خصوصیات نمایاں ہوتی ہیں حس، شدت اور تضاد۔ اسی وجہ سے میں نے اس مجموعے کا نام ''اور اوکھے لوگ'' رکھا ہے۔ یہ نام بانو قدسیہ کے بیٹے ''سیری'' نے مجھے عطا کیا۔

میرا مفروضہ ہے کہ شاید ان مضامین کو پڑھ کر آپ ان کی تحریروں کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔ یہی اس کتاب کا جواز ہے۔۔۔ یا بہانہ۔

اس مجموعے کے دو حصے ہیں ایک میں وہ شخصیتیں درج ہیں جو میں نے لکھیں، دوسرے میں وہ جو مجھ پر لکھی گئیں۔ ان میں احمد بشیر، مسعود قریشی اور پروین عاطف شامل ہیں۔ اس کتاب کے لیے میں نے قد کے لحاظ سے ادیبوں کا چناؤ نہیں کیا صرف ان ادیبوں پر لکھا جن کے قریب رہنے کا مجھے موقعہ ملا۔ اسی طرح اس کتاب کی ترتیب میں بھی ناموں کی تقدیم و تاخیر ان کے ادبی رتبے کے حساب سے نہیں لگائی گئی۔ اس مجموعے کی اشاعت ذوالفقار تابش کی مرہونِ منت ہے۔

**ممتاز مفتی**

مکان ۲۲، گلی ۳۲

سیکٹر ایف، اسلام آباد

☆

# تعارف

بہت دیر پہلے مفتی کے بارے میں قدرت اللہ شہاب کا ایک جملہ پڑھا تھا ''مفتی کی دوستی ایک لاعلاج پھوڑا ہے، اس کی ٹیسوں میں لذت ہے''۔ اس وقت اس جملے کی تشریح مجھ پر پوری طرح واضح نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت میں اسے اپنے بھائی کا خبطی سا بدشکل دوست سمجھا کرتی تھی۔ ادیبوں سے ویسے ہی جان جاتی تھی۔ لگتا تھا الٹے سیدھے اکھر بول کر مجھے پتھر کی بنا دیں گے یا رومال کا کبوتر بنا کر اڑا دیں گے۔ مفتی کو دیکھ کر میں بڑبڑ کرتی ادھر ادھر بھاگنے لگتی تھی۔ اس کی چیزوں کے آر پار دیکھنے والی ''ٹکٹکی'' میرے اندر لوہیٹ قسم کا ردعمل پیدا کرتی تھی۔ یہ بہت پہلے کی بات ہے۔ شاید یہ میری ناقابل توجہ عمر کی وجہ تھی یا مفتی اپنے دونوں سرے جلا کر جینے کی سبیلوں میں تھا۔ اس نے میری طرف دوستی کی کوئی 'کائی' نہیں ماری تھی۔ کوئی پانسہ نہیں پھینکا تھا کسی قسم کا اکھ مٹکا کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ہاں اگر میں جانتی کہ مفتی کی دوستی ذیابیطس کی طرح ہمارے خاندان میں نسل در نسل چلنے والی ہے تو اسی وقت گھٹنا پکڑ کر بیٹھ جاتی۔ میرے مرشد! جو رستہ آپ نے کل دکھانا ہے اس پر آج ہی ڈال دیجیے۔

دراصل یہ ساری شرارت میرے ایک ماموں اشفاق حسین کی ہے۔ اسے کلاسیکی موسیقی کا روگ لگا ہے۔ زندگی بھر وہ جہاں بھی رہا سنگیت رس کے دیوانے اس کے ارد گرد اس طرح منڈلاتے رہے جیسے کرشن مہاراج کے ارد گرد گوپیاں۔

پتہ نہیں کب کی بات ہے۔ گورداسپور میں ماموں کی بیٹھک موسیقی کا دھرم شالہ ہوا کرتی تھی۔ بے سہارا شوقین فن کے دیوانے، فن کو سمجھنے والے، اسے سننے والے اپنی اپنی لگن جھولی میں ڈالے وہاں آتے تھے اور حسب توفیق راگ ودیا میں سے کچھ لے کر کچھ دے کر چلے جایا کرتے تھے۔ مفتی ان دنوں پینتالیس روپے ماہوار کا مفلوک الحال مدرس تھا۔ دل شکستہ۔ ادب کی راج نرتکی کہیں دور افق سے آنکھ مٹکا کر رہی تھی۔ پلو نہیں پکڑایا تھا۔ آنگن میں نہیں اتری تھی۔ ادبی محفلوں میں ابھی اس کے ذکر پر لوگوں کے کان کھڑے ہونا شروع نہیں ہوئے تھے۔ پھر اچانک کسی طرح وہ ماموں کی بیٹھک میں آ نکلا۔ وہاں اسے موسیقی کی چاٹ لگ گئی۔ راگ داری نے اسے دیوانہ بنا دیا۔ گلا نہایت بے سرا تھا۔ بھاگم بھاگ امرتسر گیا، طبلے کی جوڑی خریدی۔ کھیس میں باندھی اور ایک نہایت طوفانی رات کو جب کہ ماموں کی بیٹھک کا وقت ختم ہو چکا تھا اس کے دروازے میں آ بیٹھا۔ مجھے طبلہ سکھا دیجیے ورنہ میں برباد ہو جاؤں گا۔ میرا راستہ کھوٹ ہو جائے گا۔ خیر سے ماموں کے ڈیلے باہر آ گئے جی آپ اندر آ جائیے۔ باہر طوفان بڑا تیز ہے اندر آ کر بات کیجیے۔

طبلہ سیکھنے کی بات کا پتہ نہیں کچھ ہوا یا نہیں۔ ماموں نے اندھیری رات میں جس طوفان کو گھر میں گھسا لیا تھا۔ ابھی تک ہماری نیووں میں گھسا بیٹھا ہے اور اب تو وہ طوفان طوفان بھی نہیں رہا۔ ایک کیفیت بن گئی ہے۔ سانس لینے نہیں دیتی۔ اس کے بتے بنا روزمرہ آگے نہیں بڑھتے۔ زندگی کی شوبھا نہیں بنتی۔

دراصل قصور مفتی کا بھی نہیں۔ سوائے میرے باپ کے میرے اپنے لوگ بھی کسی ایسے ہی کی تلاش میں رہتے تھے جس کی کوئی تند سیدھی نہ ہو۔ صراط مستقیموں کے پاس بیٹھنے سے ہمیں آج بھی اُبکائیاں آنے لگتی ہیں۔ دم گھٹنے لگتا ہے۔ مفتی ملا تو اس کی ہر بات الٹی تھی۔ ابنارمل تھی۔ بے یقینی، بغاوت اور گمراہی سے بھری ہوئی تھی۔ وہ بھری محفل میں خدا کو گالیاں دیا کرتا تھا۔ مذہب، حساب کتاب تمام ''ازم'' کوڑا اس کے نزدیک سب کچھ انسان کی جبلی آزادی کے راستے کے پتھر تھے۔ انسان اشرف المخلوقات تھا۔ کائنات ازل ابد سب انسان کے تابع تھے۔ اسے کسی خدا کی دھونس قبول نہ تھی۔ وہ پیرنٹ اتھاریٹی کو ماننے کو تیار نہ تھا۔ سائنس اور نفسیات نے اس کے اندر طوفان برپا کر رکھے تھے۔ ان دنوں اس کا ایک ہی نعرہ تھا۔ پرانا توڑ پھوڑ دو۔ مسمار کر دو۔ سب کچھ نیا بنا دو۔

پھر اسے احمد بشیر مل گیا۔ میرا بھائی۔ وہ ان دنوں بالکل گرین یوتھ تھا بہترین را میٹر یل۔ ایسا کہ مفتی کے بھی فلوس اڑ گئے۔ وہ ماں باپ خدا اور معاشرے کے خلاف غصہ مشک نافے کی تھیلی کی طرح سسٹم میں لے کر پیدا ہوا تھا۔ رواں رواں آگ سے بھرا تھا۔ اس نے مفتی کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ یک نہ شد دو شد۔ احمد بشیر فرینکسٹین کا مانسٹر بن گیا، پورا گھر طوفان کی زد میں آ گیا۔ در و دیوار جگہ سے ہل گئے۔ میرے ماں باپ وضعدار تھے۔ کنفرمسٹ تھے۔ ماموں، مفتی، احمد بشیر نے ان کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیں۔ میرا باپ مفتی کا نام لینے سے پہلے لاحول پڑھا کرتا تھا۔ خاندان کو مفتی سے بچا لینے کی ترکیبیں سوچا کرتا تھا، لیکن مفتی کی آنکھوں میں کامرانی لشکارے مار رہی تھی ''پیرنٹ اتھارٹی'' قدموں میں رندھ رہی تھی۔ تغیر کے بادل گرجنا شروع ہو گئے تھے۔ معاشرے میں مفتی کا وجود چیلنج کے سمبل کے طور پر اُبھر رہا تھا۔

ادب کے میدان میں بھی اس نے اُنہی دنوں دھماکے کرنا شروع کیے تھے۔ لوگ بچارے تو کب سے توبۃ النصوح، منشی پریم چند، راشد الخیری بغلوں میں دابے مزے سے زندگی کاٹ رہے تھے۔ اردو ادب بیٹیوں کے جہیزوں کی زینت تھا۔ باغی کو یہ بات کب پسند تھی۔ اس نے رنگ رنگیلی ریڑھی پر مسالے دار چاٹ لگائی اور چوک میں کھڑے ہو کر ہانکے دینے شروع کر دیئے۔ ادھر دیکھو! میری طرف میں کیا لایا ہوں۔ بالکل انوکھا بالکل نیا۔ آپا۔ پیاز کے چھلکے، مہندی والا ہاتھ، چپ، ان کہی راہگیروں کے پینڈے کھوٹے ہو گئے۔ بہو بیٹیاں کھڑکیوں، دروازوں میں لٹک گئیں۔ وہ کنکھیوں سے دیکھتا۔ ہنس ہنس کر بغل سے تاش کے نئے نئے پتے نکالتا رہا۔

تحلیل نفسی، جذباتی گھٹن، جنسی تلذذ، نارمل، ابنارمل، ایسا جو پہلے واقعی نہیں دیکھا تھا۔ پورے ہندوستان کے ادبی حلقوں میں آپو دھاپ پڑ گئی۔ کون ہے کہاں سے آیا ہے۔ چمکیلا جھلمل کرتا۔

بات ساری چالاکی کی تھی۔ ہاتھ کی صفائی کی۔ ان دنوں مغرب میں نفسیات کا جھگڑا زوروں پر تھا۔ یورپ کا سارا ادب اسی ایک رنگ میں لت پت تھا۔ اردو افسانہ پریم چند کے



بعد طویل عرصے تک اسی ایک نہج پر چل چل کر کدو کی باسی بیل کی طرح سڑنا شروع ہو گیا تھا۔ مفتی وقت کے تقاضے سمجھتا تھا اس نے ایسا تڑکا لگایا کہ لوگ سوں سوں کر اٹھے اور وہ نئے کا جھنڈا ہاتھ میں لیے اردو کی بیٹھک میں اپنے لیے رانگا پیڑھا چن کر یوں ٹھٹھ کر بیٹھا کہ بڑے بڑے جغادری بے بس ہو کر رہ گئے۔ پرانا پاتال میں دفن ہو رہا تھا۔ نیا اُبھر رہا تھا۔ مفتی مگن تھا۔ شہرت کا چسکا لگ جائے تو اندر آتش بازیاں چھوٹنے لگتی ہیں۔ بے کلی ایک جگہ بیٹھنے نہیں دیتی۔ کائنات مٹھی میں کر لینے کی تڑپ جاگ اٹھتی ہے۔ مفتی کے اندر بھی جب شہرت کی کھکھروں نے بھن بھن شروع کی تو اسے ہندوستان چھوٹا دکھائی دینے لگا۔ نئی نئی امنگوں نے بے قرار کر دیا۔ بمبئی ان دنوں ایڈونچرز اور فارچون سیکرز کی جنت ہوا کرتا تھا۔ مفتی نے احمد بشیر سے کہا میکناز گولڈ تو بمبئی میں ہے۔ یہاں میدان چھوٹا ہے۔ وہاں چل کوئی ایسا رسالہ نکالیں جو بمبئی والوں کی آنکھیں خیرہ کر دے۔ فلم اور ادب دونوں میں ہلچل مچا دے۔ احمد بشیر کا تو خمیر ہی بارود سے اٹھا تھا۔ اس نے کہا چلو۔

لیکن ہندوستان کے اس ہالی وُڈ کی گلیوں میں ابھی وہ حیران پھر رہے تھے۔ قدم جمانے کی صورتیں سوچ رہے تھے کہ ۱۹۴۷ء آ گیا۔ کسی نے ایسا صور پھونکا کہ انسان غائب ہو گئے، عقیدوں نے کالی کے بارہ ہاتھ لگا لئے۔ ہندو، مسلمان، سکھ۔۔۔ نہ کوئی مفتی رہا، نہ کرشن چندر، مسلمان رہ گئے یا ہندو۔ مفتی ٹھٹھرا گیا۔ مذہب اور سیاست اس کے لیے دونوں ہی کریک تھے۔ اس کی رواں دواں زندگی میں ان کی کبھی کوئی ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی۔ جب سڑکوں پر چُھرے چلنے شروع ہوئے تو وہ بالکل ہی بوکھلا گیا۔۔۔ بمبئی میں نہ ہندو نہ مسلمان، مجھے کیا۔ جب خون کے چھینٹے اور تیز ہوئے تو اس نے کرشن چندر سے کہا دیکھو کرشن مجھے کسی رام، کسی رحیم سے کچھ نہیں لینا دینا۔ یہ کائنات میری ہے میں جہاں کہیں چاہوں رہوں۔ یہ کون ہوتے ہیں حصار کھینچنے والے۔ لیکن کسی نے اس کی ایک نہ سنی۔ لوگ اپنے اپنے خداؤں کے نام پر اپنی اپنی بہو بیٹیوں کے پیٹوں میں چُھرے گھونپنے لگے۔ مفتی سُن ہو گیا۔ بٹر بٹر تکنے لگا۔ میں کون ہوں۔ پھر ایک دن بمبئی میں کسی نے جھنجھوڑا کچھ پتہ ہے تیری ماں اور تیرا بیٹا وہاں بٹالے میں ہندوؤں کے نرغے میں آئے ہوئے ہیں اور تو

یہاں تماشا دیکھ رہا ہے۔ غیروں کی سرزمین پر۔ یہ گھڑی مفتی کے لیے کشف کی گھڑی تھی۔ اس کی زندگی کا عظیم ترین انقلاب تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس کے اندر ایک بھونچال آیا۔ کسی ان جانی طاقت نے اس کا رُخ ادھر سے ادھر کر دیا۔ ایک ایسا رُخ جسے وہ پہلے نہیں جانتا تھا اس نے گلا پھاڑ کر چیخنا شروع کر دیا۔

میرا نام ممتاز حسین ہے۔ میرا خدا ایک ہے۔ میرے وطن کا نام پاکستان ہے اور وہ پاکستان کی طرف اٹھ بھاگا۔ آوارہ بھینس کو پھاٹک میں ڈال دیں تو وہ کئی دن دیواروں سے ٹکریں مارتی رہتی ہے مفتی بھی ٹکریں مارنے لگا اس نے اپنے آپ کو پہلی بار کسی خاص گروہ کے حوالے سے پہچان تو لیا لیکن اس مسلک پر چلنا نہ آیا۔ آج تک نہیں آیا۔ کبھی صوفیوں کی جھولی میں جا بیٹھتا ہے کبھی مزاروں پر۔ پوچھو تو کہتا ہے میں صوفیوں کا ایرنڈ بائے ہوں۔ ان کا ٹیلیفون آپریٹر ہوں۔ ادھر کا سُوچ اُدھر لگاتا ہوں۔ اُدھر کا اِدھر قریبی لوگ کہتے ہیں لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک رہا ہے۔ کیموفلاج کرتا ہے، دراصل اس نے پا لیا ہے واللہ اعلم۔ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ قطب اکثر وہ بنتے ہیں جو پہلے چور ہوں۔

صاحبو! بتانے تو صرف اتنا بیٹھی تھی کہ مفتی کی دوستی کا لذیذ ٹیسوں بھرا پھوڑا میرے بھائی احمد بشیر کے ذریعہ مجھ تک کیسے پہنچا لیکن اس کی شخصیت کے گنجلوں میں پھنس گئی۔ شخصیت کے گنجلوں میں بھی عجب کشش ہے۔ گیٹی رکھیں کہیں پہنچ کہیں جاتی ہے۔ قلم اسی کے تابع ہو کر پتہ نہیں کہاں کہاں بھٹکنے لگتا ہے۔ مفتی مسلمان ہو کر پاکستان آ گیا۔ اس کی قلبی کایا پلٹ ہوئی یا نہیں اس کے ادبی رویے بدلے یا نہیں۔ دل ہتھیلی پر رکھ کر وہ کس کس گلی میں جا نکلا۔ کس کس نے جفائیں کیں، کس کس نے وفائیں کیں میں کچھ نہیں بتا سکتی۔ میں کسی گنتی شمار میں نہیں تھی۔ گڑیوں کے بیاہ رچاتی تھی۔ احمد بشیر کے بائیسکل کے اگلے ڈنڈے پر بیٹھ کر فلم دیکھنے جایا کرتی تھی۔

مفتی کے بارے میں ایک سحر سا تھا ذہن پر اسرار سا۔ جیسے پہاڑوں سے اتر کر آنے والے کسی جٹا دھاری سادھو کا ہوتا ہے۔



بڑی ہوئی تو ایک روز احمد بشیر بولا مفتی قلندر ہے۔ اسے صرف دینا ہی دینا آتا ہے لینا کچھ بھی نہیں آتا۔ اس کے خرقے پر کوئی جیب نہیں۔ میں نے کہا ہو گا لیکن میں تو خود گل بکاؤلی تھی۔ میرے فیری لینڈ میں ایسے سرپھرے قلندروں سادھوؤں کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ میں اس عمر کی ساری سنو وہائٹس کی طرح پھول توڑتی رہی۔ تتلیوں کے پیچھے بھاگتی رہی۔ جھیلوں کے پانیوں پر اپنا ہی عکس تراش تراش کر خوش ہوتی رہی۔

مفتی اپنے آپ کو چھپاتا رہا۔ مینا کاری کرتا رہا۔ لوگ نہ نہ کرتے۔ بے کل بے چین اسے پڑھتے بھی رہے اور تھو تھو بھی کرتے رہے۔ پھر تھو تھو نے عجیب جادو جگا دیئے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ملامتیہ فرقے کی طرح تھو تھو اس کے فن، اس کی شخصیت کے لیے بر شیر یوریا کا کام کرتی ہے۔ بنجر حصے بھی سر سبز ہو اٹھتے ہیں۔

جب وہ علی پور کا ایلی کی رنگین گٹھڑی اٹھا کر لایا تو اس کے وجود میں سے ہزار وولٹ کی لہریں نکل رہی تھیں، ہجوم میں مَیں بھی کھڑی تھی لوگ بے چین تھے۔ بے قرار تھے۔ خالص ریشم ہو گا۔ کوئی بولا، کمخواب لگتا ہے۔ دوسرے نے کہا ستارہ کی لان۔ گٹھڑی کھلی تو لوگوں کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں کانچ کے رنگین بنٹے، گندی لیراں، ٹھیکریاں، میٹھی گولیاں، کاٹھ کباڑ، چمکیلے زیور سب ایک ہی جگہ ایک ہی گٹھڑی میں اوپر تلے ڈھیر، دانشوروں نے کہا یہ شعبدہ باز ہے، پاکھنڈی ہے، مجھے پہلی بار غصہ آیا۔ آخر یہ مفتی کا بچہ مجھے بچہ کیوں سمجھتا ہے۔ برابر کیوں نہیں بٹھاتا۔

پھر فیری لینڈ میں چلتے چلتے میں نے اپنی زندگی کا پنڈورا باکس کھول لیا۔ کوڑیالے سانپ، زہریلے بچھو، لمبے دانتوں والی چڑیلوں، خونی جبڑوں والے عفریتوں نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ خوف سے میری چیخیں نکل گئیں۔ میں مفتی کے پاس بھاگی۔ آپ قلندر ہیں، دیالو ہیں، دوستوں کے دوست ہیں کوئی راستہ سمجھائیے۔ اس نے کوئی خاص منطق نہ بتایا۔ نصیحت نہ کی لیکن پہلی بار بیٹھ جا کہہ کر حلقہ بگوشوں میں شامل کر لیا۔

میری ایک عادت ہے کوئی انگلی پکڑائے تو مونڈھا اتار کر لے جاتی ہوں محرومی پھر بھی جینے نہیں دیتی۔ بیٹھے بیٹھے ترلیاں آتی رہتی ہیں۔ مفتی نے پاس کیا بٹھایا۔ میں نے اپنی

ساری ٹوٹ پھوٹ اس کے وجود کی نیم چھتی پر پھینکنا شروع کر دی۔ وہ مسکرایا۔ بی بی گھبراؤ نہیں ابھی تو دوسرا مونڈھا فارغ پڑا ہے۔ میں نے سوچا واقعی اسے دینا آتا ہے۔

نظر گھما کر دیکھا۔ دارالامان کا سماں تھا، وہ تو اپنے اردگرد میرے جیسوں کے ڈھیر لگائے بیٹھا تھا۔ میں کوئی مخصوص تو نہیں تھی۔ اس نے تو سبھی کو ایک ہی لے پر سدھار کھا تھا۔ میں ڈانواں ڈول ہو گئی۔ یہ کیسا ہنر ہے۔ کیسا کرشمہ ہے۔ صبح سے شام، شام سے صبح تک ہجوم ہے۔ ایک جمِ غفیر اپنے اپنے دُکھ، اپنی اپنی بیماریاں جھولیوں میں ڈالے اس کی دہلیزوں پر پڑا ہے۔ گرو دیو میری سنو، مہاراج میری طرف دیکھو! میرا جسم بیمار ہے۔ میرے دل پر گھاؤ ہیں۔ میں اکیلا ہوں ایک شانت سی مسکراہٹ چہرے پر سجائے وہ جھروکے میں سے درشن دیتا ہے۔ سینے سے لگاتا ہے۔ گھر گھر دوائیاں بانٹتا ہے۔ لوگوں کے گھاؤ سینے کے لیے سوئیاں دھاگے لیے پھرتا ہے۔ پھر بھی لگتا ہے اپنا آپ کسی کو نہیں دیتا کہیں اور ہی ٹنگا رہتا ہے۔

میں نے قدسیہ سے پوچھا وہ بولی اور قریب سے دیکھو۔ ہاں سچ تو یہ ہے کہ اب کھٹی میٹھی بولیوں۔ میٹھی پڑیوں اور ''جی آیاں نوں'' کے بہانے وہ دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا ہے خرقے پر جیبیں ہی جیبیں ہیں۔ صوفیوں نے ابھی تک کوئی مقام دیا ہے یا نہیں۔ یہ ساری راس اسی لگن میں رچی ہے۔ صوفیوں کے قریب ایل۔ ایس۔ ڈی نے اسے دُھت کر رکھا ہے، ہم منگو پیر جیسوں کی حاجت روائیاں نہ کرے تو اس کا اپنا پینڈا اکھوٹا ہوتا ہے۔

ایک دن میں تنگ آ گئی۔ میں نے جا کر جھنجھوڑا۔ انگاروں پر چل چل کر پاؤں راکھ ہو گئے ہیں۔ مجھے ولی نہیں بننا، اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا ہے۔ کاغذ قلم ہاتھ میں دے کر بولے جو راستہ دکھاؤں گا اسی پر چلنا ہو گا۔ اب مفتی کا ''سنیہا'' سینے سے لگائے ادب کی رو پہلی دنیا کی طرف رواں دواں ہوں۔ نیلے آسمانوں، ٹھنڈے میٹھے پانیوں کے پاس کھڑی ہوں وہ عاملوں والی چھڑی ہاتھ میں لیے کانی آنکھ سے دیکھ کر مسکراتا ہے۔ میری ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ اردو ادب کے لشکارے برداشت نہیں ہوتے۔ پتہ نہیں کہیں بیٹھنے کی جگہ بھی ملتی ہے یا نہیں۔ اسی اعتماد پہ قائم ہوں کہ دوستوں کے لیے تو اسے کچے گھڑے پر تیرنا پڑے تو گریز



نہیں کرتا۔ مجھ پر تو کئی بار اپنے ''انر سرکل'' کا لیبل لگا چکا ہے۔

جن دنوں میرے ماموں سے دوستی زوروں پر تھی۔ وہ میری ممانی سے بھی ملا تھا۔ اس کا فرادا کے چہرے پر کھلے گلاب اور ہونٹوں کی دہکتی لو دیکھ کر مفتی سُن ہو گیا تھا۔ شہر کنجاہ کی طرح ہمارے شہر ایمن آباد کے مہ وشوں کا ذکر بھی گرنتھوں میں ملتا ہے۔ اس نے ممانی کے آگے دامن پھیلا دیا۔ آپ کے شہر میں حسن اتنا سستا ہے۔ میرا گھر اور میرا دل دونوں سونے ہیں۔ اشفاق کی باری کے ناطے اپنے جیسا کوئی چراغ ہمارے آنگن میں بھی سجا دیجیے۔ درویش دعا دے گا۔

ممانی مسکرائی۔ اس کے خاوند کے شب و روز پر مدت سے مفتی کا قبضہ تھا اس نے سوچا جان چھڑانے کا اس سے نادر موقع کوئی اور نہ ہو گا۔ پھر مفتی تھا بھی تو ڈنگا چبا۔ ممانی کی معمولی شکل وصورت کی خالہ زاد کسی سہارے کی تلاش میں زندگی کے دن پورے کر رہی تھی۔ صوم وصلوٰۃ کی پابند، مٹی کا بے جان باوا۔ ایک پنتھ دو کاج۔ ممانی نے چپکے سے خالہ زاد کا ہاتھ پکڑا اور مفتی کی منتظر سٹیج پر بٹھا دیا۔ مفتی نے گھونگھٹ اٹھایا۔ اُف تک نہ کی اور سیزر کی طرح چپکے سے دم توڑ دیا۔ باغی سے انقلابی سے ایسی قربانی کی امید نہ تھی پر یاروں پر قربان ہو کر اپنی ذات میں پھول کھلانے کا بھی اسے پرانا چسکا ہے۔

گھر تو بس گیا پر اندر خالی کا خالی رہا۔ عورت والے خانے میں شعلے اور تیزی سے بھڑک اٹھے۔ اس کے لونگ کا لشکارا آج بھی اس کا راستہ کھوٹا کر دیتا ہے۔ اس کی ہر آہٹ پر آج بھی وہ ٹھٹک جاتا ہے۔ مانتا نہیں کہتا ہے نفسیات کا طالب علم ہوں۔ عورت کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ بھٹی تپنے لگے تو اپنا ساز و سامان اٹھا کر خود بھاگ نکلتا ہوں۔ کسی کے چھل بل میں نہیں آتا۔ میرا مشاہدہ بالکل برعکس ہے۔ ہند سے یاترا کر کے لوٹے تو ایک ہاتھ پکڑا۔ بے سہارا کمزور سمجھ کر۔ وہ ہاتھ شیرنی کا نکلا۔ اس نے اپنے ایریے میں کھینچ لیا۔ سہارے کی ضرورت تو ہے مہاراج۔ لیکن میں دھرم شالے کے لنگر میں بیٹھنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ برقعے میں سے پاؤں کی ایڑیاں دکھا کر عاشق کر لینے والی عورت کا وجود راکھ ہو چکا ہے۔ یہاں وہ آپ کا ''پائیڈ پائپر'' والا پرانا عمل نہیں چلے گا۔ آج کی عورت کے

ساتھ ڈیل کرنا کوروؤں، پانڈوؤں کا یدھ ہے حضور کچھ نیا ہے تو دکھایئے وہ کب چوکنے والا تھا۔ ایسا چیلنج تو اسے برسوں سے نہیں ملا تھا۔ اس نے کپڑوں پر پٹرول چھڑکا اور سب سے اونچی سیڑھی سے کود گیا۔ صوفیوں کے بالکے کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ اب دونوں ہاتھ چکی کے پڑوں تلے ہیں۔ کہتا ہے ''ریجوی نیٹ'' ہو رہا ہوں۔

کھول آنکھ زمین دیکھ فلک دیکھ والی کیفیت ہے۔ ٹکٹکی پر لگتے ہی یہ جو ایک ''سو وہاٹ'' کی کیفیت تھی مفتی میں اُبھر رہی ہے۔ پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ یہ آشفتگی پتہ نہیں کیا گل کھلائے گی۔ ہو سکتا ہے وہ مجذوب ہو کر پہاڑوں میں نکل جائے یا پھر سنگھاسن کے سامنے ہاتھ باندھے بیٹھے بیٹھے وہ منزل پا لے۔ بلھے شاہ۔ شاہ حسین والی۔

رانجھا رانجھا کردی نی میں آپے رانجھا ہوئی۔ لیکن دونوں صورتوں میں گھاٹا ہم جیسے منگتے منگو پیر کے بہروپ کا ہے جنہیں اپنی اپنی حاجتیں ہتھیلیوں پر رکھ کر مفتی جی مفتی جی کرنے کی پرانی عادت ہے لیکن شہاب صاحب ٹھیک فرماتے ہیں مفتی کی دوستی کا لذیذ ٹیسوں بھرا پھوڑا کاٹ کر پھینکا بھی تو نہیں جا سکتا۔

☆

انور سدید

۱۹۸۹ء

# سیدھی لکیر

شخصیت کے حوالے سے انور سدید دکھتا ہے کچھ زیادہ ہی دکھتا ہے۔ بولتا ہے۔ کچھ زیادہ ہی بولتا ہے۔ اتنا کچھ کہ لگتا ہے سب کچھ کہہ دینے پر تلا بیٹھا ہے۔ کچھ اندر رہنے نہ دے گا۔

دیکھو تو جیسے قوت ہی قوت لوہا ہی لوہا۔ جبڑوں تلے عزم کی گلوری دبائے بیٹھا ہے۔ جرأت ایسی جیسے ابھی باز کی سی جھپٹ لگائے گا لیکن انداز ایسا کہ دیکھنے والے کو خطرے کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

دیکھنے میں انور سدید بڑی غیر ادبی شخصیت کا مالک ہے۔ عمل ہی عمل مشقت ہی مشقت۔ فنکارانہ شخصیت عمل اور مشقت ان دونوں عیبوں سے پاک ہوتی ہے۔ دیکھنے میں مجاہد لگتا ہے، جرنیل لگتا ہے، محنت کش لگتا ہے، ادیب نہیں۔ چہرے پر نہ فکر ہے نہ تخیل نہ خواب۔ برتاؤ میں ادبی ادا سے محروم۔ فکری تفاخر سے کورا۔ تخلیقی نخرے سے خالی۔ فنکارانہ بناؤ سنگار سے بیگانہ۔

منشا یاد اور میرے درمیان ایک جھگڑا چل رہا ہے۔ سدا بہار قسم کا جھگڑا۔ میں کہتا ہوں منشا بے شک تو ادیب ہے، لیکن تو ادیب دکھتا کیوں نہیں۔

اس بات پر اسے بہت غصہ آتا ہے کہتا ہے میں۔۔۔ ادیب نہیں دِکھتا؟

میں جواب دیتا ہوں یہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ تو ادیب کیوں نہیں دِکھتا۔ وہ اور چڑ جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں بھائی میرے۔ کہ تو ادیب نہیں دِکھتا۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ تو

صرف مجھے ہی غیر ادبی نہیں دِکھتا گمان غالب ہے کہ دوسروں کو بھی ایسا ہی دِکھتا ہے۔ وہ غصہ میں کہتا ہے کیا ضمیر جعفری ادیب دِکھتا ہے، نہیں بالکل نہیں میں جواب دیتا ہوں۔ وہ عظیم مزاحیہ شاعر ہے لیکن دیکھو تو ایسے لگتا ہے جیسے منڈی کا آڑھتی ہو۔

منشا یاد اس بات کو سمجھنے سے منکر ہے کہ کچھ ادیب ادیب نہیں دِکھتے۔ کچھ دِکھتے ہیں مثلاً مظہر الاسلام دِکھتا ہے پرتو روہیلہ دِکھتا ہے۔ پھر جمیل جالبی ہے، مسعود قریشی ہے، رشید امجد ہے، منیر شیخ ہے۔ کچھ ادیب دیکھنے میں ادیب نظر نہیں آتے۔ مثلاً ضمیر جعفری ہے، منشا یاد ہے، جلیل عالی ہے، انور سدید ہے۔

ادیب عام طور پر ایبل شخصیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اور ایبل شخصیت کے خواص چھپانے سے چھپتے نہیں۔ یہ مَیں نہیں کہہ رہا۔ میری کیا حیثیت ہے کہ ایسی حتمی بات کہوں۔ یہ بات شخصیت کے مشاہیر کہتے ہیں۔

ہمارے ہاں خاکہ نگاری کو شخصیت نگاری کا مترادف سمجھا جاتا ہے۔ مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ خاکہ ایک سپر فیشل لفظ ہے اور اس میں تضحیک کا عنصر موجود ہے۔

شخصیت کے حوالے سے انور سدید بہت دِکھتا ہے۔ ازلی طور پر اُس کے سارے اوصاف باہر دھرے ہیں جس طرح حلوائی کی دکان میں ساری مٹھائیاں باہر دھری ہوتی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ انور سدید نے یہ اوصاف بناوٹ سجاوٹ کے لیے از خود باہر نہیں دھرے۔ اسے باہر دھرے دھرائے ملے ہیں۔

ادیب کی شخصیت میں عمل نہیں ہوتا خواب ہوتے ہیں۔ لوہا نہیں ہوتا لِف لِف ہوتی ہے۔ مشقت نہیں ہوتی آرام طلبی ہوتی ہے، توازن نہیں ہوتا طوائف ہوتی ہے۔

ادیب کی شخصیت میں تضاد ہوتے ہیں۔ وہ گنگا جمنی ہوتی ہے۔ کھٹ مِٹھی ہوتی ہے۔ ادیب کی شخصیت میں ٹیڑھ میڑھ کا ہونا ضروری ہوتا ہے لیکن انور سدید تو فٹے سے لگائی ہوئی سیدھی لکیر ہے۔

صاحبو میں اس صراط مستقیمئے سے مرعوب ہو سکتا ہوں، میں اس کا احترام کر سکتا ہوں، کرتا ہوں۔ لیکن میں اسے پیار نہیں کر سکتا۔ پیار عظمتوں پر نہیں آتا کمیوں پر آتا ہے، کجیوں



پر آتا ہے، مجبوریوں پر، لاچاریوں پر۔

انور سدید تخلیق کار بڑا بد قسمت ہے کہ وہ لت پت کے عالم سے محروم ہے۔

انور سدید فرد بڑا خوش قسمت ہے کہ وہ لت پت کی کیفیت سے پاک ہے۔

کئی ایک برس گزرے جب اچانک میرے لیے وہ ایک نام تھا۔ پھر اس کا پوسٹل پتہ دستیاب ہوا تو معلوم ہوا کہ سرگودھے میں ایک کپڑے کی دکان پر پڑا پایا جاتا ہے۔ کچھ دیر کے بعد پتہ چلا کہ وہ تو ایس ڈی او ہے۔ اس پر میرے ذہن کا فیوز اڑ گیا۔ یہ انور سدید کیا شے ہے۔ جو بیک وقت ادیب بھی ہے افسر بھی ہے۔ اسپیشلسٹ بھی ہے اور کپڑے کی دکان سے متعلق بھی ہے۔ لیکن اس کی تحریر میں نہ ریشم ہے، نہ دوا اور دو چار ہے، نہ افسر ہے، نہ انجینئر ہے۔

پہلے میں سمجھتا تھا کہ انور سدید ادب میں آغا کے زور پر اُبھر رہا ہے۔ لیکن انور سدید کا انداز بیان نکھرا تو یہ مفروضہ دم توڑ گیا۔۔۔ ارے یہ شخص تو سہارے کا محتاج نہیں الٹا اس میں تو سہارا دینے کی شکتی موجود ہے۔ پھر مجھے اس کی جسارت پر غصہ آنے لگا۔ یہ شخص آغا کو کیوں سہارے دے رہا ہے۔ آغا تو سہارے کا محتاج نہیں۔ پھر آغا پر غصہ آنے لگا۔ آغا اسے کیوں نہیں ٹوکتا۔ پھر دفعتاً خیال آیا شاید آغا ٹوکنے کی جرأت سے محروم ہو۔ کام کو دیکھو تو آغا سہارے کا محتاج نہیں۔ شخصیت کو دیکھو تو۔۔۔ شاید۔ کیا پتہ۔

اگر شخصیت ساتھ نہ دے تو کام اور صلاحیت کسی کام نہیں آتے۔ میری دوست پروین عاطف خوب لکھتی ہیں۔ اس کا سٹائل بڑا جاذب ہے۔ گذشتہ آٹھ سال سے میں اُسے یقین دلانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ اس کی تحریر بڑی دل نشین ہے لیکن اسے میری بات پر یقین نہیں آتا۔ وہ اس بات کی محتاج ہے کہ کوئی معقول اور معزز فرد دن میں دو بار اس کی کنڈی کھڑکھڑائے اور سنجیدگی سے کہے بی بی آپ خوب لکھتی ہیں۔

پچھلے سال کی بات ہے کہ شہاب نامے کا جائزہ لیتے ہوئے مشفق خواجہ نے اپنے کالم میں یہ عنوان لگایا تھا کہ: قدرت اللہ شہاب بڑی خوبیوں کے مالک تھے عیب صرف دو تھے اشفاق احمد اور ممتاز مفتی۔

اگر مشفق خواجہ کا شگفتہ انداز اپنایا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ: انور سدید بڑی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ کمزوری صرف ایک ہے۔۔۔ وزیر آغا۔

انور سدید سے پوچھو تو وہ اسے کمزوری نہیں سمجھتا وہ اس وصف پر فخر محسوس کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ جھنڈے پر لگا کر اُسے لہرائے۔ اپنی ساری زندگی اُسے لہرانے میں صرف کر دے پھر بھی آغا کا حق ادا نہ ہو۔

دراصل انور سدید کو شکر گزاری کا عارضہ لاحق ہے۔ میں خود گذشتہ تیس سال سے اسی بیماری کا شکار رہا ہوں۔ اب بھی ہوں۔ شکر گزاری کے جذبے کے تحت میں قدرت اللہ شہاب کو جھنڈے پر چڑھا کر لہراتا رہا ہوں۔ قدرت اللہ نے مجھے بہت سمجھایا میری منتیں کیں۔ جھاڑ جھپٹ کی لیکن میں نہ مانا۔ کیسے مانتا۔ میں اپنے جذبہ شکر گزاری کی تسکین کرنے پر مجبور تھا۔

صاحبو جتنا نقصان میں نے قدرت اللہ شہاب کی شخصیت کو پہنچایا ہے کسی اور نے نہیں پہنچایا۔ اس احساس کے باوجود میں آج بھی قدرت اللہ شہاب پر ایک کتاب لکھ رہا ہوں۔ اور اللہ سے دعائیں مانگ رہا ہوں کہ یا اللہ مجھے اتنی مہلت دے۔ توفیق دے کہ میں یہ کتاب ختم کر سکوں۔ انسانی شخصیت کی بھول بھلیوں کو کس نے جانا ہے کس نے سمجھا ہے۔

انور سدید کی زندگی سیدھی صاف و پاکیزہ اور سپاٹ قسم کی ہے۔ عزت، احترام، فرماں برداری، دیانت، محنت، مشقت کے سوا کچھ بھی نہیں اتنی ہموار کہ نہ مد نہ جزر نہ اوچان نہ نچان نہ لغزش نہ رومان اس کے والد صاحب دکاندار ہونے کے باوجود سچے مسلمان تھے۔ اسی وجہ سے شہر کے لوگ ان کی عزت کرتے تھے۔ ان پر اعتماد کرتے تھے۔ انہیں ثالث مقرر کیا کرتے تھے۔ بہت سے بھائی بہن ہونے کے باوجود انور سدید کو بچپن میں ماں باپ کی بھرپور محبت حاصل تھی۔

بچپن میں انور سدید میں صرف ایک عیب تھا۔ اسے مطالعہ کا شوق تھا۔ ان دنوں ایک آنہ لائبریری کا رواج ہوتا تھا۔ پڑھنے کے لیے کتابیں ایک آنہ فی یوم کرایے پر مل جاتی تھیں۔ گمان غالب ہے کہ انور سدید کی تمام پاکٹ منی ایک آنہ لائبریری کی بھینٹ چڑھ



جاتی تھی۔ مانا کہ ان کا گھرانا کھاتا پیتا گھرانا تھا لیکن بھائی بہن تعداد میں کچھ زیادہ ہی تھے اور والد صاحب دکاندار ہونے کے باوجود دیانت دار مسلمان تھے۔ اس لیے گمان غالب ہے کہ گھرانا بس کھاتا پیتا ہی تھا۔

مطالعہ کے شوق نے انور سدید کو بچپن کی بہت سی نعمتوں سے محروم کر دیا۔ کھیل کود، دوستی یاری، گٹھ جوڑ، لڑائی جھگڑے۔

سکول میں ہر جماعت میں پوزیشن حاصل کرتا تھا۔ اس لیے سکول سے بھاگنے کی عشرت سے محروم رہا۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد سول اوورسیئر کی ٹریننگ حاصل کی۔

گمان غالب ہے کہ اس نے اپنی خوشی سے ٹریننگ حاصل نہیں کی۔ سوچا ہوگا کہ جلد از جلد اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاؤں۔ والدین پر بوجھ نہ رہوں۔ ورنہ جسے مطالعے کی لت پڑی ہو، امتحانوں میں پوزیشن حاصل کرنے کا نشہ لگا ہو وہ کالج کو کب چھوڑتا ہے۔

اوورسیئر بننے کے بعد انور سدید نے پرائیویٹ طور پر منشی کیا، عالم کیا، فاضل کیا، پتہ نہیں کیا کیا کیا اور یوں براستہ بھٹنڈا گریجوایٹ ہو گیا۔

اس دوران میں شادی ہو گئی۔ محترمہ عزیزہ تھی۔ شادی ارینجڈ تھی۔ دلہن تالاب میں یوں آ کر گری جیسے پھول پتی ہو۔ پتھر ہوتی تو چھینٹے اڑتے، مدوجزر ہوتا، زیر و بم ہوتا، محترمائیں تو ازلی طور پر پھول پتی ہونے کے باوجود ازدواجی تالاب میں پتھر بن کر گرتی ہیں۔ چھینٹے اڑتے ہیں۔ اندازہ ہے کہ محترمہ بھی صراط مستقیمی تھی۔ ٹھنڈی میٹھی محبت کی طالب تھی۔ کوئی ہاٹ اینڈ سموکنگ ہوتی تو ہاتھ جلتے ہونٹ جلتے۔ آنکھیں جلتیں اور کچھ نہیں تو کتابیں ہی طاق پر رکھوا دیتی۔ لیکن کتابیں جوں کی توں سرہانے تلے پڑی رہیں۔ حیرت ہے یہ کیسی محترمہ تھی۔ انور سدید ایم اے ہوا، پی ایچ ڈی ہوا، ڈاکٹر بن گیا۔

انور سدید کا محکمہ ایسا تھا جہاں رشوت کی اینٹیں دھرے بغیر قدم اٹھانا ممکن نہ تھا۔ حیرت ہے کہ یہ دیانت کا متوالہ، اس دلدل کو کیسے پاٹ گیا۔

انور سدید میں ایک بہت بڑی خوبی ہے۔ طبعاً وہ ریفارمر نہیں ہے۔ اس کا مطالبہ یہ

نہیں کہ نہ رشوت لوں گا نہ لینے دوں گا، اس کے برعکس اس کا رویہ یہ ہے کہ میں رشوت نہیں لوں گا دوسرے لیتے ہیں، تو بسم اللہ پڑے لیں۔ اسی وجہ سے وہ اس دلدل کو پاٹ گیا۔

انور سدید کی شخصیت میں ''میں'' کا کلف نہیں لگا۔ اس کی سوئی ''میں'' پر نہیں اٹکی۔ اگر آغا پر نہ اٹکی ہوتی تو شاید ''میں'' پر اٹک جاتی۔ واقعی انور سدید کو آغا کا شکر گزار ہونا چاہیے۔

میرا ایک دوست ہے محمد عمر! اس کا ایمان ہے کہ اگر چیخ چلا کر بات کرنے سے گزارہ ہو سکتا ہے تو پھر مدھم آواز میں بات کرنے کی تکلیف کیوں کی جائے۔

ایسے ہی انور سدید سمجھتا ہے کہ اگر کڑی مشقت سے زندگی بسر کی جا سکتی ہے تو ہلکی پھلکی محنت کے جھنجھٹ میں کیوں پڑوں۔ نتیجہ یہ ہے کہ کوئی ادبی ایڈیشن۔ جریدہ اردو کا ہو یا انگریزی کا۔ کھول کر دیکھو تو انور سدید کا مضمون موجود ہوگا۔

حیرت کی بات ہے کہ انور سدید صبح چار بجے سے دفتر جانے کے وقت کے دوران میں لکھتا ہے۔ لکھتا بھور سے ہے لیکن تحریر میں کڑی دھوپ ہوتی ہے۔

تحقیق اور تنقید کی عظمت سے مجھے انکار نہیں۔ لیکن کنارے پر بیٹھ کر زندگی کے تلاطم کے متعلق عقل کی باتیں کرنا۔ اصولوں کے چھنکنے چھنکانا۔ تازہ سیب کے ہوتے ہوئے سیب کا مربہ کھانا۔ خود کو برتر سمجھنا اپنی سوجھ بوجھ پر اترانا۔ لیکن انور سدید کی تحریر خود ستائی سے پاک ہے۔ اور اگر سوئی نہ اٹکے تو کیا بات ہے۔

☆



۱۹۸۰ء

# غنڈہ

احمد بشیر کی کہانی نشیب و فراز کی کہانی ہے۔ ۱۹۶۳ء میں احمد بشیر کا انتقال ہو گیا۔ سات سال اس کی لاش بے گور و کفن پڑی رہی۔ سات سال اس کی بیوی اور بچے لاش کے سرہانے بیٹھ کر روتے رہے۔ پھر دفعتاً احمد بشیر نے آنکھیں کھول دیں۔ ''تم مجھے دفناتے کیوں نہیں۔'' وہ چلایا۔

آج احمد بشیر کا اوڑھنا بچھونا سوشلزم ہے۔ وہ روزنامہ ''مساوات'' میں ایک کونے میں بیٹھا سوشلزم پر دھڑا دھڑ اداریے لکھ رہا ہے۔ اس کے مردہ جسم میں پھر سے جان پڑ رہی ہے۔ اس کی نسیں پھر سے ہری ہو رہی ہیں۔ اس کا جسم جو نیلا ہو چکا تھا۔ پھر سے رنگ بدل رہا ہے۔ اس کے ذہن میں پھر ابال آ رہا ہے۔ فتنہ پھر سے بیدار ہو رہا ہے۔

یہ حادثہ کیسے ہوا۔ مردہ پھر سے کیسے جی اٹھا۔ کس مسیحا نے پھونک ماری۔ اس بارے میں کوئی نہیں جانتا۔ شاید احمد بشیر خود جانتا ہو۔ لیکن جاننے سے فائدہ جب وہ اسے مانتا ہی نہیں۔ جاننے کا شعور تو جبھی ہوتا ہے جب آپ بات کو مانیں۔ سچے دل سے مانیں۔

احمد بشیر ان چند لوگوں میں سے ہے جو ارسطو کی پھیلائی ہوئی خوش فہمی کا شکار ہیں جو سمجھتے ہیں کہ انسان ریشنل اینمل ہے۔ احمد بشیر ذہنیت کے لحاظ سے پکا دانشور ہے لہٰذا وہ عقل و ادراک کا قائل ہے اور جو حقیقت فہم میں نہ آئے اسے یوں رد کر دیتا ہے جیسے وہ حقیقت نہیں بلکہ مفروضہ ہو۔

احمد بشیر کا پھر سے جی اٹھنا ایک معجزہ ہے خصوصاً اس لیے کہ اس نے خود فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ جینا نہیں چاہتا۔ اس میں جدوجہد کی ہمت نہ رہی تھی اور مرنے کی جرأت نہ تھی۔

بدقسمتی کے اس چکر سے نکلنے کے لیے پھر وہ خوشاب کے ایڈووکیٹ کے پاس کیوں گیا۔ اس لیے نہیں کہ اسے روحانی امداد پر یقین تھا بلکہ صرف اس لیے کہ اس نے اپنے دوست کے اصرار کو رد کرنا مناسب نہ سمجھا۔

خوشاب کے ایڈووکیٹ بڑے عابد تھے اور خلاف از معمول بات کہہ دینے کے عادی تھے۔ انہوں نے کہا "میں تمہاری امداد نہیں کر سکتا چونکہ میں اس سیکشن سے متعلق نہیں ہوں البتہ میں تمہیں ایک بزرگ کا پتہ دے سکتا ہوں جو شاید امداد کا بیڑا اٹھا لیں۔ لاہور کے فلاں مضاف میں فلاں مقام پر ایک ویران مسجد ہے۔ ہر جمعرات کو مغرب کے وقت وہ بزرگ آتے ہیں دیا جلاتے ہیں اور پھر نماز پڑھ کر چلے جاتے ہیں۔ جب وہ دیا جلا رہے ہوں تو انھیں پکڑ لینا اور عرض حال کرنا۔ وہ لاکھ ٹالیں ٹلنا نہیں جب تک مدد کرنے کا وعدہ نہ کریں۔ اور ہاں انھیں یہ پتہ نہ چلے کہ میں نے تمہیں بھیجا ہے ورنہ میرا کورٹ مارشل ہو جائے گا۔

جمعرات کی شام کو احمد بشیر اس ویران مسجد میں انتظار کرتا رہا۔ آخر کار ایک بوڑھا مزدور داخل ہوا۔ جب وہ دیا جلانے لگا تو احمد بشیر نے لپک کر اس کا دامن پکڑ لیا اور عرض حال کیا۔ بوڑھا مزدور بہت ٹپٹایا۔ کہنے لگا۔ میاں جی کسی نے تم سے مذاق کیا ہے۔ میں تو مزدور ہوں چارپائیاں بُنتا ہوں مجھے ان باتوں سے کیا واسطہ؟ بوڑھے نے منتیں کیں لیکن احمد بشیر اپنی بات پر اڑا رہا۔ آخر بڈھے نے پینترا بدلا بولا تو چاہتا کیا ہے؟ احمد بشیر نے کہا بابا یا تو میری لاش کو دفنا دیا جائے اور یا زندگی عطا ہو۔ بڈھا بولا یہ کام ہمارے دائرۂ کار میں نہیں آتا۔ تو بورے والا چلا جا۔ وہاں موچی محلے میں لکڑیوں کا ٹال ہے۔ اس کے مقابل آغا کا مکان ہے۔ شاید تیرا کام آغا کے ہاتھوں ہو جائے۔ اسے مل کر مدعا بیان کرنا۔ کہنا ہم نے بھیجا ہے۔ جاتے ہوئے بڈھے نے زیر لب کہا اسے تو ہم سمجھ لیں گے جس نے تمہیں ہمارا پتہ دیا۔

بورے والا جا کر احمد بشیر نے موچی محلے کا پتہ لگایا، پھر ٹال کے سامنے کے گھر کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ اندر سے کوئی عورت بولی۔ آغا میدان میں گئے ہیں۔ پوچھتے پوچھتے احمد بشیر میدان میں پہنچا۔ وہاں فٹ بال کا میچ ہو رہا تھا۔ پتہ چلا کہ آغا میچ کھیل رہا ہے۔ میچ کے



اختتام پر جب احمد بشیر نے آغا کو دیکھا تو وہ حیران رہ گیا۔ ادھیڑ عمر کا یہ پہلوان نما فٹ بالر بھلا میرے لیے کیا کرے گا۔ اس نے سوچا۔

آغا سے عرض حال کیا تو وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔ بولا اگر فٹ بال کے متعلق کوئی کام ہوتا تو بات بھی تھی۔ دعا سے میرا کیا لینا دینا۔ احمد بشیر نے کہا میں خود نہیں آیا مجھے بھیجا گیا ہے۔ آغا نے قہقہہ لگایا بولا کسی نے تم سے مذاق کیا ہے۔ احمد بشیر واپس لاہور آ گیا۔

چند ایک دنوں کے بعد اتفاقاً سر راہے ایڈووکیٹ صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ ہنس کے پوچھنے لگے احمد بشیر صاحب آپ بتائیں کہ آپ کا کیا بنا۔ اپنی تو جواب طلبی ہو گئی۔ احمد بشیر نے سارا قصہ بیان کیا۔ اس پر ایڈووکیٹ صاحب بہت ہنسے بولے مسجد والے بزرگ ملے تھے۔ انھوں نے بہت ڈانٹا خبردار جو پھر کبھی کسی کو ہمارا پتہ دیا تو۔ پھر فرمایا اگر وہ سائل ملے تو اسے کہہ دینا تیرا کام ہو گیا ہے۔

اس کے کچھ عرصے کے بعد حمید جہلمی نے زبردستی احمد بشیر کا ہاتھ پکڑا اور اسے امروز کے دفتر میں لے گیا۔ حیرت کی بات یہ نہیں کہ حمید جہلمی احمد بشیر کو لے گیا بلکہ یہ تھی کہ احمد بشیر جہلمی کے ساتھ چلا گیا۔ چونکہ احمد بشیر نے غیر فلمی کام کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ احمد بشیر کی ضد ٹوٹ گئی لیکن کیسے۔ کیوں۔ یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔

ہاں۔۔۔ احمد بشیر اب چلتا پھرتا ہے، کھاتا پیتا ہے لیکن ابھی تک اس کی شخصیت گویا خواب آلودہ ہے۔ اس کی احمد بشریت پورے طور پر پیدا نہیں ہوئی۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی شخصیت پھر سے بحال ہو گی یا فتنہ نیم خوابی کے عالم میں رہے گی۔

گزشتہ تین سال میں میں نے احمد بشیر کی مالا کے بہت سے منکے دیکھے ہیں، گول، چوکور ہفت پہلو منکے۔ ان منکوں میں کوئی چھید نہیں کہ کر پرو کر شخصیت کی مالا بن سکیں۔ جب بھی مجھے گمان ہوتا ہے کہ میں احمد بشیر کو سمجھ گیا ہوں تو دفعتاً ایک نیا نویلا منکا ابھر کر ساری مالا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

شاید انسانی شخصیت شالامار باغ کی مصداق ہوتی ہے جس میں مختلف سطحوں پر کئی تختے ہوتے ہیں۔ ایک میں کٹے ہوئے پھولوں کے قطعے، ایک میں سنگ مرمر کی بارہ

دری اور فوارے۔ ایک میں جھاڑ جھنکار جنگل۔ اگر بات یہیں پر ختم ہو جاتی تو انسانی شخصیت میں اسرار کا پہلو اس قدر پریشان کن نہ ہوتا۔

شخصیت کے ان تختوں کے اردگرد چاروں طرف نگاہ سے پوشیدہ کمین گاہیں بنی ہوئی ہیں جن میں عجیب وغریب اوصاف اور رجحانات دبکے بیٹھے ہیں ایک ساعت میں ایک عفریت اپنی کمین گاہ سے نکلتا ہے اور ساری شخصیت پر حملہ کر دیتا ہے۔ دوسرے لمحے میں دوسرا رجحان اُبھرتا ہے اور ساری شخصیت پر یوں مسلط ومحیط ہو جاتا ہے جیسے وہ جز نہیں بلکہ کل ہو۔

خیر وشر کے لحاظ سے احمد بشیر کیکر کے درخت کی چھاؤں کے مصداق ہے۔ خیر کی گھنی چھاؤں میں یہاں وہاں کئی ایک مقامات پر شر کی کرنیں جگنوؤں کی طرح چمکتی ہیں۔

اس روز کیرو نے احمد بشیر کی شخصیت کے ایک ایسے ہی جگنو کی نشاندہی کی تھی۔ یہ ۱۹۵۸ء کی بات ہے۔

احمد بشیر محترمہ عطیہ سے دور ہاتھ پھیلائے بیٹھا تھا اور عطیہ موجود کیرو کے توسط سے احمد بشیر کی شخصیت کا جائزہ لے رہی تھی۔

ایک روز بر سبیل تذکرہ 'مسیرز' کی بات چل نکلی یعنی ان لوگوں کی بات جنہیں خواہ مخواہ کوشش کیے بغیر خواہش کیے بغیر پر اسرار طور پر مستقبل کی جھلکیاں نظر آتی رہتی ہیں۔۔۔ قدرت نے کہا تم عطیہ کو نہیں جانتے۔۔۔ ایک تو وہ پیدائشی "مسیر" ہے۔ اس کے علاوہ ایک پڑھی لکھی پاکیزہ اور عابد خاتون ہے۔ اس زمانے میں عابد ہونے کے باوجود عطیہ پر کوئی پابندی عائد نہ تھی لہٰذا حاجت مندوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔

جب ہم عطیہ کے ہاں پہنچے تو ملاقاتی کمرے میں بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ عطیہ باری باری پوچھ رہی تھی۔ آپ کیسے تشریف لائے۔

احمد بشیر کی باری آئی، تو وہ بولا۔ میں اپنا ہاتھ دکھانا چاہتا ہوں۔ میں تو اس فن سے واقف نہیں عطیہ نے معذرت کی۔۔۔ تو کیرو سے دکھا دیجیے۔ یہ احمد بشیر نے کہا۔

عطیہ مسکرائی۔ اچھا تو ہاتھ کھول کر میز پر رکھ دیجیے۔



عطیہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی گردن ڈھلک گئی۔ وہ ٹرانس میں تھی پھر ایک بیگانہ سی آواز آئی۔ یو آر کلیور۔ ویری کلیور۔ ویری ویری کلیور۔ مجمعے پر خاموشی طاری تھی احمد بشیر کی آنکھوں میں لڈو پھوٹ رہے تھے جیسے ویری کلیور ہونا بہت بڑا اعزاز ہو۔

میں تعجب سے احمد بشیر کی طرف دیکھ رہا تھا پندرہ سال کی رفاقت میں مجھے کبھی شبہ نہیں پڑا تھا کہ وہ چالاک بھی ہے۔ بیشک دلیر ہے۔ مخلص ہے اور دوسروں پر اثر ڈالنے کے لیے باتوں کے بھڑکیلے بٹنوں کو ٹکرانے کا عادی ہے۔ کیا کیرو مذاق کر رہا ہے۔

میری نگاہوں تلے ۱۹۴۶ء کی وہ ہنگامہ خیز شام آ گئی۔

اس شام احمد بشیر اور میں لاہور میں مال روڈ پر گھوم رہے تھے کہ مولانا صلاح الدین مل گئے۔ ہم دونوں مولانا کی میٹھی رسم زدہ اور نستعلیق باتوں میں کھو گئے۔

دفعتاً ایک شور بلند ہوا۔ نعرے گونجے اور سکھوں کا ایک جلوس موڑ کاٹ کر مال روڈ پر آ نکلا۔ وہ چلا رہے تھے تلواریں لہرا رہے تھے۔ پیچھے عورتیں سیاپا کر رہی تھیں۔ اس جلوس سے تشدد کے بھبھکے اٹھ رہے تھے جو سارے لاہور کو اپنی لپیٹ میں لیے جا رہے تھے۔ یہ قیامِ پاکستان کے خلاف لاہور میں پہلا منظم مظاہرہ تھا۔

صورتِ حال اچھی نہیں دکھتی، مولانا بولے۔ مجھے چلنا چاہیے میرا مکان ہندو محلے کے مرکز میں واقع ہے۔

سیدھے گھر جایئے، احمد بشیر بولا، دھواں اٹھ رہا ہے شعلے بھڑکیں گے۔ مولانا کے جانے کے بعد احمد بشیر کہنے لگا، چلو یار لگے ہاتھوں ہمشیرہ کو کرشن نگر سے نکال لائیں۔

ان دنوں میری ہمشیرہ کرشن نگر میں رہتی تھی اس کے میاں باہر دروازے پر تھے۔ گھر میں چار جوان لڑکیاں تھیں۔

میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ احمد بشیر ایمن گنگنا رہا تھا۔ جیسے میلے پر جا رہا ہو۔۔۔

احمد بشیر ازلی طور پر اڈونچر کا دیوانہ تھا۔ ساتھ ہی وہ بہت بڑا تماش بین ہے۔

جب ہم کرشن نگر میں داخل ہوئے تو بازار میں ہندوؤں کا ایک ہجوم تھا۔ درمیان میں مسلمان تانگے والے کی لاش پڑی تھی جس سے تازہ خون رس رہا تھا۔ ایک ہندو بڑھیا چلا

رہی تھی، وہ ہجوم سے مخاطب تھی۔ غنڈو تمہیں شرم نہیں آتی۔ تم نے اسے مار دیا۔ اس نے سٹیشن پر مجھ سے کہا تھا۔ ماں جی میں لے کے جاؤں گا تجھے کرشن نگر میں۔ میں تیرا پُتر ہوں، ماں جی تو ڈرتی کیوں ہے۔۔۔ اور ظالمو تم نے اس کے پیٹ میں چھُرا بھونک دیا۔

ہمشیرہ اور اس کی بیٹیوں نے فٹافٹ برقعے پہن لیے۔ برقعے نہ پہنو بہن میں نے غصے میں کہا یہ وقت برقعہ پہننے کا نہیں۔

میں برقعے بغیر باہر نہیں نکلوں گی وہ بولی۔

پہنے رکھو احمد بشیر بولا۔ موڑ مڑ کر پچھواڑے کی سڑک پر ہو لینا۔ میرا فکر نہ کرنا میں تم سے آملوں گا۔ اب میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ ان غنڈوں کی ایسی کی تیسی جب ہم گلی سے بازار میں پہنچے تو برقعہ پوش عورتوں کو دیکھ کر ہجوم کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ پہلے تو وہ حیران رہ گئے۔ پھر آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ پھر ان کے سرغنہ نے اشارہ کیا اور وہ ہماری طرف بڑھے۔ عین اس وقت ہجوم کے پیچھے سے احمد بشیر کا نعرہ گونجا۔ اللہ ہو اکبر۔ یا علی مدد۔

کرشن نگر میں اللہ ہو اکبر کا نعرہ۔۔۔ ہجوم ہمیں چھوڑ کر اس طرف متوجہ ہو گیا۔

ہم بھاگ کر پچھواڑے کی سڑک پر ہو لیے وہاں ایک مسلمان تانگے والا ہمیں دیکھ کر رُک گیا۔ آجاؤ آجاؤ وہ چلایا۔ چل موتی اس نے گھوڑے کو چھانٹا مارا۔ اللہ نے چاہا تو آج کرشن نگر سے نکل جائیں گے۔ نہیں تو جو اللہ کی مرضی۔

عین اس وقت احمد بشیر ایک گلی سے بھاگتا ہوا نکلا، رُک جاؤ وہ بولا، اس کی آنکھوں میں پھلجھڑیاں چل رہی تھیں۔ کرشن نگر سے باہر نکلے تو احمد بشیر نے تانگہ رکوا دیا۔ مجھے ایک کام ہے۔ وہ بولا تم چلو، کیسا کام؟ میں نے پوچھا۔

عظمت شاہ عالمی میں رہتا ہے۔ وہ ہندوؤں کا گڑھ ہے۔ مجھے اس کی خبر لینی چاہیے۔

عظمت کی خبر؟

احمد بشیر کا قریبی رشتہ دار عظمت۔۔۔ جسے احمد بشیر پلپلا کیڑا سمجھتا تھا۔ عظمت جو احمد



بشیر کی نگاہ میں ایک گھٹیا آدمی تھا۔ وہ عظمت جسے ملنے سے بچنے کے لیے احمد بشیر دو میل کا چکر کاٹنے میں خوشی محسوس کرتا تھا۔۔۔ وہ عظمت؟

عطیہ آنکھیں مونڈے سر لٹکائے بیٹھی تھی۔

کیرو فر فر انگریزی بول رہا تھا۔

محفل پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

نہیں نہیں احمد بشیر کلیور نہیں۔ میری نگاہ احمد بشیر پر جا پڑی۔ ہوں۔ ہوں اس کی آنکھوں میں فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ تم اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے کہ جو اپنی کلیورنس کا راز فاش کر دے وہ کلیور نہیں ہوتا۔

کشور میری عزیزہ تھی۔ اس کی عمر ۲۴ سال تھی۔ وہ میرے پاس بیٹھ کر روتی رہی اس کے والدین اس کی شادی نہیں کر رہے تھے۔

اس سلسلے میں جب میں اس کے والدین سے ملا تو انھوں نے پینترا بدل لیا۔ ہم کشور کی شادی کرنے کے لیے بالکل تیار ہیں بلکہ تم یہ کارِ خیر خود انجام دے دو۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ جب میں چلا آیا تو انھوں نے کشور کو پیٹا کہ اس نے بات باہر کیوں نکالی۔ اگلے روز وہ پھر میرے پاس بیٹھی رو رہی تھی۔ روؤ نہیں۔ میں تمہاری شادی کر دیتا ہوں۔ میں نے اس سے وعدہ کر لیا۔

پتہ نہیں اس کے والدین کو کیسے پتہ چل گیا۔ حالانکہ ہم نے کشور کے نکاح کی تاریخ کو راز میں رکھا تھا۔

اس کے والدین عین موقع پر سارے محلے کو اکٹھا کر کے آ گئے۔ انھوں نے ہمارے گھر کا گھیراؤ کر لیا۔

باہر کھڑے وہ غصے سے چیخ رہے تھے۔ یہ شخص ہماری بیٹی کو بیچ رہا ہے۔ اس نے اسے اغوا کر لیا ہے۔ باہر نکلو ورنہ ہم دروازہ توڑ دیں گے۔

گھر میں صرف دو مرد تھے۔ احمد بشیر اور میں۔ احمد بشیر بولا مجھے باہر جانے دو۔

میں نے کہا احمد بشیر چاہے کچھ بھی ہے وہ میرے رشتہ دار ہیں۔ وعدہ کرو کہ تم ان پر

ہاتھ نہیں اٹھاؤ گے۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ وہ بولا۔

ہم دونوں دروازہ کھول کر باہر نکلے۔

وہ سب مجھ پر جھپٹ پڑے۔

پھر پاس ہی سے احمد بشیر چلایا۔ لڑکی کی شادی تو میں کر رہا ہوں۔ میں۔

وہ مجھے چھوڑ کر احمد بشیر کی طرف لپکے۔۔۔ پھر وہ اپنے بچاؤ کے لیے داؤ کھیل رہا تھا۔ لیکن اس کے باوجود پٹ رہا تھا۔ وہ مسلسل پٹتا رہا۔ لیکن اس نے ان پر ہاتھ نہ اٹھایا حتیٰ کہ پولیس آ گئی۔ پھر جب امن بحال ہوا تو احمد بشیر قہقہے لگا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں میلہ گھومنی مسکرا رہی تھی۔ بار بار تو پڑی پر داؤ پیچ کھیلنے میں بڑا مزہ آیا۔ جب کوئی مجھے مارنے کے لیے جوتا اٹھاتا۔ تو میں پکڑ کر دوسرے کا سر اس کے آگے کر دیتا۔

اُونہوں۔۔۔ احمد بشیر تو سراسر احمق ہے۔ دیوانہ ہے۔ سوچے سمجھے بغیر دوسرے کے پھڈے میں اپنی ٹانگ اڑا دیتا ہے۔

کیرو فر بکے جا رہا تھا۔

احمد بشیر کی آنکھوں میں ستارے چمک رہے تھے۔

۱۹۴۴ء میں جب احمد بشیر پہلی مرتبہ مجھ سے ملا تو وہ نیا نویلا اور ''ہرا کچور'' نوجوان تھا۔ خوش شکل، شوخ، رنگین، لاابالی، بے پرواہ، شکل وصورت، دیکھتے تو صرف دوپٹے کی کسر تھی۔ انداز دیکھتے تو مونچھ ہی مونچھ پگڑی ہی پگڑی۔

وہ اپنی مامی کو یار کہہ کر بلاتا تھا، ماموں کو اوئے ماما۔۔۔ ہر راہ چلتی خوش شکل لڑکیوں کو یوں نگاہوں سے گھیر لیتا کہ وہ ٹھوکریں کھانے لگتیں۔ اجنبی لڑکیوں کو چھیڑنے میں ذرا نہ ہچکچاتا۔ منڈیر پر کھڑی لڑکی کو دیکھ کر چلاتا وہ دیکھو چاند نکل آیا ذرا گہنایا ہوا ہے۔ کھڑکی میں لگی ہوئی لڑکی کو دیکھ کر گانا گانے لگتا۔ لٹک لٹک لٹکے ساجنوا۔

اس کی چھیڑ چھاڑ میں غنڈہ پن کی جھلک ضرور تھی لیکن خواہش یا ہوس کا عنصر نہ تھا دراصل اسے لڑکیوں سے دلچسپی نہ تھی بلکہ لڑکیوں سے دلچسپی کے مظاہرے کا شوق تھا۔

احمد بشیر میں جنس کا شیرا گاڑھا نہیں بلکہ ایسا لطیف ہے کہ اس پر شربت صندل کا گمان



ہوتا ہے۔ احمد بشیر کو خالی کھیل سے دلچسپی تھی۔

احمد بشیر ایمن آباد کا ہے لاہور سے ۳۴ میل دور اونچی چونے گچی اٹاریوں والا مغلیہ دور کا قصبہ جو ہندو دیوانوں کی وجہ سے مشہور تھا جہاں بہت سے نومسلم خاندان آباد تھے جو اپنے کو شیخ کہتے تھے۔

گھروں میں صاف ستھری سگھڑ رکھ رکھاؤ کی شوقین میاں پر حکومت کرنے والی عورتیں سارا دن باورچی خانے میں ہنڈیا میں چمچہ چلانے اور گھر کے بیرونی تھڑے پر بیٹھ کر ہاتھ چلا چلا کر پڑوسنوں سے باتیں کرنے میں وقت گزارتی تھیں۔ اور پھر شام کو نہا دھو کر خوشبو لگا کر گجرے پہن کر اپنے تھکے ہارے تاجر میاں کو تازیانہ لگانے کے لیے تیار ہو کر بیٹھ جاتی تھیں۔ وہ اچھا کھاتی تھیں، اچھا پہنتی تھیں، لیکن پیسے پیسے کو گانٹھ میں باندھ کر رکھتی تھیں۔

اگرچہ آج وہ سب لکھ پتی ہو چکے ہیں لیکن ان دنوں ایمن آباد کے شیخ سبھی چھوٹے تاجر تھے۔ دن رات محنت کر کے پیسہ کمانا اور بیوی کے سامنے سر جھکائے رکھنا ان کا واحد مشغلہ تھا۔ ان کے نزدیک زندگی میں برادری رسم اور پیسہ تین اہم ترین باتیں تھیں۔ جن میں پیسہ پیش پیش تھا۔ پیسہ ان کی زندگی کا محور تھا۔ ایک واحد خیال ایک واحد جذبہ ایک جنون۔ پیسہ۔ پیسے کے خواب۔ پیسے کا حساب۔ پیسے کی باتیں۔

احمد بشیر اس ماحول کے خلاف مجسم صدائے احتجاج تھا۔ صرف صدا ہی نہیں۔ عملی انحراف۔ کھولتی ہوئی سرکشی۔ علانیہ بغاوت۔

احمد بشیر کو برادری، رسم اور پیسے سے کھولتی ہوئی نفرت تھی۔ آج بھی اس کے دل میں وہی نفرت موجود ہے۔ اگرچہ اب وہ کھولتی نہیں بلکہ ٹھنڈی ہے اور اسی وجہ سے اس کی دھار اور بھی تیز ہو گئی ہے۔ رشتے دار، رسم اور پیسے سے احمد بشیر کا انتقام ابھی پورا نہیں ہوا۔

احمد بشیر کے والد شیخ غلام حسین خوش شکل اور ایمن آباد کی روایات سے ہٹ کر تعلیم یافتہ نوجوان تھے۔ ان کا حسن سنگ مرمر کا سا تھا۔ ٹھنڈا جمال، اوّل تو ان میں آگ تھی ہی نہیں۔ تھی بھی تو جگنو سی ٹھنڈی آگ۔ جب وہ نوجوان تھے تو ایمن آباد کی نہ جانے کتنی لڑکیاں ان کے لیے ٹھنڈے سانس بھر بھر کر بجھ گئیں اور شیخ غلام حسین کو خبر بھی نہ ہوئی۔ جو

ٹھنڈی مٹی سے بنا ہوا سے خبر نہیں ہوتی۔ قدرت کا اصول ہے کہ ٹھنڈی مٹی سے بنے ہوئے افراد صراط مستقیم میں پناہ لیتے ہیں۔ اپنی کمی کو چھپانے کے لیے دوسروں کو نصیحتیں کرنے کا شغل اپنا لیتے ہیں۔ شیخ غلام حسین کا صراط مستقیم ان اجزاء کا بنا ہوا تھا جو ایمن آباد کی شیخ برادری کا اوڑھنا بچھونا تھے۔ برادری، رسم ناک اور پیسہ۔ باپ بیٹے کا تضاد بنیادی تھا۔ باپ کے نصیحتیں کرنے کے جنوں نے اسے ہوا دی۔ شرارہ الاؤ بن گیا۔

احمد بشیر کی والدہ جگنو نہیں بلکہ دیپک تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ کوئی انہیں جلا کر بھسم کر ڈالے یا وہ خود کسی کو جلا کر راکھ کر دیں۔ شیخ غلام حسین کو ٹھنڈی مٹی میں نہ تو جلنے کی قوت تھی اور نہ ان کے نورانی شعلے میں جلا کر بھسم کرنے کی۔ بیگم کو صراط مستقیم سے ہٹنا گوارا نہ تھا لہٰذا ان کی آگ نے رُخ بدل لیا۔ لاوا گرد و پیش پر پھیل گیا۔

باپ کو شعور تھا کہ پھیلتے ہوئے لاوے کی شدت اس کے اپنے شعلے کی نورانیت کی وجہ سے ہے لہٰذا وہ سراسر مجبور ہو کر رہ گئے۔

بیگم کو زندگی کی بجائے حکومت پر اکتفا کرنا پڑا۔ وہ مظلوم تھیں۔

احمد بشیر سراسر بغاوت تھا۔

میرا علم خام ہے۔ میں یہ نہیں جانتا کہ ایسا کیوں ہوا۔ صرف یہ جانتا ہوں کہ ایسا ہوا۔ احمد بشیر اور اس کے والدین کے باہمی تعلقات میں اوڈیپس کامپلکس کی چرخی اُلٹی چل گئی۔ نتیجہ یہ ہے کہ احمد بشیر کے دل میں ماں کے لیے کھولتی ہوئی نفرت ہے اور باپ کے لیے ہلکا ہلکا جذبہ ہمدردی اور بے پایاں ترس۔

اس زمانے میں احمد بشیر ایک ایسا راہی تھا جو ذہنی طور پر اپنوں کے قافلے سے الگ ہو چکا تھا۔ چونکہ نوجوان تھا اس لیے سہارا طلب تھا وہ کسی کھونٹی کی تلاش میں تھا جس پر خود کو ٹانگ دے۔

سب سے پہلے کھونٹی جو اسے ملی اس کا ماموں اشفاق حسین تھا۔

ایمن آباد کی شیخ برادری کی عمومیت کے نیلے آسمان پر یہاں وہاں ذہانت کے ستارے روشن تھے۔ جوہر تو تھا لیکن کوئی اظہار کا راستہ نہ تھا، ذہانت، روایت کے فکر اور پیسے



کی ہوس کے صحرا میں جذب ہو کر رہ جاتی تھی۔ پھر بھی جو افراد ان رکاوٹوں کے بوجھ سے قدرے آزاد ہوتے، ان کا جوہر شوخ انداز میں اُبھرتا۔

اشفاق حسین کے جوہر نے رنگ کا روپ دھار لیا تھا۔ اس کی شخصیت طرح دار تھی۔ انداز میں رس تھا، لے تھی، رنگ تھا۔ اشفاق حسین موسیقی کا دلدادہ تھا۔ اس میں سبھی کچھ تھا۔ لیکن تخلیقی جذبہ نہ تھا بلکہ اس کے برعکس سستی عیاشی کی طرف واضح جھکاؤ تھا۔

اشفاق حسین، احمد بشیر کو متاثر کر سکتا تھا لیکن جذب نہیں کر سکتا تھا۔ پھر۔۔۔ پتہ نہیں کس خوش فہمی کے زیر اثر احمد بشیر نے مجھے کھونٹی بنا لیا۔ اس نے دیا میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ احمد بشیر ایک جن ہے جو حاضر ہونے کے لیے اس بات کا محتاج ہے کہ کوئی دیا رگڑے۔ اسے ایک الٰہ دین کی ضرورت ہے۔

یوں ہم دونوں ساتھی بن گئے۔

اس زمانے میں مَیں زندگی کی منجدھار سے ڈوب کر نکلا تھا۔ میری زندگی کا عظیم ترین مشاہدہ ختم ہو چکا تھا۔ سب سے بڑی کامیابی حاصل کرنے کے بعد میں سب سے بڑی شکست کھا چکا تھا۔ نٹشے کہتا ہے: زندگی کا عظیم ترین لمحہ کون سا ہے وہ لمحہ۔۔۔ جب تمہاری سب سے بڑی کامیابی تمہاری سب سے بڑی آرزو تمہاری نگاہ میں ہیچ نظر آئے۔

ان دنوں میں اپنی زندگی کا وہ عظیم ترین لمحہ بیت رہا تھا۔ ہم دونوں انوکھے ساتھی تھے۔ میں میلے سے واپس آ چکا تھا۔ وہ میلہ دیکھنے جا رہا تھا۔ وہ کچھ کرنے کے لیے مضطرب تھا۔ میرے پاؤں میں ڈر اور احتیاط کی بیڑیاں پڑ چکی تھیں۔

وہ ”سودہاٹ“ کے دور میں تھا۔ میں کہیں ایسا نہ ہو جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو جائے کے بھنور میں ڈبکیاں کھا رہا تھا۔

وہ تڑپ تھا میں سکوت تھا۔

وہ زندگی تھا میں موت تھا۔

۱۹۴۷ء میں مکتبہ اردو کے مالک اور میرے دوست چودھری برکت علی نے بمبئی سے

ایک فلمی پرچہ ''فلمان'' جاری کرنے کے لیے ہم دونوں کو بمبئی بھیج دیا۔ بمبئی کے ایک مضافات اندھیری میں کرشن چندر کے گھر میں رہنے کے لیے ہمیں ایک کمرہ دیا گیا جس میں میراجی پہلے سے ہی براجمان تھا۔

ہم تینوں ایک عجیب تکڑی بن گئے۔ ایک جن ایک بہروپیہ اور ایک زندہ لاش۔ اپنے کلام کی انفرادیت سے لوگوں کو مسحور کرنے کے بعد میراجی نے ذات کی انفرادیت کا عظیم ڈھونگ رچا رکھا تھا۔ اس نے ذات کے بلیڈر میں اتنی پھونک بھرلی تھی کہ فائرسٹون ٹائر کا اشتہار بن کر رہ گیا تھا۔ ہاتھوں میں آہنی گولے تھے۔ سر کے بال جٹادھاری تھے۔ ماتھے کی تیوری میں سادھو کا شراپ تھا۔ بات کے انداز میں پنڈت چانکیہ سا ٹھہراؤ تھا۔ آواز میں اس زمانے کے ریڈیائی ڈرامے کا مصنوعی کھرج تھا جسے بخاری کے درباریوں نے رائج کیا تھا۔

میراجی نے احمد بشیر کو دیکھ کر ڈگڈگی اٹھالی اور اپنے انوکھے پن کا بندر نچانے لگا۔

اچھا ہوا نوجوان کہ تم ہمارے پاس آگئے۔ اس نے تمہید باندھی۔

کوئی اچھا بھی نہیں ہوا۔ احمد بشیر نے بے پرواہی سے کہا۔

تم ہمیں نہیں جانتے نوجوان!

میں میراجی کو جانتا ہوں۔

ہم ہی میراجی ہیں۔

اُونہوں احمد بشیر بولا۔ تم فرد ہو۔ تم وہ غلیظ کھوہ ہو جہاں وہ جن رہتا تھا۔

بات سمجھتے ہو میراجی نے پینترا بدلا۔

کچھ زیادہ بھی نہیں سمجھتا۔

دوسری بار جب میراجی نے ڈگڈگی اٹھائی تو احمد بشیر نے صاف الفاظ میں کہہ دیا۔ میراجی میں پہلے ہی آپ کی عزت کرتا ہوں۔ مداری کے کرتب دکھا کر مجھے مزید متاثر کرنے کی زحمت نہ کیجیے۔۔۔ ڈائن بھی پڑوس کے دو گھر چھوڑ دیتی ہے۔

میراجی کی ڈگڈگی رُک گئی۔



بمبئی میں مَیں احمد بشیر سے کہا کرتا تھا۔ احمد بشیر تم کیا نہیں کرسکتے۔ تم میں کرنے کی سبھی قوتیں موجود ہیں۔ یہ بڑے جو بھی ہیں۔ یہ سب بُت ہیں۔ اندر سے کھوکھلے۔ یہ الگ بات ہے کہ جب احمد بشیر کچھ کرنے کے لیے ہاتھ بڑھاتا تو میں چیخ کر کہتا ارے یہ تم کیا کر رہے ہو احمد بشیر۔ پاگل ہو گیا۔

بمبئی میں مَیں احمد بشیر کو اپنے قول وعمل کے تضاد کی چکی میں پیستا رہا۔ اگر پھر بھی احمد بشیر بچ نکلا تو یہ اس کی سخت جانی اور ڈھٹائی تھی۔

بمبئی میں وہ چاروں طرف بلاتکلف گھوما پھرا۔ اس نے بڑے بڑے بتوں کو ٹھونگے مارے۔ فلمی ستارے، ڈائریکٹر، پروڈیوسر، فن کار اور دانش ور وہ سبھی سے بے دھڑک جا ملتا۔

اس زمانے میں بمبئی میں پیر مغاں کی دھوم تھی۔ محفل میں نورتنوں کی بھیڑ تھی۔ تخلیے میں غلمان تھے۔ سڑک پر نکلتا تو ململ کا کرتا اور براق سا سفید پاجامہ زیب تن ہوتا۔ ہاتھوں میں سگریٹ کا ڈبہ۔ ادھر ادھر دونوں طرف بنے سجے مغبچے۔

پیر مغاں پڑھا لکھا تھا۔ کلچرڈ تھا۔ فن کار تھا اعلیٰ پائے کا دانش ور تھا۔ بات پیدا کرنے کا سلیقہ رکھتا تھا۔ بات پکڑنے کا گر جانتا تھا۔ باتوں میں کوئی اس سے بازی نہ لے جا سکتا تھا۔

احمد بشیر پیر مغاں کے پاس جا پہنچا۔ چھوٹتے بولا۔ ہمارے لیے ایک مضمون لکھیے۔

آپ کے لیے کیوں لکھیں۔ پیر مغاں نے بے پرواہی سے کہا۔

ہمارے لیے نہیں تو اپنے لیے لکھیے۔

وہ چونکا۔ کون ہو تم؟ کہاں سے آئے ہو؟

احمد بشیر ہوں۔ لاہور سے آیا ہوں۔

کسی نے بات کرنے کی تمیز نہیں سکھائی کیا؟

نہیں۔

ہوں۔ پیر مغاں نے قہقہہ لگایا۔ بات کہہ دینا جانتے ہو۔

اور بھی بہت کچھ جانتا ہوں۔

بات کرنا سیکھ لو تو۔۔۔

کیا فرق پڑتا ہے۔ احمد بشیر نے بے پرواہی سے کہا۔

بے باک، صاف گو، جاذب نظر، افلاطون بھی تم ایسے نوجوان کو پسند کرتا تھا۔ پیر مغاں نے مسحور کن نگاہوں سے احمد بشیر کی طرف دیکھا۔ امرد پرستی کے فلسفے کو جانتے ہو؟

جانتا ہوں۔۔۔ مانتا نہیں۔

سبھی مانتے ہیں۔ صوفی، فقیر، ادیب، شاعر، ایکٹر، موسیقار۔۔۔ تم کیا چیز ہو؟

میں عورت نہیں ہوں۔۔۔ البتہ نسائی کشش سے متاثر ہوتا ہوں۔

اس کی گھنی متحرک تاثر سے بھرپور بھنویں اُبھریں سمٹیں۔ عورت کی محبت تو صرف پیداوارانہ محبت ہے۔ عام لوگوں کا مشغلہ۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں زندگی بسر کرنے والوں کی وقت کٹی۔ امرد پرستی فن کاروں کا امتیازی نشان ہے۔۔۔ میں فن سے متاثر ہوتا ہوں احمد بشیر بولا فن کار کی شخصیت سے نہیں۔

پیر مغاں ٹھٹکا سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے آنکھیں بنائیں ہونٹ سکیڑے نظریں جھکا لیں۔ اس پر بھونڈی سپردگی طاری ہوگئی۔ آؤ وہ بولا۔ ہم تم دوست بن جائیں۔

احمد بشیر اٹھ بیٹھا۔ میرے پاس سستی عیاشی کے لیے وقت نہیں۔

پیر مغاں کا بُت اوندھے منہ گر کر پاش پاش ہوگیا۔۔۔ ان دنوں بمبئی میں چھرے چلتے تھے۔ نکڑوں پر دادا تاک میں بیٹھے رہتے تھے۔ چلتی بسیں رکوالی جاتیں۔ ماحول میں گھٹن تھی۔ ہراس تھا، تشدد تھا، احمد بشیر ان کوائف سے بے پروا تھا۔ چلتے ہوئے اس نے کبھی دائیں بائیں نہ دیکھا تھا۔ اسے یہ شعور نہ ہوتا کہ وہ کس علاقے میں گھوم رہا ہے۔ سڑکوں پر وہ سینہ تان کر چلتا تھا۔ جیسے اسے احساس ہی نہ ہو کہ وہ مسلمان ہے۔

اندھیری کی اس وسیع وعریض کوٹھی میں جہاں ہم مقیم تھے، احمد بشیر کے لیے ایک دل دھڑکتا تھا۔۔۔ چپ چاپ، چوری چوری، دور، احمد بشیر کے پاؤں کی چاپ سننے کے لیے دو کان کھڑے رہتے۔ دو آنکھیں متلاشی رہتیں۔

چاہے لاکھ پردوں میں ہو۔ کتنی ہی دور کیوں نہ ہو۔ اگر آپ کے لیے کوئی دل



دھڑکے تو اس دھڑکن کی آواز آپ کو چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے۔ پھر باقی تمام آوازیں ماند پڑ جاتی ہیں۔

ایک روز احمد بشیر نے اس دھڑکنے والے دل سے کہا۔ گوری کیوں روگ پال رہی ہو۔ کیوں ان ہونی کی آشا لگائے بیٹھی ہو۔ دیکھتی نہیں ہندو اور مسلمان کے درمیان نفرت کا چھرا چل رہا تھا۔

گوری کی آنکھ سے ایک آنسو گرا۔ احمد بشیر کے ہاتھ پر آج تک ایک جلتا نشان ہے۔

پھر لاہور سے روپے کی ترسیل بند ہوگئی۔ روپیہ حاصل کرنے کے لیے مجھے لاہور آنا پڑا۔ احمد بشیر پیچھے رہ گیا۔ میرے لاہور پہنچتے ہی راستے بند ہوگئے ڈاک تار کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ تقسیم عمل میں آگئی اور ہندوستان میں کشت وخون کا بازار گرم ہوگیا۔ احمد بشیر ہم سے کٹ کر رہ گیا۔ ایک اجنبی شہر میں بے آسرا بے وسیلہ۔

حیرت کی بات ہے کہ ستمبر کے وسط میں وہ ریل کے ذریعے امرتسر کے راستے صحیح و سالم لاہور کیسے آ پہنچا۔ صرف پہنچا ہی نہیں بلکہ پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتا ہوا پہنچا۔ علی حیدر۔ ہندو غنڈوں کو دھمکاتا ہوا پہنچا۔

اس زمانے کے احمد بشیر کی یاد تازہ ہوتی ہے تو آج کا احمد بشیر اجنبی لگتا ہے۔ اس احمد بشیر کی بوٹی بوٹی تھرکتی تھی۔ یہ احمد بشیر ایک بوسیدہ مرقد ہے صرف ذہن میں مدہم سی لو ہے جو اُس احمد بشیر کی خبر دیتی ہے۔

لاہور پہنچنے کے بعد جب ہم دونوں رہنے کے لیے ٹھکانہ تلاش کرنے کے خیال سے کرشن نگر کے ویرانے میں گھومتے پھرتے اور چلتے چلتے میں کسی عالی شان عمارت کو لالچ بھری نظروں سے دیکھتا تو وہ معاً چلاتا۔ ہاں اچھا گھر ہے میں اندر کود کر دروازہ کھول دوں؟

اُس وقت میرا جی چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے پوچھے بغیر اندر کود کر دروازہ کھول دے اور ہم تمام مال و اسباب پر قبضہ کر کے بیٹھ جائیں۔۔۔ لیکن میرا طبعی خوف مجھ پر غلبہ پالیتا۔ نہ نہ یوں دھاندلی سے نہیں۔ بلکہ جائز طریقے سے۔ اپنی بزدلی کو نیکی اور شرافت کے پردے میں لپیٹنے کی میری پرانی عادت ہے۔ ہمیں مال و اسباب کی ہوس نہیں۔ میں اسے سرزنش کرتا

ہمیں تو سر چھپانے کے لیے جگہ چاہیے۔

اچھا وہ کہتا۔ تو چلو چھوڑو۔ اور وہ چٹکیاں بجاتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔

پھر کرشن نگر میں مکانات الاٹ کرنے کے لیے ایک مجسٹریٹ مقرر کر دیا گیا۔

میں نے کہا احمد بشیر یہ مجسٹریٹ سیدھے طور پر ہماری بات نہیں سنے گا۔

اس کا جلوس نکال دوں؟ وہ بولا۔

نہیں۔ مہذب طور پر اسے زچ کر دو۔

صبح سویرے احمد بشیر مجسٹریٹ کے گھر جا پہنچا۔ جب مجسٹریٹ باہر نکلتا تو احمد بشیر آگے بڑھ کر اُسے فرشی سلام کرتا۔ جب مجسٹریٹ کرشن نگر پہنچتا تو احمد بشیر بھیڑ سے باہر نکل کر جھک کر آداب بجالاتا۔

دن میں مجسٹریٹ دس ایک مکان الاٹ کرتا تھا۔ ہر بار جب وہ الاٹ کرنے والے مکان سے باہر نکلتا تو احمد بشیر آگے بڑھ کر کہتا سلام حضور! چار دن میں مجسٹریٹ زچ ہو گیا۔ بولا کیا چاہتے ہو۔۔۔ سر چھپانے کے لیے ایک مکان احمد بشیر نے کہا۔۔۔ مجسٹریٹ نے حسب دستور ایک مکان کا تالہ توڑا حسب دستور اس کے لواحقین اور گماشتے اس مکان میں داخل ہو گئے۔ حسب دستور۔ دو گھنٹے تک وہ مکان کو لوٹتے رہے اور پھر مجسٹریٹ مکان سے نکلا اور حسب دستور ایک کاغذ احمد بشیر کو تھما کر بولا۔ یہ لو ہم نے مکان تمہارے نام الاٹ کر دیا۔

احمد بشیر اور میں دونوں اس مکان میں منتقل ہو گئے۔ اب احمد بشیر کی نوکری کا مسئلہ در پیش تھا۔ نوکری کے معاملے میں احمد بشیر بیک وقت بڑا خوش قسمت بھی تھا اور بد قسمت بھی۔

بی اے کرنے کے بعد پہلی نوکری جو اسے فوج میں ملی سویلین افسر کی تھی۔ اس کا ڈیزگنیشن پوئیٹ تھا۔ کام فوجیوں کی تفریح کے لیے ایک تفریحی ٹروپے تشکیل کرنا تھا۔ اس کا کمانڈنٹ ایک معمر انگریز کرنیل تھا۔ کرنیل صاحب کی دو نوخیز بیٹیاں تھیں۔ دونوں ہی احمد بشیر پر ریجھ گئیں۔ ان کا مطالبہ تھا کہ جوانوں کی تفریح کا سامان کرنے سے پہلے انہیں



انٹرٹین کیا جائے۔ بات یہاں تک رہتی تو شاید گزارا ہو جاتا۔ لیکن کرنیل صاحب کی نوجوان بیوی نے لندن سے آ کر جلتی پر تیل ڈال دیا۔ وہ اس پر مصر ہو گئی کہ اس کھیل میں اُسے بھی شامل کیا جائے۔ ابھی تک احمد بشیر منہ زبانی گزارہ کر رہا تھا۔ بیگم صاحبہ منہ زبانی کی قائل نہ تھی لہٰذا احمد بشیر بھگوڑا بن گیا۔ تقسیم کے بعد دوسری نوکری جو اسے ملی کپڑا انسپکٹر کی تھی۔ کوشش کے باوجود احمد بشیر اس نوکری پر قائم نہ رہ سکا۔ چونکہ اس کام سے اسے ایمن آباد کی شیخ برادری کی بُو آتی تھی۔ اب پھر اس کی ملازمت کا سوال در پیش تھا۔

ایک روز بر سبیل تذکرہ میں نے کہا یار تم صحافی کیوں نہیں بن جاتے۔

چلو صحافی بن جاتے ہیں احمد بشیر نے یوں کہا جیسے صحافی بننا گلاب جامن کھانے کے مترادف ہو۔

اسی شام وہ پاکستان ٹائمز کے نیوز ایڈیٹر محمود سے جا ملا۔ محمود نے کہا مولانا چراغ حسن حسرت اُردو کا ایک نیا روزنامہ امروز نکال رہے ہیں ان سے ملو۔ ان دنوں مجید پاکستان ٹائمز کے بیرونی برآمدے میں بیٹھا تھا۔ احمد بشیر اس سے جا ملا۔ بولا مجھے مولانا حسرت سے ملا دو۔ مجید نے کہا ملائے جاؤ گے تو گھاٹے میں رہو گے۔ اپنے زور پر ملو گے تو شاید۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ احمد بشیر کسی سے ملنے سے ہچکچا رہا تھا۔

مولانا چراغ حسن حسرت عالم آدمی تھا۔ اس کا مطالعہ وسیع تھا۔ زبان دان تھا۔ تہذیب و تمدن اس کی نس نس میں رچے ہوئے تھے۔ منہ پھٹ تھا لیکن بات کرنے کا سلیقہ جانتا تھا۔ وہ انسانیت کا دلدادہ تھا۔ اور پرانے نوجوانوں کی طرح پی کر چوباروں پر جانے کا شوقین تھا۔

مولانا چراغ حسن حسرت نے بڑے تحمل سے احمد بشیر کی بات سنی۔ پھر بولا صاحب تمام جگہیں تو پُر ہو گئیں۔ چند روز پہلے آتے تو شاید کچھ ہو سکتا۔ مولانا کا انداز اس قدر سنجیدہ اور فیصلہ کن تھا کہ احمد بشیر اٹھ بیٹھا۔ عین اس وقت چپڑاسی چائے لے آیا۔ اگر چپڑاسی چند ساعتوں بعد آتا تو احمد بشیر کی تمام تر زندگی کا زاویہ ہی بدل جاتا۔

چائے پیتے پیتے مولانا نے اخلاقاً کہا۔

احمد بشیر بیٹھ گیا۔

کلرکی کریں گے؟ مولانا نے کچھ کہنے کی غرض سے کہا۔

نہیں۔

لکھنے پڑھنے سے دلچسپی ہوگی۔

کوئی ایسی بھی نہیں۔

ترجمہ کرسکتے ہیں آپ؟

ہاں۔

کبھی کیا۔

جروم کے جروم کی کتاب ''دے اینڈ آئی'' کا کیا تھا۔ مسودہ بمبئی رہ گیا۔

کیسا تھا؟

خاصہ گھٹیا تھا۔

مولانا چونکے۔ آج کل کیا کرتے ہیں؟

کچھ بھی نہیں۔

گزارہ کیسے ہوتا ہے؟

روٹی ایک دوست کھلا دیتا ہے۔ کپڑے اس کی بیوی دھلوا دیتی ہے۔ سگریٹ ادھر ادھر سے پی لیتا ہوں۔ چائے کی عادت نہیں۔ بس کا انتظار نہیں کرسکتا لہٰذا پیدل چلتا ہوں۔ کوئی خاص خرچہ نہیں۔ مولانا کی بھنویں سمٹیں پھیلیں اور پھر سمٹ گئیں۔ دیر تک وہ چپ چاپ سگریٹ کے کش لگاتا رہا پھر بولا۔

مولانا اگر آپ کو رکھ لیا جائے تو کتنے روپوؤں کی ضرورت ہوگی؟

پانچ سو۔

پانچ سو۔۔۔ مولانا نے حیرت سے دہرایا۔

مجھے روپیہ خرچ کرنے کا شوق ہے۔

لیکن مولانا حسرت نے کہا۔ پانچ سو تو مجھے ملتے ہیں۔ آپ کو کیسے دے سکتے ہیں۔



تو نہ دیجیے۔ آپ نے پوچھا کتنے کی ضرورت ہے۔ میں نے بتا دیا۔

عجیب ہیں آپ۔ حیرت نے مولانا کا توازن ہلا دیا۔

تجسس نے بات آگے بڑھائی۔۔۔ پھر۔۔۔ آدھ گھنٹہ بعد وہ دونوں سٹفلز میں بیٹھے پی رہے تھے۔ مولانا کو احمد بشیر کے عجیب ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔ احمد بشیر کو مولانا کی معصومیت پسند آئی تھی۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ دونوں کھل گئے۔

مولانا نے باگیشری کا الاپ سنایا۔

احمد بشیر نے فحش بولیاں سنائیں۔

پھر جنسیات پر بات چل نکلی۔

مولانا نے فرائڈ کا ذکر چھیڑا۔

احمد بشیر نے ہیولاک ایلس کی کیس ہسٹریاں سنائیں۔

مولانا نے کام سوترا کی بات کی۔

احمد بشیر نے آسن گنوائے۔

پھر مولانا نے ملایا کی رنڈیوں کے کوائف بتائے۔

احمد بشیر نے دیوداسی کے لبھانے کی تفصیلات سنائیں۔

دفعتاً مولانا چراغ حسن حسرت بولے۔ بات وہ جو بروقت ہو۔ برمقام ہو۔ اور وہ دونوں ہیرا منڈی کی طرف چل پڑے۔

اور احمد بشیر جرنلسٹ بن گیا۔

مولانا حسرت اور احمد بشیر کا تعلق اپنی نوعیت کا انوکھا تعلق تھا۔ جس میں بیک وقت نفرت اور کشش دونوں جذبے کارفرما تھے۔ نفرت احمد بشیر کی ناپختہ کاری تیزی اور شوریدگی پر جو مولانا کو ناپسند تھی۔ کشش اس کی بے جھجک جرأت پر جو مولانا کو نصیب نہ تھی۔

صبح کو مولانا سو فیصد ایڈیٹر ہوتے اور احمد بشیر ایک خام صحافی۔ مولانا کی طنز کی دھار میں بلا کی کاٹ ہوتی، مولانا احمد بشیر سے کہتے:

"مولانا یہ کیا لکھا ہے آپ نے؟"

"اچھا تو یہ نئی ترکیب ایجاد فرمائی ہے آپ نے۔"

"معلوم ہوتا ہے جناب صحافت کو نئے زاویے بخشنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

جوں جوں شام ہوتی مولانا کے لہجے کی تلخی کم ہوتی جاتی اور پھر جب دفتر کا کام ختم ہو جاتا تو وہ کسی بہانے احمد بشیر کو بلاتے اور سرسری انداز میں کہتے۔ آپ نے کام ختم کر لیا مولانا۔۔۔ کہیں چائے کا پیالہ پئیں چل کر۔۔۔ پھر سٹفلز اور وہاں سے ہیرا منڈی، پر پیچ لالٹینی گلیاں جھنجھناتے چوبارے۔

مولانا اور احمد بشیر نے ممبی کے چوک میں مل کر بھنگڑا مارا۔ راہ چلتی خواتین پر آوازے کسے۔ رنڈیوں سے چھیڑ چھاڑ کی۔

وہاں پہنچ کر مولانا۔ علم اور رکھ رکھاؤ کی دستار کے بوجھ سے آزاد ہو جاتے تھے اور نیچے سے ایک پیارا سا معصوم بچہ نکل آتا تھا۔

احمد بشیر کا کہنا ہے کہ ان دنوں جو آزادگی اور آسودگی انہیں ہیرا منڈی کے چوباروں کی دہلیزوں پر ملی اور کہیں نہیں ملی۔ اس آسودگی میں صرف ایک خلش تھی احمد بشیر پر مولانا کو سنبھالنے کی ذمہ داری پڑ جاتی تھی اور یہ فکر دامن گیر رہتا کہ رنڈی مولانا کے جیب سے پیسے نہ اڑا لے۔

دن کے وقت احمد بشیر صحافت کے میدان میں بچوں کی طرح قدم بہ قدم چلتا اور مولانا اسے خبردار کرتے ڈانٹتے۔ رات کو ہیرا منڈی میں مولانا بچے کی طرح لڑکھڑاتے اور احمد بشیر اسے سنبھالتا سہارا دیتا۔ جرأت دلاتا۔

پھر نہ جانے کن حالات میں مولانا اور احمد بشیر کراچی ریڈیو پر سکرپٹ رائٹرز کی حیثیت سے چلے گئے۔ لیکن بخاری میں اتنا ظرف نہ تھا کہ وہ چراغ حسن حسرت ایسے عالم کے مقام کو تسلیم کرتا۔ اس کا احترام کرتا۔ بخاری برادران اگرچہ اعلیٰ پائے کے دانشور تھے لیکن ان میں طوائف کا عنصر بہت زیادہ تھا۔ اسی وجہ سے ریڈیو میں درباداری کی رسم رائج ہوئی۔ ادبی بھڑوے تخلیق ہوئے۔ یوں بخاری برادران کی قابلیت اور ذہانت خود پرستی،



نمائشی اور جنسی ہڑبونگ کی بھینٹ چڑھ گئی۔

بخاری کے رویے کے خلاف احتجاجاً احمد بشیر نے استعفیٰ دے دیا۔ پھر پتہ نہیں کیوں احمد بشیر کراچی میں بے روزگاری کا شکار ہو گیا۔ مجبوراً اسے گولی مار کے چھپر میں پناہ لینا پڑی۔

اس زمانے میں گولی مار ایک ویرانہ تھا۔ حکومت نے اس ویرانے میں غریب مہاجروں کے لیے چھپر بنوا رکھے تھے۔

ان چھپروں میں غنڈے، جواری، جیب کترے، چور اُچکے اور مفلس مہاجر رہتے تھے۔ ویرانہ کا یہ عالم تھا کہ شام ہی کو گیدڑ صحن میں گھس آتے۔ احمد بشیر کی کٹیا کے باہر ایک گھنا درخت تھا جو احمد بشیر کا ڈرائنگ روم تھا اور سپلائی کے لیے ایک کھارا کنواں تھا۔ جہاں سے مودی پانی بھر کر لاتی تھی۔ مودی احمد بشیر کی بیوی ہے۔ ان دنوں احمد بشیر بے کار تھا۔ ایک فراڈ ویلفیئر انجمن کے لیے مودی سلائی کا کام کرتی تھی اور ان پیسوں سے گھر چلاتی تھی۔

احمد بشیر کے دوست صلاح الدین اور ابن انشا اکثر وہاں آتے۔ ان میں احمد بشیر کی امداد کرنے کا مقدور نہ تھا۔ صرف تاش کھیل کر اس کا دل بہلایا کرتے۔ اکثر چندہ کر کے کرائے پر گیس منگایا جاتا اور ساری رات درخت کے تلے تاش کی بازی چلتی۔ احمد بشیر کو ایک موٹر کمپنی میں نوکری مل گئی۔ اس کا کام ٹرک سے مال اتار کر اسے گدھا گاڑی پر لاد کر ریلوے اسٹیشن پر لے جانا تھا۔ یوں احمد بشیر کئی مہینے کراچی کی سڑکوں پر گدھا گاڑی چلاتا رہا۔

احمد بشیر کی زندگی میں مودی کو بڑا مقام حاصل ہے۔ وہ احمد بشیر کی ساتھی ہے۔ بظاہر بیوی ہے، ویسے نوکرانی ہے۔ ماں ہے اور درپردہ اس کی آقا ہے۔ اس جن کا اللہ دین ہے۔

مودی احمد بشیر کی دوسری بیوی تو ہے۔ لیکن چناؤ کی بیوی نہیں۔

احمد بشیر کی پہلی شادی بچپن ہی میں ہو گئی تھی۔ لیکن اس نے کبھی بیوی کو بیوی نہ سمجھا تھا۔ اس کے والدین نے بڑے جتن کیے کہ وہ بیوی کی طرف ملتفت ہو۔ لیکن ان کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔

ایک روز احمد بشیر نے راز کھول دیا۔ بولا۔ میں اس بیوی کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔

کیوں میں نے پوچھا؟

پتہ نہیں۔

کیا وہ خوش شکل نہیں؟

اچھی شکل ہے۔

کیا وہ جوان نہیں؟

جوان ہے۔

کیا وہ ٹھنڈی ہے؟

نہیں تو اُبلتی ہے۔

تو پھر۔

پتہ نہیں وہ بولا لیکن میں اس بیوی کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔

دراصل احمد بشیر کی پہلی بیوی بہت قریبی رشتہ دار تھی۔ وہ انہی کے گھر میں پلی تھی۔ وہیں جوان ہوئی تھی۔ وہ احمد بشیر کی والدہ سے بے حد متاثر تھی۔ ان جانے میں وہ اسے اپنی آئیڈیل بنا چکی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ احمد بشیر کی والدہ اس پر طاری ہو چکی تھی۔ اس نے والدہ کا چلنا پھرنا طور طریقہ اس حد تک اپنا لیا تھا کہ دونوں میں چنداں فرق نہ رہا تھا۔

لیکن کیوں میں نے پوچھا۔

اس لیے کہ احمد بشیر بولا جب میں اس کے پاس جاتا ہوں تو ایسے لگتا ہے مجھے جیسے میری بیوی نہیں بلکہ ماں ہو۔

احمد بشیر کی اس دلیل کو نہ کوئی سمجھتا تھا نہ مانتا تھا۔

احمد بشیر نے اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے دی تاکہ اس کی زندگی تباہ نہ ہو۔ اور ہم دونوں نے مل کر ایک محاذ قائم کر لیا۔ اس پر ایمن آباد میں ایک طوفان آ گیا۔ بڑی دھول اڑی۔ لیکن بالآخر ہم روایتی انداز میں احمد بشیر کی دوسری شادی کرنے میں کامیاب ہو گئے اور گھر میں ایک ان دیکھی، ان جانی لڑکی مودی آ گئی۔



مودی کے آنے کے بعد ہم دونوں الگ ہو گئے۔ التزاماً میں احمد بشیر سے پیچھے ہٹ گیا۔ اور اشفاق احمد سے ملنے لگا۔

احمد بشیر کی شخصیت کے شالامار کے کسی پوشیدہ حجرے میں ایک سؤر رہتا ہے۔ اگرچہ وہ کبھی کبھار باہر نکلتا ہے لیکن جب بھی نکلتا ہے، سارے باغ کو مسخ کر دیتا ہے۔

چھ سال کے مراسم کے بعد ایک روز واقعتاً احمد بشیر کی شخصیت کا سؤر میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس روز میں اور اشفاق پارک میں گھوم پھر رہے تھے۔

دیر تک ہم پارک میں گھومتے رہے۔ پھر دفعتاً ہم نے دیکھا کہ احمد بشیر سامنے کھڑا ہے۔ ہمیں اکٹھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ چہرہ غصے سے بھوت بن گیا۔ اس نے بے وجہ ہمیں گالیاں دینا شروع کر دیں۔ ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ وہ تشدد پر آمادہ تھا۔ اس وقت میرے سامنے احمد بشیر نہیں بلکہ ایک اجنبی کھڑا تھا۔ خود پسند، متشدد، منتقم، غنڈہ۔

اشفاق احمد سے احمد بشیر کا انتقام آج تک پورا نہیں ہوا۔

جنس کے معاملے میں احمد بشیر اپنے باپ کی طرح ٹھنڈا ہے۔ اوّل تو اس میں جسمانی خواہش کا فقدان ہے، خواہش ہے جو سراسر ذہنی ہے جسمانی نہیں۔ اگر جسمانی ہے تو وہ آوارہ ہے کسی مقام سے مخصوص نہیں۔ لیکن ٹھہریئے یہ بات وضاحت طلب ہے۔ عام طور سے ادیبوں اور فنکاروں کی جنسی خواہش کا مرکز جسم نہیں بلکہ ذہن ہوتا ہے۔ وہ اپنے ذہن کی دھونکنی چلا کر بڑی محنت سے جسم کو گرماتے ہیں۔ عام طور پر اس عمل میں خواہش کی شدت جسم کے مخصوص عضو پر مرکوز نہیں ہوتی بلکہ سارے جسم میں منتشر ہو جاتی ہے۔

نوجوانی میں اپنے ماموں سے متاثر ہو کر احمد بشیر نے اپنی کاوش سے ذہن کی بھٹی سے جسم کو گرمایا اور کئی ایک جنسی ہڑبونگ کیے۔ پھر وہ اس کھیل سے بے نیاز ہو گیا۔ اور اس کی زندگی میں عورت کی چنداں اہمیت نہ رہی۔ احمد بشیر بنیادی طور پر محجوب طبیعت کا مالک ہے۔ وہ عورت سے محبت کرنے کا اہل نہیں۔ وہ صرف عورت کو متاثر کرنے کا شوقین ہے اور اس کا وار صرف ذہین عورت پر چلتا ہے۔ اس عمل میں وہ "شاک ٹیکٹس" استعمال کرتا ہے اس کھیل میں عورت کی جرأت، بے باکی اور ذہنی انفرادیت احمد بشیر کے لیے تازیانہ ہوتی

ہے۔ کسی عورت سے متاثر ہو جائے تو احمد بشیر کے دل میں اس کے ساتھ سونے کی خواہش پیدا نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ اسے پکڑ کر نوچ ڈالے۔ بوٹی بوٹی کر کر اسے کھا جائے۔ اپنے نفس کی گرمی سے اسے پگھلا دے اور پھر اسے اپنے جسم پر مل لے۔ احمد بشیر کی محبت میں تشدد کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ اشتیاق کے عالم میں ننگی فحش گالیاں دینا اس کا محبوب مشغلہ ہے۔

احمد بشیر کی زندگی میں ایک عورت بھونچال بن کر آئی تھی۔ اس کا نام مصباح تھا۔

مصباح اور احمد بشیر دونوں ہی ذہین تھے۔ دونوں ہی منفرد تھے۔ دونوں میں بلا کی جرأت اور بے باکی تھی۔ دونوں ہی اثر ڈالنے کے قائل تھے۔ دونوں ہی منہ زبانی تھے۔ دونوں کے درمیان گھمسان کا رن پڑا۔۔۔ دونوں ہی زخمی ہو گئے۔

اس کی تمام ذمہ داری پبلک سروس کمیشن پر عائد ہوتی ہے جس نے کراچی کی سڑکوں پر گدھا گاڑی چلانے والے کو پبلٹی کے محکمے کا ڈائریکٹر چن لیا اور ساتھ ہی مصباح کو اس کا نائب مقرر کر دیا۔

مصباح یونانی حسن کا مجسمہ نہ تھی۔ بادامی رنگ، گول چہرہ، بھرے بھرے ہونٹ، تنگ پیشانی، خدوخال میں تو کوئی بات نہ تھی لیکن نسائی شوخی سے اس قدر بھیگی ہوئی تھی کہ پہلی نظر میں سارے دفتر والے اس پر ریجھ گئے۔

احمد بشیر کو کوئی بات دکھائی نہ دی لہٰذا وہ ملتفت نہ ہوا۔ اس نے ڈرل ماسٹر کے لہجے میں مصباح کو دفتری ہدایات جاری کیں اور پھر اپنے کام میں لگ گیا۔

دوسرے دن مصباح پھر احمد بشیر کے کمرے میں آ گئی۔ بولی آپ نے فرمایا تھا جو بات سمجھ میں نہ آئے پوچھ لینا۔ میں پوچھنے آئی ہوں۔

پوچھو احمد بشیر نے عدم توجہی سے کہا۔

وزارت سے کون سے کوائف حاصل کروں۔ کیسے حاصل کروں؟

احمد بشیر نے خبریں پڑھنے کے انداز میں پھر سے ہدایات دے ڈالیں۔

تیسرے دن وہ پھر آ گئی۔

احمد بشیر نے پھر سے ہدایات دہرائیں اور کہنے لگا اب آپ جائیے۔

جی اچھا وہ بولی لیکن جوں کی توں بیٹھی رہی، بالکل مطمئن، پر اعتماد، باوقار۔

احمد بشیر عدم توجہی کے پردے کے باوجود توجہ دینے پر مجبور ہو گیا۔ یہ لڑکی تو چیلنج دے رہی ہے۔ طاقت ور معلوم پڑتی ہے۔ اس نے سوچا۔ پھر اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے گرما گرم جھاڑ پلائی جائے۔

دیکھیے مس وہ بولا۔ یہاں عورت ہونے کا فائدہ حاصل کرنے کی کوشش نہ کیجیے۔ بھول جائیے کہ آپ عورت ہیں۔ اور

جی بھول گئی، وہ متانت سے بولی۔

احمد بشیر کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ اس نے از سر نو دفتری لہجے میں بات شروع کی۔

آپ کو یہاں کام کرنا پڑے گا۔ محنت کرنی پڑے گی۔

وہ چپ چاپ بیٹھی سنتی رہی۔

اب آپ جائیے احمد بشیر غرایا۔

اچھا جی کہہ کر وہ جوں کی توں بیٹھی رہی۔ کمرے میں گہری اضطراب بھری خاموشی طاری رہی۔ پھر وہ دفعتاً بولی:

آپ کے بال گھنگھریالے کیوں ہیں؟

احمد بشیر کی پھونک نکل گئی لیکن اس نے بات اَن سنی کر دی۔

میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کے بالوں میں انگلیاں پھیروں۔ وہ بولی۔ اجازت ہے۔

احمد بشیر کا توازن پارہ پارہ ہو گیا۔ حفظ ماتقدم کے لیے وہ غصے میں بولا تم بڑی حرام زادی ہو، کتیا ہو، گشتی ہو۔

جی کیا فرمایا آپ نے وہ بولی میں سمجھی نہیں پھر کہیے۔

اس پر احمد بشیر قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ اور وہ دونوں دوست بن گئے۔

اگلے روز مصباح دوڑی دوڑی آئی بولی۔ آپ مجھے بہن بنا لیں۔ ابھی اسی وقت وہ بولی۔ احمد بشیر بوکھلا گیا۔ جلدی کریں۔ ورنہ۔

ورنہ یوول مس دی بس۔ وہ بولی دفتر کے سارے سٹاف نے باری باری مجھے بہن بنالیا ہے۔ کہیں آپ پیچھے نہ رہ جائیں۔

وہ بھائی بن کر تم پر عشق جھاڑیں گے۔ احمد بشیر نے کہا۔

ہاں ہاں آپ بھی بھائی بن کر جھاڑیے نا۔

تم میں بہن والی کوئی بات بھی ہو۔ تمہارے تو سگے بھائی تم سے عشق کرتے ہوں گے۔

ہاں کرتے ہیں۔ دونوں ہی۔ لوگ باتیں بنائیں گے۔ احمد بشیر بولا۔

اچھا باتیں بنائیں گے وہ بولی۔ پھر کیا ہوگا۔

پھر تمہاری بدنامی ہوگی۔

پھر کیا ہوگا؟

پھر۔۔۔ احمد بشیر رُک گیا۔

پھر آپ کو پسینے آئیں گے۔ آپ کی نبضیں چھوٹ جائیں گی۔ ٹانگیں ڈر کے مارے لڑکھڑائیں گی۔ یہی نا۔ یہ کہہ کر مصباح کمرے سے نکل گئی اور احمد بشیر کی نبضیں چھوٹ گئیں۔

اگلے روز وہ پھر آگئی بولی سارے دفتر والے مجھ سے عشق کرتے ہیں لیکن سالوں کو عشق کرنا آتا نہیں۔

شکر کرو میں تم سے عشق نہیں کرتا احمد بشیر نے کہا۔

کرتے تو کیا ہوتا اس نے سنجیدہ معصومیت سے پوچھا۔

تمہیں دن دیہاڑے اٹھا کر لے جاتا اور توڑ پھوڑ کر پھینک دیتا۔

شکر کریں میں آپ سے عشق نہیں کرتی وہ بولی۔ پوچھیے۔ کرتی تو کیا ہوتا۔ کرتی تو آپ کو چھپنے کے لیے جگہ نہ ملتی۔

ایک روز دفتری گفتگو کے دوران میں مصباح کا سر احمد بشیر کے بہت قریب ہوگیا۔

پیچھے ہٹ جاؤ۔ وہ چلایا۔

کیوں؟

ورنہ میں تمہیں چوم لوں گا۔

اچھا۔ پھر کیا ہوگا وہ بولی۔

پھر۔۔۔ جہاں جہاں میں تمہیں چوموں گا۔ وہاں وہاں گلاب کے پھول اُگ آئیں گے۔

وہ دھم سے کرسی میں گر گئی۔ چہرہ زرد ہوگیا۔ آنکھیں پُرنم ہوگئیں۔ جیسے بے بس ہوگئی ہو۔ یہ اس کی کمزوری کا پہلا اور آخری لمحہ تھا۔ روہانسی ہوکر بولی۔ آپ مجھ سے ایسی باتیں نہ کریں میں کسی اور کی ہو چکی ہوں۔ میری سمت کھوٹی نہ کریں پلیز۔

حرامزادی دور ہو جاؤ یہاں سے احمد بشیر غرایا۔ اور وہ ایک اپاہج کی طرح لڑکھڑاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ پھر احمد بشیر اور مصباح کا ساتھ چھوٹ گیا۔ مصباح نے شادی کرلی اور ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔

چند برس بعد اتفاقاً سرراہے احمد بشیر اور مصباح کی ملاقات ہوگئی۔ مصباح نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا بولی اسے چوم لیجیے۔

اُونہوں، احمد بشیر بولا۔ اب گلاب نہیں اُگیں گے۔ اب تم میں وہ بات نہیں رہی۔

اب آپ کے بال بھی گھنگھریالے نہیں رہے۔ وہ بولی۔ پھر وہ اُداس ہوگئی۔ آہ بھر کر کہنے لگی یار تمہارے بعد مجھے کسی نے گالی نہیں دی۔

احمد بشیر نے کہا۔ حرام زادی۔ زندگی اسی کا نام ہے۔ پھر کوئی گالی بھی نہیں دیتا۔

مصباح کے علاوہ دو عورتیں احمد بشیر کی زندگی میں آئیں۔ ایک اس کی بیوی مودی ہے۔ مودی سے احمد بشیر کو ایسی محبت ہے جیسی اپاہج کو بیساکھیوں سے ہوتی ہے۔ گھریلو معاملات میں میں نے احمد بشیر سا اپاہج کوئی نہیں دیکھا۔ اس نے گھر کی کوئی چیز کبھی یہاں سے وہاں اٹھا کر نہیں رکھی۔ اس نے گھر کے لیے کبھی کوئی چیز نہیں خریدی۔ اس نے کبھی اپنے سلیپر تلاش نہیں کیے۔ اس نے کبھی گھڑے سے گلاس بھر کر پانی نہیں پیا۔

اگر مودی نہ ہو تو احمد بشیر کئی بار الٹی قمیض پہن کر دفتر چلا جائے اور اسے پتہ بھی نہ

چلے۔

احمد بشیر نے مکان بدلنا ہو تو وہ التزاماً گھر سے چلا جائے گا اور جاتے ہوئے مودی سے پوچھے گا۔ مودی شام کو نئے گھر میں آؤں نا؟

محلے دار احمد بشیر کے گھر کی بات کرتے ہیں تو کہتے ہیں، وہی گھر نا جس میں کوئی مرد نہیں رہتا۔ مودی احمد بشیر کی عادت ہے وہ اسے کھلاتی ہے پلاتی ہے سلاتی ہے جگاتی ہے اور منہ بنائے بغیر احمد بشیر کے کڑوے کسیلے لیکچر پیتی ہے۔ احمد بشیر کو مودی اس لیے پسند ہے کہ وہ ذہنی عورت نہیں احمد بشیر کہتا ہے مجھے مودی اس لیے پیاری ہے کہ وہ بہت معصوم ہے اسے کچھ بھی پتہ نہیں۔ ویسے مودی کو سب کچھ پتہ ہے اس کا کمال یہ ہے کہ وہ ایسا انداز اپنائے رکھتی ہے جیسے اسے کچھ پتہ نہ ہو۔

مودی شوقین مزاج ہے اسے میل ملاپ سے دلچسپی ہے۔ خوبصورت لباس پہننے کا شوق ہے وہ خوب صورت لباس تیار کرنے میں ماہر ہے۔ اس میں رنگوں کے امتزاج کی شدید حس ہے۔ چونکہ آج تک کبھی پورے پیسے دستیاب نہیں ہوئے اس لیے وہ لنڈے سے میٹریل خریدتی ہے اور اسے سیتی ہے، اور سجا دیتی ہے جیسے یورپ کی کوئی فیشن درزن ہو۔

جب وہ گولی مار کے چھپر میں رہتے تھے تو مودی لوگوں میں ہومیو دوائیاں تقسیم کیا کرتی تھی۔

جب احمد بشیر اپنی فلم نیلا پربت بنا رہا تھا تو مودی نے اتنا کام کیا اتنا میل ملاپ بڑھایا کہ ساری فلم انڈسٹری میں باجی کے نام سے مشہور ہو گئی۔

مودی کو اچھی طرح علم ہے کہ احمد بشیر اس کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا اسے اپنی اہمیت کا پورا احساس ہے۔ مودی کا کمال یہ ہے کہ وہ احمد بشیر کی باتیں بظاہر بڑے انہماک اور شوق سے سنتی رہتی ہے۔ ''اچھا تو یوں ہے'' کے سے انداز سے جب بچہ ''اچھا تو یوں ہے'' کی لوری سنتے سنتے سو جاتا ہے تو مودی جو چاہتی ہے کرتی ہے۔

احمد بشیر سمجھتا ہے کہ ذہنی طور پر مودی بچہ ہے۔ سمجھتی نہیں۔ مودی سمجھتی ہے کہ عملی زندگی میں احمد بشیر بالکل سیدھا ہے کچھ بھی نہیں جانتا۔ دونوں ہی جھوٹے ہیں دونوں ہی سچے



ہیں۔

دوسری عورت جس سے احمد بشیر کو شدت کا لگاؤ ہے اس کی چھوٹی بہن پروین ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے سے عشق ہے۔

اگر احمد بشیر، ابن انشا کا دوست نہ ہوتا تو ابن انشا مدت سے مر چکا ہوتا۔ کراچی کے کسی مضاف میں اس کا ٹوٹا پھوٹا مزار ہوتا جس پر یہ کتبہ لکھا ہوتا ''بیراگ کا جوگی شاعر جس میں زندگی کی تلخیوں کو برداشت کرنے کی جرأت پیدا نہ ہو سکی اور اپنے ہاتھوں سے زندگی کا پیالہ اُلٹ دیا۔''

اپنے قریبی حلقے کے افراد میں سے دو شخصیتوں کو میں نہیں سمجھ پایا۔ ایک تو قدرت اللہ شہاب ہیں اور دوسرے ابن انشا، قدرت اللہ کے متعلق میں آج تک اندازہ نہیں لگا سکا کہ شہاب کی پراسراریت کس سطح سے تعلق رکھتی ہے۔ اور اس کا نیوکلس کہاں واقعہ ہے۔ ابن انشا کے متعلق یہ اندازہ نہیں لگا سکا کہ وہ کیا محرکات تھے جس کی وجہ سے انشا نوجوانی میں ایسی دلدل میں گر پڑا کہ آج تک لت پت کا عالم ختم نہیں ہوا۔ اس ٹوٹ کی کیا نوعیت تھی کہ وہ آج تک اپنے ٹکڑے جوڑ نہیں پایا۔

ابن انشا افریقہ کا وہ سطحی خطہ ہے جسے احمد بشیر نے دریافت کیا۔ جب احمد بشیر، ابن انشا سے ملا تو وہ اسمبلی میں ٹرانسلیٹر تھا۔ احمد بشیر نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا کہ وہ ایک ایسا اپاہج ہے جس میں تخلیقی پکار تڑپ رہی ہے۔ احمد بشیر نے کوشش کر کے اسے اپنے دفتر میں بلا لیا۔

چند ہی روز میں احمد بشیر کو اس بھید کا پتہ چل گیا کہ ابن انشا کو خودکشی کے شدید دورے پڑتے ہیں۔ ایک روز احمد بشیر نے برسبیل تذکرہ سرسری انداز میں بات چھیڑی۔ کہنے لگا۔ یار مجھے خودکشی کے دورے پڑتے رہتے ہیں۔

اچھا تمہیں بھی؟ انشاء نے حیرانی سے پوچھا۔

تمہیں بھی پڑتے ہوں گے۔ سبھی بڑے آدمیوں کو پڑتے ہیں یار۔

یہ ایک فطری اور صحت مند جذبہ ہے۔ ہمیں پورا حق حاصل ہے کہ جب چاہیں اپنی

زندگی کو ختم کر دیں۔ مگر صرف ایک بات اہم ہے کہ خودکشی کے کوائف یوں ترتیب دیئے
جائیں کہ مرنے والے کو ضرورت سے زیادہ تکلیف نہ ہو اور ان کے پسماندگان کے لیے
ضرورت سے زیادہ مشکلات پیش نہ آئیں۔ آؤ اس معاملے میں دونوں ایک دوسرے سے
تعاون کریں۔ ہم دونوں مل کر یہ کوائف ترتیب دے سکتے ہیں۔ بس اتنا کرو کہ جب تم پر
دورہ پڑے تو تم مجھ کو اطلاع دے دو اور میں خودکشی کرنے لگوں تو تمہیں خبر دوں تاکہ باہمی
مشورہ کر لیں پلان میں کوئی سقم نہ رہ جائے۔

ابن انشا، احمد بشیر کے داؤ پر چڑھ گیا۔ اس کے بعد کئی ایک بار آدھی رات کو احمد بشیر کا
گھر دروازہ بجا دروازہ کھولتے ہی احمد بشیر نے دیکھا کہ ابن انشا اس کی جانب یوں حسرت
بھری نگاہوں سے دیکھ رہا ہے جیسے وہ ان کی آخری ملاقات ہو۔

چلو چلیں۔ احمد بشیر، انشا کے ساتھ چل پڑتا۔ ہاں تو سارے انتظامات مکمل ہیں کیا۔
بہت اچھے بہت اچھے۔ کون سے زہر کا انتخاب کیا ہے۔۔۔ افیون۔۔۔ اُونہوں افیون
دقیانوسی چیز ہے۔ گلے کی رگیں کھچ جاتی ہیں۔ جسم نیلا پڑ جاتا ہے نورانی موت واقع نہیں
ہوتی۔ اس سے تو سلیپنگ پلز اچھی ہیں۔۔۔ ہاں اور پولیس کے نام خط لکھ دیا نا۔۔۔ یار یہ
پولیس والے بہت تنگ کرتے ہیں۔ پیسے بٹورنے کے لیے۔ ہاں یار وہ نظم جو تم لکھ رہے
تھے اسے تو مکمل کر لیا ہوگا۔ ارے کفن دفن کے لیے پیسوں کا انتظام کر لیا ہے۔ پیچھے ماں
باپ کو قرض نہ مانگنا پڑے۔۔۔ یوں وہ ساری ساری رات کراچی کی سڑکوں پر گھومتے
ہوئے خودکشی کے کوائف طے کرتے رہتے۔ حتیٰ کہ سورج نکل آتا اور ابن انشا کے دورے کا
وقت ختم ہو جاتا۔ اگلے روز دفتر میں ابن انشا ندامت بھرے انداز میں کہتا رات میں نے تم کو
خواہ مخواہ پریشان کیا ایسی وحشت سوار ہوئی کہ۔۔۔

اُونہوں احمد بشیر اسے آنکھ مارتا۔ یہ وحشت تو ہر بڑے آدمی پر سوار ہوتی ہے۔ جیسے
میں ہوں تم ہو کسی سے ذکر نہ کرنا یار!

یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب احمد بشیر، ابوالاثر حفیظ کا اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھا۔ ابن انشا
اور میں احمد بشیر کے ماتحت تھے اور ابوالاثر اور احمد بشیر کی دو منفرد شخصیتیں ایک دوسرے سے



متصادم تھیں۔

بے شک ابوالاثر ایک عظیم شاعر ہے لیکن میری دانست میں شخصیت کے لحاظ سے وہ
عظیم تر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ شخصیت کا ابوالہول ہے۔ فرائڈ کہتا ہے ادیبوں اور فن
کاروں کی شخصیت اپنی نوعیت میں ایبنل ہوتی ہے۔ ابوالاثر ایبنل شخصیت کا امام ہے۔

ابوالاثر اور احمد بشیر کا تین چار سال ساتھ رہا۔ جوں جوں وہ قریب آتے گئے ان میں
بُعد بڑھتا گیا۔ نفسیاتی طور پر ابوالاثر سراسر فاتح تھا۔ احمد بشیر مجسم بغاوت تھا۔ حفیظ اثر
ڈالنے کا بادشاہ تھا۔ احمد بشیر متاثر ہونے سے منکر تھا۔ ابوالاثر اٹوٹ شخصیت کا بُت تھا۔ احمد بشیر
کو بُت شکنی کی لت پڑی ہوئی تھی۔ احمد بشیر کے پاس بات کرنے کی تلوار تھی۔ ابوالاثر بات
کاٹنے کا بادشاہ تھا۔ ابوالاثر ڈرامہ کھیلنے کا استاد تھا احمد بشیر کو "تالی بجاؤ" کہنے کی پرانی عادت
تھی۔ دونوں کے تصادم سے بڑی دھول اڑی ہاہا کار مچی۔ دونوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا
نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں ہی بے ہوش ہو گئے ایک دوسرے کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ یہ تفصیلات ایک
الگ موضوع ہے۔

اگر میرے قلم میں کبھی اتنی بے باکی، میری نظر میں اتنی بصیرت اور میرے قلب میں
اتنی وسعت پیدا ہو جائے تو میں شخصیت کے اس لیننگ ٹاور آف پیسا کی جھلکیاں دکھاؤں
جسے عرف عام میں ابوالاثر حفیظ کہتے ہیں۔ اور احمد بشیر ابوالاثر کے تصادم کی تفصیلات آپ
تک پہنچ پائیں۔

احمد بشیر بڑا غنی آدمی ہے۔ ذہنی اور مالی دونوں لحاظ سے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے
احمد بشیر سا غنی آدمی نہیں دیکھا۔ اگر وہ دو روز سے بھوکا ہو اور کہیں سے ایک روپیہ مل جائے
اور وہ کچھ کھانے کے لیے بازار جا رہا ہو آپ راستے میں مل جائیں اور اس سے پیسے مانگیں تو
وہ بن سوچے سمجھے پورے کا پورا روپیہ آپ کے ہاتھ پر رکھ دے گا۔ دے کر بھول جانا احمد
بشیر کی عادت ہے۔ اس کے باوجود ایک روز اس نے مجھے گلے سے پکڑ لیا کہنے لگا۔ تو نے
میرے تین سو روپے کھا لیے ہیں۔ میری رقم نکال ابھی۔ یہاں!

واقعی میں نے اس کے تین سو روپے کھا لیے تھے۔ لیکن دو باتیں عجیب تھیں۔ ایک تو

اس کے تین سو روپے کھائے مجھے عرصہ گزر چکا تھا اور دوسرے میں نے تو اس کے کئی سو روپے کھائے تھے۔ صرف تین سو ہی نہیں۔

احمد بشیر نیک نیتی اور ہمدردی سے بھرپور ہے لیکن ساتھ ہی وہ ذہنی عجز سے کورا ہے۔ اس کی خود اعتمادی خود پرستی کی حدود کو چھوئے رہتی ہے۔ وہ چیلنج پسند ہے۔ اعتدال کا قائل نہیں۔ جب وہ ایف اے میں تعلیم پا رہا تھا تو ایک روز اپنے دوستوں کے سامنے سٹنٹ فلموں کے ہیرو کی نقل اُتارتے ہوئے اس نے کھڑکی سے نیچے چھلانگ لگا دی تھی۔ اس وقت اسے یاد نہیں رہا تھا کہ کھڑکی ایک منزل اُونچی ہے۔ شدت احمد بشیر کی نس نس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ جس میں تشدد کا عنصر نمایاں ہے۔

احمد بشیر ایک غنڈہ ہے اور تحقیر سے دوسرے کو مرعوب کرنے میں لذت محسوس کرتا ہے۔

احمد بشیر منہ پھٹ ہے۔ سچ کہہ دینے کا عادی ہے اور بروقت ضرورت سچ کہہ کر دوسرے کو یوں گمراہ کرتا ہے کہ اس کے وار سے بچنے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔

احمد بشیر ایک عفریت ہے ایک معصوم بچہ ہے معاف کر دینے والا مخلص اور غنی دوست ہے۔

احمد بشیر کو جفر سے دلچسپی ہے یہ دلچسپی فلم سازی کے دور کی پیداوار ہے۔ اگرچہ دل کی گہرائیوں میں وہ نجوم جفر اور مافوق الفطرت کو نہیں مانتا۔ پھر بھی وہ علم جفر کی عزت کرتا ہے اور اس سے اکثر یوں دل بہلاتا رہتا ہے جیسے کوئی بچہ ٹھیکریوں سے کھیلتا ہے۔ جفر میں اس کے استاد شاد گیلانی ہیں۔ احمد بشیر ان کی بہت عزت کرتا ہے۔ شاد گیلانی نے احمد بشیر کو جفر کے ایسے ایسے نکتے بتا رکھے ہیں جو عموماً استاد کسی کو بتائے بغیر اپنے ساتھ لے مرتے ہیں۔ لیکن احمد بشیر نے کبھی ان کو اپنے فائدے کے لیے استعمال نہیں کیا۔

چھ سال ہوئے احمد بشیر نے شاد گیلانی سے پوچھا تھا۔ میرا یہ بدقسمتی کا چکر کس طرح دور ہوگا۔۔۔ جواب آیا احمد علی صاحب کے ہاتھوں۔۔۔ پھر پوچھا۔۔۔ احمد علی صاحب کون ہیں۔۔۔ جواب آیا۔۔۔ وہ ایک خاص بزرگ ہیں۔ پھر پوچھا وہ کہاں ہیں۔ جواب آیا۔۔۔ لاہور شہر میں۔ پھر پوچھا۔ رہتے کہاں ہیں۔ جواب آیا شہر میں گھومتے پھرتے ہیں۔ کوئی ٹھکانہ نہیں۔

اب عرصہ ایک سال سے احمد بشیر سوچ رہا ہے کہ یہ پوچھے کہ فلاں دن فلاں وقت وہ بزرگ کہاں ہوں گے تاکہ وہ ان سے مل سکے۔ لیکن دل ہی دل میں اسے علم ہے کہ وہ احمد علی سے کبھی نہیں ملے گا۔

احمد بشیر میں ادبی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ سب سے پہلے اس نے شاعری کو اپنایا۔ ان دنوں وہ بشیر رومانی تھا۔ رومانی اس کا تخلص تھا۔ پھر جرنلزم کے دور میں وہ نثر نگار بن گیا۔ اور اس نے کیریکٹر سکیچ لکھنے شروع کر دیے۔ آج تک اس نے صرف چار چھ سکیچ لکھے ہیں۔ احمد بشیر ادیب اس لیے نہ بن سکا کہ وہ دوٹوک بات کرنے کا قائل ہے۔ اس میں صبر نہیں استقامت نہیں دست کاری نہیں جو ادبی تخلیق کے لیے ضروری ہیں۔

۱۹۴۸ء میں اس نے مجھ پر پہلا سکیچ لکھا تھا۔ عنوان تھا ”سورما“ میرے حوصلے کی داد دیجیے کہ آج بتیس سال کے بعد انتقام لے رہا ہوں۔

احمد بشیر نے اپنا آخری سکیچ اسی سال کشور ناہید پر لکھا ہے جب احمد بشیر نے وہ مضمون محفل میں پڑھا تو بڑی ہاہا کار مچی۔ لوگ کہنے لگے احمد بشیر نے متعفن کیچڑ اُچھالا ہے۔ مضمون فحش ہے اور کشور ناہید سے سراسر زیادتی کی گئی ہے۔

میں نے وہ مضمون حاصل کر کے پڑھا ہے۔ اگرچہ زاویہ تحریر میں لاگ لگاؤ اور چھیڑ چھاڑ کا عنصر زیادہ ہی نمایاں ہے ہر چند کہ مصنف نے خود کو شوخ تر رنگوں میں پیش کیا ہے پھر بھی میری دانست میں وہ ایک عمدہ تجزیہ ہے اور دل نشین تحریر ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ احمد بشیر نے کشور کو اتنی بڑی ”ٹریبوٹ“ پیش کی ہے جو اس نے تحریر میں آج تک کسی کو پیش نہیں کی۔

۱۹۵۹ء میں دفعتاً اس پر فلمیریا کا حملہ ہوا۔ امریکہ جا کر فلم سازی سیکھنے کی خواہش جنون بن کر طاری ہوئی۔ خواہش کی شدت نے اسے مفلوج کر دیا۔ جب وہ ٹریننگ لے کر واپس آیا تو اس کے سر پر فلم سازی کا بھوت سوار تھا۔ وہ یہ سمجھنے لگا تھا کہ فلم سازی کی صلاحیت اس

کے سوا کسی اور شخص کو عطا نہیں کی گئی۔ اس کا ایمان تھا کہ اسے فلم بنانے کے لیے دنیا پر اتارا گیا ہے کہ وہ فلم سازی کا امام ہے۔ وہ اپنے ان خیالات کا کھلا اظہار نہیں کرتا تھا۔ حالانکہ دل کی بات کہہ دینا اس کی فطرت ہے۔ لیکن اس زمانے میں اس کی فطرت کینچلی بدل رہی تھی۔

احمد بشیر نے مجھ سے کہا۔ یار ایک کہانی لکھ دو۔ میں نے کہانی لکھ دی۔ احمد بشیر نے اس کہانی کے اجزاء کو کئی بار کوٹا چھانا۔ اس کا قوام بنایا۔ خمیر پیدا کیا۔ جب وہ کہانی کی معجون تیار کر رہا تھا تو اس کی دیوانگی صاف ظاہر تھی ایک طوفان جمع ہو رہا تھا۔

کہانی فلمانے کے لیے اسے والد اور بہن سے رقم مل گئی۔ جب احمد بشیر انڈسٹری میں پہنچا تو وہ طوفان چلنے لگا۔ جنون میں شدت بڑھتی گئی۔ خود اعتمادی خود پرستی بن گئی۔ خود پرستی نے تحقیر اور تشدد کے چھینٹے اڑائے۔ اس نے ساری انڈسٹری کو للکارا۔ تم کچھ نہیں جانتے۔ اس نے مکا لہرایا۔ تمہاری ایسی کی تیسی۔ میں تمہیں بتاؤں گا۔۔۔ میں۔

احمد بشیر ایک سمتی آدمی ہے۔ دو سال وہ عالم دیوانگی میں نیلا پربت فلماتا رہا پھر مشکلات نے اس کا راستہ روک لیا۔ انڈسٹری نے اس کے خلاف محاذ کھول دیا۔ ڈسٹری بیوٹرز نے اس کی فلم اٹھانے سے انکار کر دیا۔

احمد بشیر مشکلات سے دبنے والا آدمی نہیں۔ اس نے جدوجہد اور تیز کر دی اور تیز اور تیز۔ مالی وسائل کے راستے میں کھڑی دیوار پر اس نے بار بار سر پٹکا کہ شاید راستہ مل جائے۔ لیکن راستہ نہ ملا۔ اور سر پٹکتے پٹکتے احمد بشیر نے دم توڑ دیا۔ موت واقع ہو گئی۔ فلم فلاپ ہو گئی۔

سات سال احمد بشیر کی لاش بے گور و کفن پڑی رہی۔ سات سال پروین مودی اور اس کی بچیاں اس کے سرہانے بیٹھ کر روتی رہیں۔ پھر احمد بشیر نے آنکھیں کھول دیں۔ اور نحیف آواز میں بولا تم مجھے دفناتے کیوں نہیں۔

آج احمد بشیر کے مردہ جسم میں پھر سے جان پڑ رہی ہے نسیں پھر سے ہری ہو رہی ہیں۔ ذہن میں پھر سے ابال اٹھ رہا ہے۔ فتنہ پھر سے بیدار ہو رہا ہے۔

☆



مسعود قریشی

۱۹۸۹ء

# کھچڑا

کچھ شخصیتیں دو رنگی ہوتی ہیں، انہیں کھچڑی شخصیت کہا جا سکتا ہے۔ ان میں دال بھی ہوتی ہے اور چاول بھی۔ جب چاہو دال الگ کر لو اور چاول الگ۔

مسعود قریشی کی شخصیت کھچڑی نہیں بلکہ کھچڑا ہے۔ کھچڑا اسے میں ۱۹۵۸ء میں متعارف ہوا۔ ان دنوں میں کراچی میں ویلج ایڈ کے دفتر میں کام کرتا تھا۔ دفتر صدر میں تھا۔ پاس ہی جارج کیفے تھا جہاں ہم کھانا کھانے جایا کرتے تھے۔

ایک روز میں نے بیرے سے کہا یار ہم تو فرائیڈ فش کھا کھا کر اکتا گئے۔ تمہارے ہاں سبزی بھی بنتی ہے کیا۔

بالکل بنتی ہے جناب وہ بولا۔

آج کونسی والی بنی ہے۔

کھچڑا جناب۔

کھچڑا۔ میں حیران ہوا۔ شاید کوئی نئی سبزی ہو۔

کھچڑے کی پلیٹ آئی تو دیکھا کہ اس میں بھنڈی بھی ہے، کدو بھی ہے، آلو بھی ہے، ٹنڈے بھی ہیں، بینگن بھی ہیں۔ پتہ نہیں اس پلیٹ میں کیا کیا کچھ تھا۔

لاحول ولا قوۃ میں نے ناک چڑھائی۔ یہ کیا شے ہے۔

پھر دامے خورم کیا تو پتہ چلا کہ ذائقہ اچھا خاصہ بلکہ لذیذ ہے۔

مسعود قریشی اپنی صلاحیتوں کے حوالے سے کھچڑا ہے۔ اس کی شخصیت میں ہر روپ موجود ہے۔ مثبت بھی منفی بھی، ذہنی بھی قلبی بھی۔ جب سنجیدہ ہوتا ہے تو یوں خشک ہو جاتا ہے

جیسے کاٹھ کا بنا ہوا ہو۔ بیوروکریٹ کی جھلک نمایاں ہو جاتی ہے۔ بے تکلفی پر آتا ہے تو پانی بن جاتا ہے۔ لہریں اٹھتی ہیں۔ چھینٹے اڑتے ہیں۔ گردوپیش بھیگ جاتا ہے۔

اس کی ذہانت کی دھار بڑی تیز ہے۔ کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ خود کو نہیں دوسروں کو۔ جب چاہے عقلیہ یا دلیلیہ بن جائے۔ پھر نہ لاگ نہ لگاؤ۔ تم کون ہم کون۔ صرف دو اور دو چار رہ جاتے ہیں۔

جذبے کا رنگ ابھرے تو۔ لگاؤ ہی لگاؤ۔ عقل و خرد سہم کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔

مسعود قریشی میں بیک وقت ایک سالک بھی ہے اور ایک مجذوب بھی۔

مسعود قریشی کی شخصیت کا احاطہ کرنا مشکل کام ہے۔ ادھر عقلی میز کرسی لگائے بیٹھا ہے ادھر جذباتی چوکڑی مارے بیٹھا ہے۔ ادھر سوکھا کاٹھ، اُدھر بھیگ ہی بھیگ۔ یہاں بیوروکریٹ وہاں ٹھیٹھ عوامی۔ ادھر غنڈہ اُدھر فقیر۔ یہاں گھمنڈی وہاں مسکین عاجز۔ اور حیرت ہے کہ یہ ہجوم ایک اکائی میں آ کر مسعود قریشی بن جاتا ہے۔

دوسری حیران کن بات یہ ہے کہ مسعود کی زندگی میں ایک تعجب انگیز کایا پلٹ وقوع میں آئی۔ بلاوجہ بلا وسیلہ۔ بیٹھے بٹھائے سنڈی تتلی بن گئی۔ پتی پھول بن گئی۔ پانی دودھ بن گیا۔

مسعود تو مسعود ہی رہا۔ وہی مسعود جو پہلے تھا اس کا رُخ بدل گیا۔ حرکت کے بغیر بدل گیا۔ زاویہ نظر بدل گیا۔ کوشش کے بغیر خواہش کے بغیر بدل گیا۔ سے بدل گیا۔ پہلے کڑی دھوپ تھی پھر بھور سے چھا گیا۔

مسعود قریشی سے ۱۹۵۰ء میں مَیں متعارف ہوا۔ وہ ایک پہاڑی مقام تھا۔ دسمبر کا مہینہ تھا۔ چاروں طرف برف ہی برف بچھی ہوئی تھی۔ ہم کل دس پندرہ تھے جو ایک مجاہد ریڈیو سٹیشن چلا رہے تھے۔ مجاہدانہ سپرٹ کا یہ عالم تھا کہ نہ کوئی افسر تھا نہ ماتحت نہ گریڈ نہ عہدہ۔ نہ حاکم نہ محکوم۔ نہ ڈر نہ خوف حالانکہ دشمن کے حملے کا ہر وقت خطرہ تھا۔ بے سروسامانی کا عالم تھا کہ نہ سٹیشن تھا نہ دفتر اور نہ سٹوڈیو۔ رہائش کے لیے بم زدہ مکان تھے ایک یہاں ایک وہاں ایک ادھر ایک اُدھر۔ یوسف ظفر اور میں ایک کمرے میں مقیم تھے۔

رات کے دو بجے ہم سو رہے ہوتے تو چنگھاڑیں سنائی دیتیں۔ نعرے گونجتے۔ پھر



دروازہ بجتا۔ کھولتے تو مسعود قریشی اوورکوٹ میں لپٹا ہاتھ میں لاٹھی پکڑے اندر آ جاتا۔ پہلے ایک چنگھاڑ مارتا پھر کہتا یار نیند نہیں آ رہی تھی۔ موسم خوشگوار تھا۔ میں نے سوچا چلو آؤٹنگ کرو۔ دوسروں کو بے آرام کرو۔ گپ شپ رہے گی۔

میں یہ سن کر حیران ہوتا۔ یا اللہ یہ انسان ہے یا بھوت۔ رات کے دو بجے شدید سردی اور ہو کے عالم میں پک نک منا رہا ہے۔ یخ بستہ موسم کو سہانا سمجھتا ہے۔ اس ویرانے میں یوں چھلانگیں مارتا اور نعرے لگاتا پھرتا ہے جیسے ٹارزن کا بیٹا ہو۔

سارا دن بھی وہ بات بات پر بر پشم قلندر قسم کے بے ہنگم قہقہے لگاتا لیکن جونہی ہم اسے ویٹ کرنے کے لیے اپنا سکرپٹ پیش کرتے تو وہ ایک دم سنجیدہ ہو جاتا۔ تخت پر بیٹھ جاتا اور ہم کو سامنے اٹینشن کرا دیتا۔ قربتیں ختم ہو جاتیں دوریاں عمل میں آتیں۔ پیشانی پر تیوری بیٹھ جاتی۔ انداز میں بدلحاظی پیدا ہو جاتی۔ اس وقت نہ وہ قہقہے رہتے، نہ مجاہدانہ انداز۔

سٹاف کی روزانہ میٹنگ میں یوں آتا جیسے کوئی بے گانہ ہو۔ اس کی عقل یوں چھڑی ہوتی جیسے بھڑوں کا چھتہ ہو۔ بات بات پر اعتراض کرتا سراسر، چونکہ چنانچہ۔ اگرچہ مگرچہ بن کر اعتراضات کا پٹارہ کھول کر بیٹھ جاتا۔

میں سوچتا یا اللہ یہ مسعود قریشی کیا شے ہے۔ قریب بھی ہے، دور بھی ہے۔ ساتھی بھی ہے، افسر بھی ہے۔ کھلاڑی بھی ہے، مفکر بھی ہے۔ "پھر کیا ہوا" بھی ہے۔ اور "اگرچہ مگرچہ" بھی ہے۔ تماشہ بھی ہے تماش بین بھی ہے۔

پھر ہمیں راولپنڈی میں اکٹھے کام کرنا پڑا۔

وہاں مسعود نے حلقہ ارباب ذوق میں آ سر نکالا اور ادبی موضوعات پر ایسا اگرچہ مگرچہ چلایا کہ حال دھواں دھواں ہو گیا۔ وہاں پتہ چلا کہ بنیادی طور پر جناب شاعر ہیں۔ ایسی غزل کہتے ہیں جو رنگ پچکاری چلا دیتی ہے۔

اس کے گھر جانے کا اتفاق ہوا تو دیکھا کہ بند ہند روایتی ہے۔ پھیچر قسم کا جی حضوریہ بیٹا ہے۔ بالکل لالہ رام لال جیسا جو ہمارے سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ انسپکٹر کا فون آتا تو فاک سے اٹھ کھڑے ہو جاتے۔ جوتے اتار دیتے۔ سر پر پگڑی رکھ کر چونگا اٹھاتے اور

کہتے جی سر۔ کیا حکم ہے سر۔ اس پر مجھے بڑا غصہ آتا کہ باہر یوں مونچھ مروڑے رکھتا ہے جیسے بڑا پروگریسو ہو۔ روایات کا مذاق اڑاتا ہے اور گھر میں۔ جی جناب۔ حاضر جناب۔

پتہ چلا کہ شعر کہنے کی بیماری باپ سے ورثہ میں ملی ہے۔ والد صاحب کو دیکھا تو شاعرانہ تفاخر کا نام نشان نہیں۔ چہرے پر الحمدللہ چوکڑی مارے بیٹھا ہے اور ماتھے پر سجدہ۔

مسعود کے والد کچہری میں عرضی نویس تھے۔ بیٹے اچھے عہدوں پر فائز تھے۔ لیکن انہوں نے کبھی والد صاحب سے درخواست نہ کی تھی کہ بابا یہ شغل چھوڑ دیجیے۔ ہمارے سٹیٹس پر حرف آتا ہے۔

مسعود جب والد صاحب سے ملنے کچہری جاتا تو عرضی نویسوں کے احاطے میں یوں داخل ہوتا جیسے شاہی مسجد کا صحن ہو۔ اور ابا حضور کے سامنے یوں گردن لٹکا کر کھڑا ہو جاتا جیسے کوئی مجرم اقبالِ جرم کرنے آیا ہو۔

مسعود قریشی کے اس بوجھے تو جانیں اور کھٹ مٹھے رویئے سے ہم سب نالاں تھے۔

ہم چار ساتھی تھے عمر تھا، عماد تھا، اعظمی تھا، میں تھا۔ وہ تینوں ریڈیو کے باقاعدہ ملازم تھے۔ میں دیہاڑی دار تھا۔ ہم سب کا متفقہ فیصلہ تھا کہ مسعود قریشی ویسے تو اچھا بھلا آدمی ہے۔ ساتھی بھی خاصہ ہے۔ لیکن اس میں ایک سؤر چھپا بیٹھا ہے جو وقت بے وقت تھوتھنی نکال لیتا ہے۔ مسعود سے پوچھتے تو وہ ذرا نہ شرماتا نہ برا مانتا الٹا ایک قہقہہ لگا کر کہتا۔ تم ایسے ساتھیوں سے تحفظ کے لیے سؤر پالنا لازم ہے۔

ہم پانچ ساتھی ہیں۔ مسعود، عمر، اعظمی، عماد اور میں۔ ہم بحثیں کرتے ہیں۔ تُو تُو مَیں مَیں تک پہنچتے ہیں۔ ایک دوسرے کے عیب گنواتے ہیں۔ اس کے باوجود تیس سال سے ہم گوڑھے یار ہیں۔ تیس سال ایک دوسرے کی اصلاح کرنے کی کوشش کے باوجود، ایک دوسرے کو عقل سکھانے کے باوجود ہم ایک دوسرے کا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔ لیکن حیرت ہے کہ ہم ابھی تک ایک دوسرے سے مایوس نہیں ہوئے۔

یہ بھان متی کا کنبہ طرح طرح کی اینٹ اور روڑوں سے بنا ہے۔ ہم میں کوئی قدر مشترک نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر ہم ایک دوسرے سے کیوں بندھے ہوئے ہیں۔



ہمیں آپس میں مل کر بڑی خوشی کیوں ہوتی ہے۔

ہم پانچوں کو پلاننگ کا بڑا شوق ہے۔ اور سمجھتے ہیں کہ پلاننگ میں ہم اتھارٹی ہیں۔ لیکن آج تک ہمارا کوئی منصوبہ کامیاب نہیں ہوا۔ پہلے ہم نے ایک انجمن بنائی جس کا نام تھا۔ لکھ یار۔ اس کا صدر مسعود قریشی تھا۔ لیکن وہ دیر تک نہ چل سکی۔ پھر ہم نے ایک پکنک پارٹی بنائی۔ چھڈ یار۔ اس کا لیڈر عمر ہے۔ چھڈ یار کا مطلب یہ ہے کہ چھوڑو۔ گھر کے مسئلے سیاست کے جھگڑے۔ بیوی کے مطالبے۔ اپنے اندر کا بچہ نکالو۔ اسے کندھے پر بٹھاؤ اور پہاڑوں میں نکل جاؤ۔ ان آؤٹنگز کے دوران اخبار پڑھنا منع ہے۔ حالات حاضرہ پر بات کرنا منع ہے۔ کتابی اور عقلی باتیں کرنا منع ہے۔ ہاں۔ آپس میں لڑنے جھگڑنے پر کوئی پابندی نہیں۔ ایک دوسرے کا مذاق اڑانے پر بین نہیں۔

''چھڈ یار'' کے دو سفروں کی روداد چھپ چکی ہے۔ ایک اشفاق احمد کے سفر در سفر میں، دوسرے میرے طویل مضمون شاہراہِ ریشم میں۔

ان سفرناموں میں مسعود کا نام شاعر ہے۔ عمر کا لیڈر، اعظمی کا وٹ یعنی لفظ باز اور عماد کا انجینئر۔ ان آؤٹنگز میں مسعود کا قہقہہ کچھ زیادہ ہی گونجتا ہے اور اس کے اندر کا سؤر تھوتھنی نکالے بیٹھا رہتا ہے۔

مسعود قریشی جالندھر کا رہنے والا ہے۔

اگرچہ جالندھر چھوڑے ہوئے جالندھریوں کو چالیس سال ہو چکے ہیں۔ پھر بھی جالندھر کی خصوصیات ابھی تک دائم و قائم ہیں۔

جالندھریہ سادہ ہوتا ہے نہ کلف نہ ٹیس۔ جذبات سے پچ پچ کرتا ہے۔ مُنہ پھٹ ہوتا ہے۔ روایت کا خبط سوار رہتا ہے۔ تعلیم اس کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتی۔ رشتوں کے بندھن میں جکڑے رہنا پسند کرتا ہے۔ کشتیوں اور مشاعروں کا شوقین ہے۔

مسعود قریشی میں جالندھر کی تمام خصوصیات موجود ہیں سوائے اس سؤر کے جو اس نے بڑے اہتمام سے پال رکھا ہے۔ وہ پیدل چلنے کا اتنا شوقین ہے کہ اکثر کار میں بیٹھنے سے گریز کرے گا۔ جسم پیدل ہے اور ذہن ہوا باز۔ دور کی کوڑی لاتا ہے۔ میل جول کا رسیا

ہے خود زندگی جذبات کے زور پر بسر کرتا ہے۔ دوسروں کے سامنے عقل کا چھنکنا چھنکاتا رہتا ہے۔ سوچ بڑی متوازن ہے۔ اللہ کے سامنے جی حضور یہ ہے۔ اسلام کے خلاف بات کرو تو پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ جائے گا۔ کوئی ذہنی بالادستی کا مظاہرہ کرے تو اپنے کانٹے نکال لیتا ہے۔

بیوی کے ساتھ جی حضور یہ نہیں ہے لیکن پتہ نہیں کیسے اس بی بی کو گمان دیئے رکھتا ہے کہ ہے۔ کہتا ہے گھریلو خوشی کو قائم رکھنا اشد ضروری ہے۔ اور بیوی کو خوش رکھنا کچھ مشکل نہیں جس طرح بچے کو ٹافی دے کر خوش رکھا جا سکتا ہے اسی طرح بیوی کو توجہ دے کر۔ توجہ چاہے جھوٹی ہو۔ بناسپتی ہو۔ سرسری ہو۔ جیسی بھی ہو۔ مگر ہو۔

گھریلو خوشی کے دیے میں تیل ٹپکاتا رہتا ہے۔ پک نک پر جائے گا تو بیوی کے لیے تحفہ ضرور لائے گا۔ اور تحفہ بھی ایسا چنے گا جو صرف محبوبہ کو دینے کے قابل ہو۔

ہر مرحلہ میں بیوی کا مشورہ ضرور لے گا۔ مشورہ لینا مقصود نہیں ہوتا۔ صرف اسے یقین دلانے کے لیے کہ اسے اہمیت دی جا رہی ہے۔ گھر کی خوشی قائم رکھنے کے لیے وہ ہر پاپڑ بیلنے کے لیے تیار رہتا ہے۔

مسعود کی زندگی میں ایک کایا پلٹ تبدیلی واقع ہوئی۔ یہ ایک حیران کن واقعہ تھا۔

کایا پلٹ تو میری زندگی میں بھی واقع ہوئی تھی۔ لیکن اس کا ایک محرک تھا۔ جو اسے عمل میں لایا تھا۔ ایک کاز تھا جس کے نتیجے میں وہ تبدیلی واقع ہوئی تھی۔ بات سمجھ میں آتی تھی۔ لیکن مسعود کی کایا پلٹ میں کوئی وجہ نہ تھی کوئی محرک نہ تھا۔ بیٹھے بٹھائے سنڈی تتلی میں بدل گئی۔

مسعود تو وہی مسعود رہا جو پہلے تھا۔ صرف رُخ بدل گیا۔ حرکت کے بغیر بدل گیا کوشش اور خواہش کے بغیر بدل گیا۔ مسعود کے اندر کا موسم بدل گیا۔ پہلے وہ کڑی دھوپ تھا پھر بھور سمے بن گیا۔

ویسے تو پہلے بھی مسعود اللہ سے منکر نہ تھا۔ تعلق تو تھا لیکن ذہنی تھا۔ جیسے ادیبوں اور دانش وروں کا ہوتا ہے۔ ہم اللہ کو قادر مطلق تو مانتے ہیں لیکن منہ زبانی۔ ہم جج بن کر اس کی کارکردگی کو جانچتے رہتے ہیں۔ اللہ کو یہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یوں نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ارے



یہ کر دیا۔ یہ تو اس کے شایانِ شان نہ تھا۔ انسان سے ہر ناانصافی اللہ کی توہین کے مترادف ہے۔

Another injustice to mankind, another insult to God.

اگر اللہ خیر ہے تو وہ مظلوموں کی دادرسی کیوں نہیں کرتا اور اگر وہ دادرسی کی طاقت نہیں رکھتا تو وہ اللہ نہیں ہے۔

If He is good why doesn't He succour. If He can't, He is not God.

پتہ نہیں یہ کیسے ہوا۔ کیوں ہوا۔ مسعود کے چاہنے بغیر، جاننے بغیر۔ وسیلے بغیر اللہ نے چوروں کی طرح نقب لگائی اور مسعود کے ذہن سے اتر کر اس کے دل میں آ بیٹھا۔

اگلے روز مسعود نے اپنے مسائل دکھوں، محرومیوں اور امیدوں کی جو بوجھل گٹھڑی جو وہ اپنے سر پر ہاتو کی طرح اٹھائے پھرتا تھا۔ اللہ کی دہلیز پر دے ماری۔ یہ لے اپنا سارا بوجھ تجھ پر رکھ دیا۔ اب تو جانے تیرا کام۔ جو مرضی ہے کر سیاہ کر سفید۔ سر کھا۔

اب جو کچھ گزرنا ہے جان پر گزر جائے۔

پھر مسعود کا بریشم قلندر قہقہہ۔ جو کرے کرتار میں بدل گیا۔

انہی دنوں مسعود براڈ کاسٹنگ سے ریٹائر ہوا تو اسے گریجوٹی کی رقم ملی۔ اس کے ایک پرانے دوست نے کہا۔ اگر رقم تو نے اپنے پاس رکھی۔ تو، تُو اسے کھا پی جائے گا۔ بہتر ہے اسے انویسٹ کر دے۔ ہمارا اپنا بزنس ہے۔ تو بے شک ہمارا پارٹنر بن جا۔ ایک سال میں رقم دُگنی ہو جائے گی۔ ہمارا ہیروں جواہرات کا بزنس ہے۔ مسعود نے ساڑھے چار لاکھ روپے اپنے دوست کو دے دیئے۔

چند مہینوں بعد دوست نے مسعود کو فون پر خبر دی کہ اب کی بار بہت بڑا نقصان ہوا۔ ساری رقم ڈوب گئی۔ اگر جب کا مسعود یہ خبر سنتا تو اسے ہارٹ اٹیک ہو جاتا چونکہ نوکری ختم ہو چکی تھی۔ آمدن کا کوئی اور ذریعہ نہ تھا۔ یہی اس کی پونجی تھی۔ شاید قدرت نے یہ ڈرامہ اس لیے سٹیج کیا ہو کہ وہ آزمائش کر رہا ہو کہ جو کرے کرتار کا نعرہ۔ منہ زبانی تو نہیں۔

چند ایک گھنٹے تو وہ بھونچکا رہا۔ پھر دفعتاً اس نے ایک بلند اور بھیانک قہقہہ لگایا۔ لیکن اس قہقہے میں آنسوؤں کی بھیگ تھی۔

تو دانی حساب کم و بیش را

یہ سن کر اس کی رحمت یوں جوبن پر آئی جیسے عنفوان شباب میں لڑکی پر جوبن آتا ہے۔

مسعود کی زندگی میں آج بھی اس کی رحمت چشمے کی طرح چل رہی ہے چلے جا رہی ہے۔ اور مسعود کا جو کرے کرتار ویسے ہی تر و تازہ اور شگفتہ ہے۔ کہیے آپ کو بات سمجھ میں آئی۔ میرے پلے تو کچھ نہیں پڑا۔ اگر آپ مسعود سے پوچھیں کہ مانگ کیا مانگتا ہے تو وہ یونانی صوفی کی طرح کہے گا۔ میاں یہاں سے ہٹ جاؤ۔ تم میری دھوپ روک رہے ہو۔

وہ اپنی زندگی سے قطعی طور پر مطمئن ہے۔

وہ ماضی اور مستقبل سے بے نیاز ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر آپ ''جو کرے کرتار'' کا وِرد اپنا لیں تو نہ ماضی رہتا ہے نہ مستقبل۔

بہرحال مسعود کے دل میں ایک کانٹا ضرور لگا ہوا ہے۔ اپنے کیریئر کے دوران مسعود نے اپنی تمام تر وفاداریاں براڈ کاسٹنگ کے قدموں میں رکھ دیں۔ زندگی میں اپنے پروفیشن کو فسٹ پری آریٹی دے دی۔ اپنے سارے انڈے ایک ٹوکری میں رکھ دیے۔

دراصل قدرت نے مسعود کو پوئٹری کا گفٹ دیا تھا۔ بچپن سے ہی اس نے شعر جوڑنے شروع کر دیئے تھے۔ شاعری میں اس کا انداز منفرد تھا۔ جوانی میں کچھ عرصہ وہ شعر کہتا رہا پھر یہ گفٹ بھی اس نے پروفیشن کے قدموں میں رکھ دیا۔ بارہ سال اس نے شاعری سے قطع تعلق کیے رکھا۔

پھر ایک دن وہ دفعتاً چونکا۔ ارے یہ میں نے کیا کیا اللہ کی دین کو ٹھکرا دیا۔ اسے سرکار کی نشریات کی بھینٹ چڑھا دیا۔ اس روز سے آج تک وہ تلافی مکافات میں مصروف ہے۔ روز شام کے وقت وہ سیر کرنے کے بہانے باہر نکل جاتا ہے اور غزل کے چار ایک شعر موزوں کر کے لے آتا ہے۔ اس کے کلام میں ندرت ہے، انفرادیت ہے۔

مسعود قریشی کا پہلا مجموعہ ''آشوب آگہی'' پانچ سال پہلے شائع ہوا تھا۔ دوسرا



''صدقِ ہنر'' اور تیسرا ''حجاب لفظ'' حال ہی میں شائع ہوئے ہیں۔

ظاہر میں آج کا مسعود وہی لگتا ہے جو ۱۹۵۰ء میں تھا۔ وہی اس کا بریشم قلندر قہقہہ ہے۔ وہی اس کا رویہ ہے کر لو میرا کیا کرنا ہے۔ وہی اس کے اندر کا سؤر ہے جس کی تھوتھنی میں وہی ہٹ جا بچ جا کی دھونس ہے۔ لیکن جس میں دیکھنے کی صلاحیت ہے اسے صاف نظر آتا ہے کہ یہ مسعود وہ مسعود نہیں ہے۔

حیرت ہے کہ صرف اپنے دُکھوں محرومیوں اور امیدوں کی گٹھڑی اللہ کے در پر رکھ دینے سے اتنا فرق پڑ گیا ہے کہ وہ چٹکیاں مارتا ہوا گنگناتا پھر رہا ہے۔

ترے کرم کے سوا شرح زندگی کیا ہے

-☆-

۱۹۶۶ء

# ٹیڑھی لکیر

اشفاق احمد نے کہا اس سے ملو یہ آذر ذوبی ہے۔ پاکستان کا جانا پہچانا مصور۔

میرے سامنے گٹھے ہوئے جسم، چھوٹے قد کا آدمی کھڑا تھا۔ عمر کچھ زیادہ نہ تھی چہرے پر میڈیاکر کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔ دیکھنے میں اس قدر مستعد نظر آتا تھا جیسے کسی فرم کا نائب ایگزیکٹو ہو۔ چہرے پر سنجیدگی کا واضح غبار تھا۔ ہونٹوں پر ایک شگفتہ تازہ ہر دم تیار مسکراہٹ تھی جیسے سٹریٹ واکرز میں ہوتی ہے۔

اسے دیکھ کر میں بہت مایوس ہوا۔ کیا جانے پہچانے مصور اس چوکھٹے کے مالک ہوتے ہیں۔ پہلے اپنا چوکھٹا تو ٹھیک کر لے اور پھر نام آذر ذوبی۔ بالکل ہی بدیشی قسم کا۔

یہ ۱۹۴۸ء کی بات ہے جب ہم تازہ تازہ دیس سے نکالے جانے کے بعد لاہور میں آ مقیم ہوئے تھے۔ نوکری ملتی نہ تھی۔ باورچی خانے میں چولہا ٹھنڈا پڑا تھا۔ صرف پاکستان کے بن جانے کے نشے پر گزارہ کر رہے تھے۔ کام کاج تھا نہیں۔ لنڈورے پھرتے تھے۔ اتنی عقل نہ تھی کہ ری ہیبلی ٹیشن کے دفتر کے چکر لگاتے۔

انہی دنوں اشفاق احمد سے ریفیوجی کیمپ میں پہلی بار ملاقات ہوئی تھی۔ اب اشفاق احمد کے دوستوں تک نوبت آ پہنچی تھی۔

ان دنوں اشفاق احمد کورا اشفاق تھا۔ نہ ریڈیو نہ ٹی وی نہ ادب۔ ابھی خود فین تھا۔ تھا تو پٹھان لیکن دیکھنے میں کشمیرن نظر آتا تھا۔ بڑا زندہ دل ساتھی۔ ہر وقت مسرت کی پھوار نکلتی تھی جو گردو پیش کو بھگو دیتی تھی۔ شہرت کتنی ظالم چیز ہے جو کلغی جما دیتی ہے۔

ذوبی کی آمد سے ہماری ٹکڑی بن گئی اشفاق احمد کی پھوار میں مستی آ گئی ذوبی کے جوہر کھلے۔

ذوبی کی آمد سے پہلے ہم روز اشفاق احمد کے گھر میں ملا کرتے تھے۔ اشفاق احمد کا گھر روایتی پٹھان کا گھر تھا۔ بڑے خان کے پاؤں کی آہٹ سن کر اس وسیع و عریض فیملی پلاننگ سے بے نیاز گھر پر سناٹا چھا جاتا تھا بڑے خان کی مرضی کے بغیر وہاں پتہ نہیں ہلتا تھا۔ وہاں اشفاق کی پھوار کمیٹی کا ننکا بن کر رہ جاتی تھی۔

ذوبی کی آمد پر ہمیں ہلڑ مچانے کے لیے ایک وسیع و عریض جگہ مل گئی جہاں کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ کسی بلی کا خوف نہ تھا۔ سوچو ہے ناچے۔ ان دنوں لاہور کے حاکم نے اوپن ایئر تھیٹر جو لارنس باغ میں واقع ہے ذوبی کو دے رکھا تھا ذوبی وہاں تصویریں بنایا کرتا تھا۔ اشفاق احمد ہلڑ مچاتا۔ میں واحد ناظر سامع۔

اوپن ایئر تھیٹر میں جا کر پتہ لگا کہ ذوبی کے دو چہرے ہیں۔ ایک سنجیدہ، بدرنگ حاکمانہ۔ اکتایا ہوا، نکتہ چین، دوسرا مسکراہٹ بھرا، رنگدار چلبلا، جگت بھرا، شرارت سے بھرپور، ایڈونچرزدہ، پہلا چہرہ بنیادی تھا دوسرا اگرچہ ڈیک اینڈ چہرہ تھا۔ لیکن بھرپور اظہار سے بھرپور۔ چق پیچھے کھڑی دوشیزہ کی طرح جھلک دکھاتا پھر چھپ جاتا۔ کبھی حنائی انگلی ابھرتی، کبھی کالی آنکھ، کبھی جسم، ہونٹ، کبھی رنگدار پلا، کبھی اڑتی لٹ۔

آج بھی ذوبی کی شخصیت کا نقشہ وہی ہے پھیکا پھیکا، اداس، گرے، آسمان جس پر کبھی کبھی تارے ٹمٹما جاتے ہیں۔ یہ چمکا وہ چمکا۔ ادھر پھلجھڑی چلی۔ ادھر مہتابی شوں سے نکل گئی۔ دور سے دیکھو تو وہ ایک سیانہ بیانہ۔ ضرورت سے زیادہ ٹھہرا ہوا۔ اکتایا ہوا۔ دو اور دو چار قسم کا فرد ہے۔ قریب جا کر گھونگھٹ اتارو تو متبسم، رنگیلا، شریر۔

اوپن ایئر تھیٹر میں پہنچا تو ذوبی کے متعلق ایک اور بھید کھلا۔ اتنا حیران ہوا کہ بالکل ہی فیوز ہو کر رہ گیا۔

ان دنوں میں جنسیات کا طالب علم تھا اور اس موضوع پر خود کو بڑا پاٹے خاں سمجھتا تھا۔ جنس کی بات چھڑ جاتی تو میرا ہاتھ انجانے میں مونچھ مروڑنے لگتا۔ اور گردو پیش کے حاضرین کبڑے ہو جاتے۔ گلیور ابھرتا۔ ابھرے چلا جاتا لیکن اوپن ایئر تھیٹر میں ذوبی کو

دیکھ کر گلیور کا غبارہ پھٹ گیا۔ چھیچھڑا باقی رہ گیا۔

اوپن ایئر تھیٹر میں بیگمات محترمائیں اور کالج کی لڑکیاں اکثر آیا کرتی تھیں۔ وہ سب ذوبی کی فین کی حیثیت سے آتیں اور اس کے بنائے ہوئے مجسمے اور نقوش دیکھتی رہتیں۔

ان آنے جانے والیوں کی طرف ذوبی کچھ زیادہ توجہ نہیں دیتا تھا۔ وہ اپنے کام میں مصروف رہتا۔ ان کی باتوں کے جواب میں کبھی کبھی ادھورا سا کاٹ دار جملہ چلا دیتا اور ہلکی سی ادھوری مسکراہٹ جھلکاتا۔ گویا ایک ساعت کے لیے بوتل کھلتی بلبلے اٹھتے، اور پھر مطلع سکوت آلود ہو جاتا۔ مجھے اس بات پر غصہ آتا تھا۔ رہا نا اُوت کا اُوت گھر آئی لکشمی کی یہ بے قدری توجہ دے۔ آنکھ لشکائے نگاہ گرمائے، بھُس میں چنگاری چھوڑے۔ بھانبڑ لگے۔ اسے تاپے شاید ہم بھی۔ ظالم اپنے ارد گرد ٹھنڈ پھیلائے بیٹھا رہتا ہے۔ احمق کہیں کا۔ مصور کم کم نظر آتا ہے پہلوان زیادہ۔

پھر ایک روز میری عقل پر پڑا ہوا پردہ اٹھ گیا۔ میں نے دیکھا کہ ہر آنے والی خود کو چینی کی پلیٹ میں ڈالے دیوتا کی بھینٹ کرنے آتی ہے اور درگاہ پر خود کا چڑھاوا چڑھا کر خوشی خوشی گھر لوٹ جاتی ہے اور دیوتا مہاراج یوں من منت بیٹھے رہتے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ یہ طریقۂ واردات میرے لیے بالکل انوکھا تھا۔

اس انکشاف پر مجھے از سرِ نو غصہ آنے لگا۔ ساری بات میرے پلی پلی جوڑے ہوئے علم کے منافی تھی۔ گاڑھے پسینے کے کمائے ہوئے میرے سارے جنسیات کے اصول صابن کے بلبلوں کی طرح جھاگ بن کر رہ گئے اس گٹھے ہوئے پہلوانی جسم، بے کشش میڈیا کر شکل کے فرد میں وہ کیا گیدڑ سنگھی ہے کہ محترمائیں خود کو تھالی میں پروس کر ہتھیلی پر سجا کر اتنی دور سے چل کر یہاں آتی ہیں۔

یہ معمہ میں حل نہ کر سکا۔ آج تک نہیں کر سکا۔

جب میں نے ذوبی کے گھر جانا شروع کیا تو یہ معمہ اور بھی پیچیدہ ہو گیا۔ چونکہ وہاں پر بھی اوپن ایئر تھیٹر والی کیفیت تھی۔ بیڈن روڈ پر ذوبی کا گھر ایک عام سا گھر تھا۔ باہر بیٹھک تھی اندر پتہ نہیں کیا کیا تھا۔ بیٹھک کو ذوبی نے اسٹوڈیو بنا رکھا تھا، دیواروں پر ذوبی کے بنے ہوئے سکیچز اور پینٹنگز آویزاں تھے۔ ایک کونے میں اس کا ورکنگ ڈیسک تھا گھر میں بھی خواتین مہمان بن کر آتیں خود کو تھالی میں پروس کر ہتھیلی پر رکھے ہوئے۔ گھر میں ان کی آؤ بھگت کی جاتی۔ لیکن ذوبی یوں بے تعلق اور بے نیاز رہتا جیسے واقعی پتھر کا دیوتا ہو۔ ویسے گھر میں ذوبی واقعی دیوتا سمان منایا جاتا تھا۔ وہ گھر میں بے حد سنجیدہ رہتا۔ کم بولتا، طنز کا ایک پتھر چلا کر چپ ہو جاتا۔ گھر کے تالاب میں لہریں چلتی رہتیں۔

محفل میں بھی وہ کم بولتا۔ سنجیدگی کا پس منظر چھائے رہتا۔ جس میں کبھی کبھار ایک پھلجھڑی سی شوں کر کے چل جاتی۔

ذوبی میں مزاح کی بڑی صلاحیت ہے۔ اس کے چھوٹے ادھورے مختصر جملوں میں بلا کی شگفتگی ہے۔ کبھی کبھار وہ طنز کی شکل بھی اختیار کر لیتے ہیں لیکن ان کی دھار میں کاٹ کی نسبت شگفتگی زیادہ ہوتی ہے۔

سنجیدگی اور خاموشی ذوبی کے ہاتھ کے دو بڑے ہتھیار ہیں۔ اس کی بے نیازی اور سو واٹ ان کی دھار کو مزید تیز کر دیتے ہیں۔ ذوبی ایک ایسی کلی ہے جو چٹک کر پھر سے بند ہو جاتی ہے۔ یہ تنک بخشی اس کی کشش کو قائم رکھتی ہے۔

چاہے وہ آپ کا کتنا پرانا دوست کیوں نہ ہو یہ تعلق سیری پیدا نہیں کرتا۔ تشنگی قائم رہتی ہے۔ مزاج کے علاوہ وہ کڑوی سے کڑوی بات یوں بے جھجک کہہ دیتا ہے جیسے شربت کا گھونٹ پی رہا ہو۔ سچی بات کہنے سے نہیں چوکتا۔ اس وقت یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سخت بدلحاظ آدمی ہو۔

ذوبی کے ساتھ رہو تو جلد ہی احساس ہو جاتا ہے کہ اس کی شخصیت میں ایک سؤر تھوتھنی اٹھائے بیٹھا ہے۔ اگرچہ کبھی کبھار تھوتھنی نکالتا ہے لیکن وہ ہر وقت باہر نکلنے کے لیے تیار رہتی ہے۔

مثلاً ان دنوں ذوبی کا کوئی ذریعہ آمدنی نہ تھا۔ وہ گھر بیٹھ کر کمرشل کام کرتا تھا۔ اسے کہیں جا کر کام مانگنا گوارا نہ تھا۔ چولہا ٹھنڈا ہونے کے امکانات بڑھتے جا رہے تھے۔ گھر والے گھبرا جاتے لیکن وہ اطمینان سے بیٹھا رہتا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

کوئی گاہک کمرشل کام لے کر آتا تو وہ اسے خاص توجہ نہ دیتا۔ آؤ بھگت نہ کرتا، ٹھنڈا سا ہاتھ ہلا کر بٹھا دیتا۔ اپنے کام میں مصروف ہو کر بے پرواہی سے پوچھتا جی۔ فرمائیے۔

ان دنوں بازار میں کمرشل آرٹسٹ کتاب کے سرورق کے ۲۵ روپے لیتے تھے لیکن ذوبی نے ۶۵ روپے ریٹ قائم کر رکھا تھا۔ جس میں سے وہ ایک روپیہ کم کرنے پر تیار نہ ہوتا۔ وہ سودا بازی کرنا جانتا ہی نہ تھا۔ اس کا انداز کچھ ایسا ہوتا کہ کام دینا ہے تو دے جاؤ نہیں تو جاؤ۔ یہاں بیٹھے میرا منہ کیوں دیکھ رہے ہو۔

ایک دن مجھے علم تھا کہ گھر میں دھول اڑ رہی ہے جب اس نے سکیچ کے ۶۵ روپے بتائے اور کہا ۶۵ ہی ہوں گے۔ بنواؤ یا نہ بنواؤ۔ اور گاہک اٹھ کر چلا گیا تو میں پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گیا۔

میں نے کہا۔ کوئی عقل کی بات کر۔

کیوں۔۔۔ میں نے بے عقلی کی بات کی ہے کیا۔۔۔؟

تو نے گاہک لوٹا دیا ہے۔

نہ۔ میں نے تو نہیں لوٹایا۔

یہ کیا دکانداری کا اصول ہے۔

اچھا۔ میں کیا دکاندار ہوں؟

تو نہیں کیا؟

میں نے خود کو کبھی دکاندار نہیں سمجھا۔

کیا سمجھتے ہو خود کو؟

ابھی تو آرٹسٹ ہوں۔

بازار میں آرٹسٹ سرورق کے ۲۵ روپے لیتے ہیں۔

بسم اللہ پڑے لیں۔ مجھے کوئی آبجکشن نہیں۔

تو اپنے ریٹ کم کیوں نہیں کرتا۔

نہ مفتی۔۔۔ فکسڈ ریٹ۔

پتہ ہے گھر میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔

اچھا۔۔۔ چوہے مار دوا منگوا لیں گے۔

چوہے مار کہاں سے منگوائے گا گھر میں آٹا نہیں، روٹی کیسے پکے گی۔ کھائیگا کیا؟

اچھا۔۔۔ تو نہیں کھائیں گے۔

پاگل بھوکا رہے گا کیا؟

کوئی نئی بات نہیں۔ مجھے عادت ہے بھوکا رہنے کی۔

کیا مطلب؟

زندگی میں کئی کئی دن بھوکا رہا ہوں۔

کیا تیرے گھر والے۔ بچے

وہ میرے بچے ہیں۔ میرے۔

آپ ذوبی سے کبھی بحث نہیں کر سکتے۔ وہ جوش میں نہیں آتا، غصے میں نہیں آتا۔ ٹھنڈے ادھورے جملوں سے آپ کے دلیلی وار کو بے اثر کر دیتا ہے۔

مثلاً اوپن ایئر تھیٹر سے پروسی تھالی کی بھینٹ دینے کے بعد جب محترمہ رخصت ہو جاتیں تو میں پوچھتا:

یار یہ تو بڑی بانکی تھی۔

اچھا بانکی تھی کیا؟ وہ حیرت سے دہراتا۔

ہاٹ اینڈ سموکنگ تھی۔

اچھا!

تجھے پتہ نہیں چلا۔

نہیں تو۔

تو جلا نہیں؟

نہیں۔

کیسی لگی تجھے؟

بس عورت تھی۔ سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔

تجھے کبھی کسی کی لگن نہیں لگی کیا؟

اُونہوں لگن کیسی۔

کچھ نہیں ہوتا کیا۔

بس آتی ہیں چلی جاتی ہیں۔

کچھ پیچھے چھوڑ جاتی ہیں۔۔۔ کیا۔

ہاں۔ اک بوسی چھوڑ جاتی ہیں۔

تیرا مطلب ہے خوشبو۔

پھر اوپن ایئر میں ایک لڑکی آئی۔ اس کے ہاتھ خالی تھے نہ بھینٹ نہ آرتی۔ نہ پھول۔ دیوتا چونکا یہ کیسی عورت ہے جو ہمارا اپمان کر رہی ہے۔ وہ غصے میں آ گیا۔ اپنے سنگھاسن سے اترا۔ ترکش اٹھایا۔ سارے تیر آزما دیکھے۔ کچھ بھی نہ ہوا۔ عورت پجارن نہ بنی۔

دیوتا کا سارا کلف اُتر گیا۔ نیچے سے انسان نکل آیا۔ ایک عام مرد۔ بیچارہ بے بس منتوں پر اتر آیا۔ آہ وزاری کی۔ سر نوا دیا۔

مہینوں دیوی کی گلی کے پھیرے لیتا رہا۔ دیوی نے پھر بھی نہ نوازا۔

بت ٹوٹ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا۔ مہینوں اپنے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے چنتا رہا۔

ذوبی کے ٹوٹنے پر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔

پتہ نہیں کیوں جب بھی کوئی بت ٹوٹے تو مجھے ان جانی خوشی محسوس ہوتی ہے۔

مجھ میں نقد و نظر کا خانہ سرے سے خالی ہے۔

ذوبی کے عمل دیکھتا رہتا۔ چند ایک نقوش نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ جب بھی اس کے کسی عمل سے میں متاثر ہوتا تو میری توجہ عمل سے ہٹ کر اس بات پر مرکوز ہو جاتی کہ یا اللہ اس پہلوان نما میڈیا کر نظر آنے والے شخص میں اتنی گہرائی کہاں سے آئی۔ اتنی ان جانی دانش۔ اتنی انوویشن۔



حیات کی بنا پر میں اپنے دوستوں کی نسبت بڑا بدقسمت آدمی ہوں۔ اشفاق احمد میری نسبت زیادہ سنتا ہے۔ ذوبی زیادہ دیکھتا ہے۔

بانو قدسیہ زیادہ محسوس کرتی ہے۔

احمد بشیر میں میری نسبت بہت زیادہ ذہنی چمک ہے۔ میرا بیٹا عکسی میری نسبت زیادہ دیکھتا بھی ہے اور سنتا بھی ہے۔ اور قدرت اللہ شہاب وہ تو ہم سب سے زیادہ دیکھتا اور زیادہ سنتا ہے۔

جب میں نے ذوبی کے عمل "ماں" کو دیکھا تو تڑپ کر رہ گیا۔ وہ کوکھ ہی کوکھ تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کائنات ان زائدہ بچہ ہو۔ میں حیران ہوتا تھا کہ قصور کا ایک ان پڑھ پہلوان نما الہڑ لڑکا اتنی عظیم حقیقت کو چند لکیروں میں کہہ دے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی لیکن بات میرے سامنے دھری تھی۔

انہی دنوں میں ذوبی نے اوپن ایئر تھیٹر میں ہمارے بت بنانے شروع کر دیئے۔

ذوبی نے اشفاق احمد کا بت بنایا تو میں نے شور مچا دیا۔

یہ کیا بنا دیا تو نے جیسے بالٹی اوندھی پڑی ہو۔

اچھا وہ بولا۔ بالٹی سیدھی پڑی ہے کیا۔

لیکن بالٹی کیوں میں نے کہا۔

بھئی سکیئر فیس ہے اشفاق کا۔

چہرے کی ساری لکیریں نیچے گرا دیں تو نے۔

میں نے نہیں گرائیں۔ گری ہوئی تھیں۔

بھئی اشفاق احمد تو باغ و بہار آدمی ہے۔

ہاں ہے تو۔

تو نے اسے دُکھی بنا دیا۔

اچھا دکھی بنا دیا میں نے۔

دیکھ تو چپ سوچ زدہ متفکر دکھی۔

ہاں یار وہ بولا لیکن مجھے تو ایسے ہی دکھا۔ جیسے دکھا ویسے بنا دیا۔ میں نے اپنے پلے سے کچھ نہیں لگایا۔

اشفاق احمد کے ساتھ چند ماہ رہنے سہنے کے بعد یہ جان کر میں حیران رہ گیا کہ اس کی باغ و بہاریت تو ایک پردہ ہے۔ بہروپ ہے بنیادی طور پر وہ چپ ہے۔ سوچ کا مارا ہوا ہے۔ دکھی ہے۔

ذوبی نے میرا بت بنایا۔ تو میں پھر چلایا۔ لو یہ کیا بنا دیا تو نے۔ یار مجھ میں شر ضرور ہے پر اتنا گاڑھا تو نہیں۔

اچھا ذوبی بولا۔ اگر چہرے پر نہیں تو لازماً اندر ہوگا۔

آج اس بات کو ۳۴ سال ہو چکے ہیں، جوں جوں ماہ و سال گزرتے جاتے ہیں میرا چہرہ ہو بہو ذوبی کے بنائے ہوئے بت کے عین مطابق ہوتا جا رہا ہے۔ اسے دیکھ دیکھ کر میں حیران ہوتا ہوں یا اللہ یہ شخص بت تراش ہونے کے علاوہ پیش گو بھی ہے۔

جب ذوبی کو اٹلی کا سکالرشپ ملا تو اس کے حالات ایسے تھے کہ وہ پاکستان کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا تھا۔ عزیز و اقارب کی بھاری گٹھڑی اس کے سر پر دھری ہوئی تھی۔ ماں تھی بیوی تھی بچے تھے۔ بہن بھائی تھے جن کی کفالت ذوبی کی واحد ذمہ داری تھی۔

لیکن اس نے اپنے اندر کے سؤر کی تھوتھنی نکالی۔

سر پر دھری گٹھڑی کو دھڑام سے زمین پر پھینکا اور سوٹ کیس اٹھا کر اٹلی چلا گیا۔

اتنی بے تعلقی اتنی خود غرضی۔۔۔ ایسا رویہ صرف آرٹسٹ ہی روا رکھ سکتا ہے۔

اٹلی جانے میں اس کا مقصد پیسہ کمانا نہ تھا۔ سیاحت کا جذبہ نہ تھا بلکہ فن کے اطالوی رخوں سے آشنا ہونا تھا۔ اس لحاظ سے ذوبی پیدائشی آرٹسٹ ہے۔ اپنے فن کی محبت میں اس نے بسا اوقات ''ڈیول مے کیئر'' کا رویہ اختیار کیا۔ اپنوں کو بے دردی سے قربان کر دیا۔ خود کو قربان کیا۔ اپنے آرام و آسائش کو بھینٹ چڑھا دیا۔ خود کو فاقوں کے حوالے کر دیا۔ بے خانماں ہوا۔ چیتھڑے لٹکائے پھرا۔ در در کی خاک چھانی۔ سڑکوں کے کنارے فٹ پاتھوں پر پڑا رہا۔



ذوبی کی کہانی بڑی عبرت ناک کہانی ہے۔

قصور میں حافظوں کے خاندان میں ایک لڑکا عنایت اللہ تھا۔ طبیعت میں تجسس کا بھانبڑ لگا ہوا تھا۔ کان زیادہ سنتا تھا۔ سر اور تال شدت سے متاثر کرتے تھے۔ آنکھیں لکیریں دیکھتی تھیں۔ انگلیاں لکیریں کھینچنے کے لیے بیتاب رہتی تھیں۔ اکھاڑے میں ورزش کرتا۔ جماعت میں لکیریں کھینچتا رہتا۔ ٹاٹ پر، تختی پر، کتابوں پر، اس بات پر ماسٹر نے بارہا پیٹا۔ کئی بار تختی اس کی کمر پر ٹوٹی۔ سالا کافر ہے۔ تصویریں بناتا ہے۔ دسویں پاس کرنے کے بعد ٹھس ہو کر رہ گیا۔ آگے پڑھنے کی توفیق نہ تھی۔ اب کیا کروں اب کیا کروں۔

سرتال کی لگن نے بینجو سیکھنے پر مائل کر دیا۔ یہ شوق جنون بن گیا۔

پھر قصور کے جانے پہچانے طبیب اور ڈاکٹر بشیر احمد کی محفل میں جا بیٹھا۔ ڈاکٹر کے ہاں عالم، شاعر، ادیب، مصور آتے تھے۔ وہاں بیٹھ کر ان کی باتیں سنتا دیوانہ وار سنتا سنے جاتا سنے جاتا۔

ڈاکٹر نے کہا لڑکے تو جو روز آتا ہے۔ بے شک آ۔ ساتھ کام میں میرا ہاتھ بٹا دیا کر۔ ڈاکٹر کا کمپاؤنڈر بن گیا۔ نگاہ بوتلوں پر رہتی۔ کان باتوں پر۔

قصور میں بڑی بڑی کشتیاں ہوتی تھیں۔ بڑے بڑے پوسٹر لگتے۔ ان کی نقل اتارتا رہتا۔ کاغذ خریدتا۔ تصویریں بناتا۔ ڈاکٹر کو دکھاتا۔ وہ حوصلہ بڑھاتے۔ شام کو اکھاڑے میں پہنچتا۔ پھر گھر جا کر بینجو بجاتا۔

اتفاق سے اسکول میں ڈرائنگ ماسٹر کی آسامی خالی ہو گئی۔ ڈاکٹر نے سفارش کی۔ عنایت کی تصویریں دکھائیں۔ ہیڈ ماسٹر نے پندرہ روپے ماہوار پر عارضی طور پر نوکر رکھ لیا۔ پہلے عنایت کو صرف تصویروں کی نقل اتارنے کا شوق تھا۔ سکول میں ڈرائنگ ماسٹر بن کر اس کی توجہ ماڈل پر منعطف ہو گئی۔ پھر نسبتوں کا شعور ہوا۔ اسکیل کا احساس جاگا۔ زاویے ابھرے اور بالآخر انسانی جسم اور اعضا کی طرف توجہ منعطف ہو گئی۔

یہ عیاشی چند ماہ کے بعد ختم ہو گئی۔ ایک ٹرینڈ جے وی ڈرائنگ ماسٹر سکول میں آ گیا۔

عنایت کی چھٹی ہوگئی۔

اس وقت اس کے ذہن میں جے وی کرنے کا جنون جاگا۔ اس کے خیال میں جے وی سے بڑھ کر اور کوئی اعزاز نہ تھا۔

غم غلط کرنے کے لیے بنجو کا سہارا لیا۔ اتنا ریاض کیا کہ قصور میں بنجو بجانے کے مقابلے میں اوّل رہا۔ پھر سارے علاقے میں بہترین بنجو پلیئر مانا گیا۔

ایک دن اتفاقاً چڑیا گھر جا پہنچا۔ وہاں ایک سکھ لڑکا بندر کی تصویر بنا رہا تھا۔ عنایت نے اسے بندر بنا دیا۔ پھر اس سے پوچھا تم بندر کی تصویر کیوں بنا رہے تھے۔ سکھ نے کہا میں ڈرائنگ سکول میں پڑھتا ہوں۔ عنایت یہ سن کر حیران ہوا۔ کیا ایسے سکول بھی ہوتے ہیں جہاں ڈرائنگ سکھائی جاتی ہے۔

سکھ نے میو سکول آف آرٹس لاہور کا پتہ دے دیا۔ پھر یہ جنون سوار ہوا کہ لاہور جا کر ڈرائنگ سیکھوں۔ ماں کی منتیں کیں۔ ہاتھ جوڑے ماں نے اجازت نہ دی۔ دل میں بغاوت جاگی۔ ایک روز اپنی تصویریں اور بنجو اٹھا کر چوری چوری کسی کو بتائے بغیر لاہور پہنچ گیا۔ جیب میں صرف ایک روپیہ تھا۔ چھ آنے کا ٹکٹ خریدا باقی دس آنے سنبھال کر رکھ لیے۔

پرنسپل سے ملنے کی درخواست کی۔ تین دن پرنسپل کے کمرے کے دروازے پر بیٹھا انتظار کرتا رہا کہ کب بلائے۔ رات ریلوے اسٹیشن کے مسافر خانے میں پڑ رہتا۔ روز صرف ایک روٹی کھاتا وہ بھی سوکھی۔ ڈرتا تھا کہ کہیں پیسے ختم نہ ہو جائیں۔

چوتھے روز تنگ آ کر چق اٹھا کر اندر چلا گیا۔ پرنسپل گپتا غصے سے بھنا گیا۔ چپڑاسی کو آواز دی۔ اس لڑکے کو اٹھا کر باہر پھینک دو۔ عنایت نے اپنی بنائی ہوئی تصویریں میز پر پھیلا دیں۔ پرنسپل نے تصویروں کو دیکھا۔ نرم پڑ گیا۔

بولا۔ داخلہ چاہتے ہو۔

عنایت نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پرنسپل نے کہا دو روپے ادا کرو۔

عنایت نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور سات آنے میز پر رکھ دیے۔

پرنسپل نے حیرت سے دیکھا۔

عنایت نے کہا جناب میرے پاس صرف یہی کچھ ہے۔

پرنسپل نے اپنی جیب سے دو روپے ادا کر دیئے۔

داخلے کے لیے امتحان ہوا۔ عنایت پاس ہو گیا۔ داخلہ مل گیا۔ لاہور میں رہنے کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ سارا دن سکول میں گزارتا رات ریلوے پلیٹ فارم پر۔ ایک پیسے کی ایک روٹی خرید کر کھا لیتا۔ حوائج کے لیے لیٹرین میں نہ جاتا چونکہ سٹیشن کا بھنگی پیسے مانگتا تھا۔ نہانے اور کپڑے دھونے کے لیے کنواں ڈھونڈتا۔

نو آنے ختم ہو گئے۔ فاقے آنے لگے۔ دو دن بھوک سے نڈھال پھرتا رہا۔ پھر اتفاقاً قصور کے لوہاروں کا ایک لڑکا مل گیا جو کبھی اس کا ساتھی تھا۔ بنجو کا شوقین تھا۔ وہ اپنے ساتھ اپنے کارخانے میں لے گیا۔ بنجو سنا۔ روٹی کھلائی۔ عنایت کی جان میں جان آئی۔ پھر چند ایک مہینے وہیں کارخانے میں پڑا رہا۔ بنجو سناتا۔ روٹی مل جاتی۔ وہیں پڑ کر سو رہتا۔ پہلے سال اچھے نمبروں پر پاس ہوا تو وظیفہ مل گیا۔ ساتھ ہی ایک ٹیوشن مل گئی۔

پھر لوہاری منڈی میں عنایت اور تین ہندو لڑکوں کو پانچ روپے ماہوار پر ایک کمرہ مل گیا۔ وہاں رہنے لگا۔ وہاں کوئی باتھ نہ تھا اور وہاں ڈرائنگ کرنے کی جگہ نہ تھی۔ بہت تنگ ہوا اتفاق سے قصور کا ایک کلرک اپنے گھر سید مٹھا میں لے گیا جہاں وہ اپنی رہائش کے لیے ایک روپیہ چار آنے کرایہ ادا کرتا رہا۔

وظیفہ تو کافی تھا لیکن دقت یہ تھی کہ باقاعدہ ملتا نہ تھا۔ روٹی کے لیے پیسے نہ ہوتے۔ اتفاق سے محلے کا تندور والا بنجو کا شوقین تھا۔ یوں بات بن گئی۔ اسے بنجو سنا کر کھانے کو روٹی ادھار مل جاتی۔

وظیفہ موصول ہوا تو امارت کے ڈھیر لگ گئے۔

نو روپے کا سائیکل خرید لیا۔ ایک چارپائی خریدی۔ سوٹ کیس خریدا۔ مونچھ پر تاؤ دیا اور گاڑی میں بیٹھ کر پہلی دفعہ قصور جا پہنچا۔ والدین اسے دیکھ کر خوشی سے بے حال ہو

گئے۔

انہی دنوں پہلی مرتبہ اشفاق احمد سے ملاقات ہوئی۔

اشفاق احمد بولا میاں عنایت اللہ اور تو سب ٹھیک ہے پر تیرا نام غلط ہے۔

یہ آرٹسٹ کا نام نہیں۔

اچھا۔ عنایت گھبرا کر بولا تو پھر کیا کروں۔

اشفاق احمد نے کہا نام بدل لو۔

عنایت نے حیرت سے کہا کبھی نام بھی بدلے ہیں۔

ان دنوں اشفاق احمد کورا اشفاق احمد تھا۔ نہ ادیب تھا نہ ڈرامہ نویس نہ براڈ کاسٹر۔ اور ٹی وی کا تو ابھی وجود ہی نہ تھا۔

اشفاق احمد اردو لغت کھول کر بیٹھ گیا۔

یہ کیا کر رہا ہے تو۔ عنایت نے پوچھا۔

تیرا نام ڈھونڈ رہا ہوں۔

نام کیا کتابوں میں ملتے ہیں۔

مل گیا مل گیا۔۔ اشفاق احمد چلایا۔

کیا مل گیا عنایت نے پوچھا۔

تیرا نام مل گیا۔

کیا ملا۔

آج سے تو آذر ہے۔

آذر وہ کیا ہوتا ہے۔

وہ ایک بت گر تھا۔

یعنی بت بنانے والا۔

بالکل۔

اس روز سے عنایت اللہ۔ عنایت آذر بن گیا۔



پھر جب اس نے کمرشل کام شروع کیا تو پھر سے مشکل پڑ گئی۔ آذر نے کہا۔ یار۔

اشفاق آذر اپنی چیزیں بیچے گا نہیں۔

کیوں؟ اشفاق نے پوچھا۔

آذر تو اپنے لیے نقش بناتا ہے، بیچنے کے لیے نہیں۔

اشفاق بولا ٹھیک ہے آذر اپنے لیے تصویریں بنائے ذوبی بیچنے کے لیے بنائے۔ یوں عنایت اللہ، آذر ذوبی بن گیا۔

آذر ذوبی ایک خود ساختہ فرد ہے۔ اس نے زندگی میں اپنا راستہ خود بنایا ہے کسی کا سہارا نہیں لیا۔ وہ سہارا لینے کا قائل نہیں، شاید اسی وجہ سے وہ سہارا دینے کا بھی قائل نہیں۔

جب اسے اٹلی سے بلاوا آیا تھا تو اس نے بڑی بے دردی سے اپنے کنبے کو فاقوں کے حوالے کر دیا تھا۔

اس کی بے حسی نے اشفاق اور مجھ پر بڑا گہرا اثر کیا تھا۔ اتنا بے حس اس قدر خود پرست۔ ہمارے دل ذوبی سے متعلق غبار آلود ہو گئے تھے۔

ہم یہ بھول گئے تھے کہ وہ ایک فن کار ہے۔ ایک ٹیڑھی لکیر، جسے سیدھا کیا جائے تو وہ ٹوٹ جاتی ہے۔ اس کے اٹلی جانے کے بعد اس کا گھر تنکا تنکا ہو گیا، بکھر گیا۔

پھر ۱۹۵۸ء میں میرا تبادلہ کراچی ہو گیا۔

کراچی میں ایک دن ہمارے دفتر کے سامنے ایک نئی نکور کار آ رکی۔ اندر سے ذوبی نکلا۔ وہی پرانا ذوبی۔ ۱۹۴۸ء کا ذوبی۔ کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔

اسے دیکھ کر میں چلایا۔ ارے تو۔

ہاں میں۔ وہ بولا۔

یہاں کہاں۔

یہیں کراچی میں۔

اور یہ گاڑی۔

ہاں وہ بولا یہ گاڑی۔

کہاں سے آئی۔

اللہ نے دی۔

تو اللہ کو مانتا ہے۔

ہاں۔۔۔ مجبوراً۔

کیوں؟

وہ دیتا جو ہے۔

یہاں رہتا کہاں ہے۔

بنگلہ ہے، پریس ہے، سٹوڈیو ہے، مصور رسالہ ہے، شعور۔

ارے اتنا کچھ۔

ہاں اس سے بھی زیادہ۔ سب اس نے دیا ہے۔

پر تو ویسا کا ویسا ہی ہے۔

ہاں میں ویسا کا ویسا ہی ہوں۔

میں نہیں مانتا۔ تو جھوٹ بولتا ہے۔

چل میں تجھے دکھاؤں۔

دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔

کراچی صدر کے مرکز میں اس کا پریس تھا۔ بہت وسیع، مشینیں، نوکر چاکر، اور رہائشی مکان، اپنے مصور پرچے شعور کے کئی ایک شمارے اس نے میرے سامنے ڈھیر کر دیے۔ پرچے میں انفرادیت کے انبار لگے ہوئے تھے۔

کہاں آرٹسٹ، کہاں پریس اور ادبی پرچہ میں نے کہا ان کا کیا میل ہے۔

وہ بولا۔

کیا؟

وہ بھی لکیریں یہ بھی لکیریں۔

سب کچھ بدل گیا۔ میں نے کہا۔



ہاں وہ بولا سب کچھ بدل گیا لیکن لکیریں نہیں بدلیں گی۔

اب بھی تصویریں بناتا ہے کیا؟

ہاں وہ بولا، اور مجھے ایک کمرے میں لے گیا جہاں اس کی بنی ہوئی تصویریں ٹنگی ہوئی تھیں۔ اس کے سکیچز دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔

چنچلی، نفاست، انفرادیت۔

ابے او قصور کے ان پڑھ پہلوان۔ یہ باتیں تجھے کیسے سوجھتی ہیں میں نے پوچھا۔

کونسی باتیں؟

یہ گھوڑا مرد اور نازک حسینہ۔ یہ بال جال میں اسیر دنیا۔ یہ میاں کی گھجی پوشیدہ ماں!

پتہ نہیں وہ بولا۔

اتنی بڑی سچائیاں۔

اچھا۔ یہ سچائیاں ہیں کیا؟

تجھے پتہ نہیں۔

نہیں۔ وہ بولا۔

پھر بناتا کیسے ہے۔

جو دکھتا ہے بنا دیتا ہوں۔

دکھتا کیسے ہے۔

پتہ نہیں کیسے۔ بس دکھتا ہے۔

ایک روز جب میں دفتر جانے کے لیے اپنے گھر سے نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ سیڑھیوں میں آلتی پالتی مارے بیٹھا ہے۔

میں چونکا تو یہاں۔

بولا ہاں۔ تجھ سے ایک کام ہے۔

کیا۔

میرے ساتھ چل۔

ہم دونوں کار میں بیٹھ گئے۔

میں نے کہا چلتا تو ہوں پر کام کیا ہے۔ بتا۔

بولا بتانے کا نہیں۔

وہ مجھے ہوا بندر سے پرے بیچ پر لے گیا۔ گاڑی سے نکل کر ہم پیدل چلتے رہے۔ آخر وہ سمندر کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ بولا بیٹھ جا۔

میں بھی بیٹھ گیا۔

بولا یہ دو چھوٹے جزیرے نظر آتے ہیں۔ تجھے؟

میں نے کہا۔ کون سے؟

بولا ایک وہ دور کالا کالا اُبھرا اور ایک یہ سامنے والا۔ دیکھے۔

ہاں دیکھے۔

جب سمندری جہاز آتا ہے تو ان دونوں اُبھری چٹانوں کے درمیان سے گزرتا ہے کراچی کی بندرگاہ میں جانے کے لیے۔

پھر۔

میرا جی چاہتا ہے قائداعظم کا مجسمہ بناؤں، ایک ٹانگ اس چٹان پر ہو دوسری اس چٹان پر۔ جہاز قائد کی ٹانگوں تلے سے گزریں۔

اتنا بڑا بت۔

ہاں اتنا بڑا بت۔

کیسے بنائے گا۔

مجھے بنا ہوا نظر آتا ہے۔ وہاں قائد کا سر ہو گا اس پر کالی ٹوپی ہو گی۔ نیچے کالی اچکن ہو گی، اور اس کے نیچے سفید شلوار اور جہاز نیچے سے گزریں گے۔ تجھے نظر آتا ہے۔

اُونہوں۔

مجھے آتا ہے۔

میں آدھی آدھی رات کو گاڑی میں بیٹھ کر اسے دیکھنے آ جاتا ہوں۔ یہاں بیٹھا رہتا



ہوں۔۔۔ کئی کئی دن نیند نہیں آتی۔ پریس سے اٹھ کر یہاں آ بیٹھتا ہوں۔

یہ میرا آخری کام ہے پتہ نہیں کتنے سال لگیں۔ لیکن وہ مجھے نظر آتا ہے۔ وہ کھڑا ہے۔ سیدھا۔ باوقار۔ عظیم۔

دیر تک ہم دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔

ذوبی قائد کو دیکھتا رہا میں آذر کو دیکھتا رہا۔

احمق نہ دیکھ خواب، میں نے کہا۔

وہ چونکا۔ اور کیا دیکھوں۔

کچھ اور دیکھ۔

اور کچھ دیکھنے کو ہے کیا؟

بہت کچھ۔

میرے پاس تو نہیں۔ اور کچھ نہیں۔

یہاں تجھے کون بُت بنانے دے گا۔

بُت۔ بُت تو بنا ہوا ہے۔ پہلے سے ہی بنا ہوا ہے۔

پھر تو کیا بنائے گا۔

میں ذہنوں سے نکال کر پتھر کی شکل دے دوں گا۔ بھئی وہ ہمارا قائد ہے۔ باپ ہے۔

اس نے ہمیں ایک پناہ گاہ دی ہے۔ جھوٹ ہے کیا۔

سچ ہے۔

بت تو اسے بنا دیا۔

کس نے۔

اللہ نے ہم نے۔ ہم اسے کبھی بھول سکتے ہیں کیا؟

نہیں۔ بھئی نہیں۔

میں تو اس بُت کو صرف جسم دوں گا نا۔

میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

میں خاموش ہوگیا۔

وہ بھی خاموش ہوگیا۔

دور سورج ڈوب رہا تھا۔

اس کی کرنوں نے تیرتے بادلوں کو آگ لگادی۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ بادل کا ایک ٹکڑا ان دونوں پتھروں پر آ معلق ہوا۔

وہ دیکھ، وہ دیکھ، ذوبی بولا۔

کیا۔

وہ قائد آ کھڑا ہوا ہے۔ عین اسی مقام پر بالکل ایسے جیسے مجھے نظر آتا ہے۔ دیکھ، دیکھ۔ کتنا عزم ہے، کتنا وقار ہے، کتنی خودداری ہے۔

-☆-

مظہر الاسلام

۱۹۸۹ء

# مہا اوکھا

میل ملاپ کے حوالے سے ادیب دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک مجلسی، دوسرے تنہا۔ مجلسی بہتے، تنہا کم کم۔

مجلسی پر لازم ہوتا ہے کہ روز بلاناغہ محفل لگائے۔ کتر کتر باتوں کے ڈھیر لگائے۔ محفل لگانے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ دوسروں کی سنے۔ مشکل یہ ہے کہ دوسرے نہ ہوں تو اپنی بات کیسے چلے۔

مظہر الاسلام مجلسی نہیں۔ میری طرح تنہا ہے۔

تنہا بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو محفل سے گھبراتے ہیں، کتراتے ہیں، اکیلے میں خود کو سالم محسوس کرتے ہیں۔ محفل میں ادھورے۔

دوسرے وہ جو نہ گھبراتے ہیں نہ کتراتے ہیں نہ ادھورے محسوس کرتے ہیں بلکہ اپنی مرضی سے التزاماً الگ رہنا پسند کرتے ہیں۔

میں گھبرانے کترانے والوں میں سے ہوں۔

مظہر الگ رہنا پسند کرنے والوں میں سے ہے۔ وہ میل جول کو برا نہیں جانتا۔ شاید مل ملا کر خوش بھی ہوتا ہو۔ لیکن میل جول کے لیے وہ چل کر نہیں جائے گا۔ دوسرا آجائے تو نو اوبجیکشن۔

وہ محفل لگائے گا نہیں۔ لگ جائے تو ٹھیک ہے۔ پڑی لگ جائے۔

لگ جائے تو وہ محفل کا حصہ نہیں بنے گا۔ ڈوبے گا نہیں۔ تیرتا رہے گا۔ وہ بھیڑ کے اندر بھی تنہا رہتا ہے۔ قہقہہ نہیں لگائے گا۔ مسکرانے پر اکتفا کرے گا۔ دوسروں سے الگ

رہنا مظہر کے کردار کا جزو اعظم ہے۔ اگر ادیب عینک پہنتے ہیں تو مظہر اپنی عینک اتار کر رکھ دے گا۔ چاہے آنکھوں کی ایسی کی تیسی ہو جائے، پڑی ہو جائے۔ نیور مائنڈ۔

اگر ادیبوں کے بال سیاہ کالے ہیں تو وہ ان جانے میں ایسا جتن کرے گا کہ بال رنگ سے محروم ہو جائیں۔ بے شک بوڑھا نظر آئے۔

جوان دکھائی دینے کی نسبت ہٹ کے دکھائی دینا اس کے نزدیک زیادہ اہم ہے۔ اسی وجہ سے وہ مہا اوکھا ہے۔

یقین جانئے یہ اصطلاح میری نہیں۔ نہ ہی یہ میرا مفروضہ ہے۔ یہ تو انسانی شخصیت کے نفسیاتی ماہروں کی تحقیق کا ماحصل ہے۔ مغربی مشاہیر تخلیق کار کی شخصیت کو انیل پرسنیلٹی کہتے ہیں۔ موسیقی کی اصطلاح میں وکر چال۔ چار پردے اوپر چڑھے دو پردے پھسلے۔ پھر چھ پردے چڑھے اور چار پھسلے۔ یہ مسلسل چڑھن پھسلن تخلیق کار کا مقدر ہے۔ سچ کہتے ہیں بانسری میں چھید نہ ہوں تو وہ بجتی نہیں۔ نغمہ پیدا نہیں ہوتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ ہر تخلیق کار میں اوکھا پن ایک جیسا نہیں ہوتا۔ نہ ہی اس کا اظہار ایک جیسا ہوتا ہے۔ کسی میں بولتا ہے۔ کسی میں چپ۔ کسی میں خفی کسی میں جلی کسی میں پور پور گرہیں۔ کسی میں کانٹے ہی کانٹے۔

اس انوکھے پن کی نمائش بھی طرح طرح کی جاتی ہے۔ کوئی اپنے اوکھے پن کو ڈیوڑھی میں ڈھیر کر دیتا ہے۔ کوئی بیڈروم کے دراز میں رکھتا ہے۔ مظہر نے اسے شو ونڈو میں سجا رکھا ہے۔

تحریر میں بھی مظہر پر ہٹ کے لکھنا عائد ہے۔

کتابوں کے نام بھی مروجہ ناموں سے ہٹ کر رکھتا ہے۔ گمان غالب ہے کہ گھوڑوں کے شہر میں اکیلا آدمی وہ خود ہے۔

مظہر نے کتابوں کے ناموں سے متعلق ایک نئی طرح ڈال دی ہے ایک نئی سر تال جو مروجہ ٹھیکوں سے ہٹ کر ہے۔ باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی کا نام سن کر میں نے کہہ دیا یہ مظہر کی کتاب ہوگی۔

پھر دفعتاً مجھے خیال آیا کہ یہ بات مظہر کو کیسے سوجھی یہ تو ایک لپٹی لپٹائی۔ ڈھکی چھپی



حقیقت ہے کہ لڑکی طوفان میں نہیں بھیگتی۔ بارش میں نہیں بھیگتی۔ صرف باتوں کی بارش میں بھیگتی ہے۔ اور ایسے بھیگتی ہے کہ گل جاتی ہے۔

لیکن یہ حقیقت تو ایسی ہے کہ بیتے بنا سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ شاید اس نے کئی ایک کو بھگویا ہو۔

مظہر خواتین سے میل جول پسند کرتا ہے۔ انہیں بلاتا نہیں۔ بن بلائے جاتا نہیں۔ چلا جائے تو کیا مجال کہ شوق کا اظہار ہو۔ چاہے اندر چوہے دوڑ رہے ہوں۔ دست طلب نہیں بڑھاتا۔ خود اظہار آرزو یا شوق نہیں کرے گا۔ خاتون کو اظہار آرزو پر مائل کرے گا۔ مجبور کر دے گا۔ بشرطیکہ پسندیدہ ہو۔

لیکن یہ وصف تو نسائی ہے، ہمیشہ عورت مرد کو اظہار آرزو پر اکساتی ہے۔ کاسہ گدائی بڑھانے پر مجبور کر دیتی ہے۔

کسی مرد نے ایک سیانے سے پوچھا محترم ایسا کیوں ہوتا ہے کہ کاسہ آرزو بڑھانے میں مرد ہمیشہ پہل کرتا ہے اور ہار جاتا ہے۔ جیت ہمیشہ عورت کی ہوتی ہے۔

سیانے نے کہا۔ اس لیے کہ مرد کی نسبت عورت میں صبر کرنے کی قوت زیادہ ہے۔ صرف آدھ منٹ زیادہ۔ وہ آدھ منٹ زیادہ انتظار کر سکتی ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے مظہر میں انتظار کرنے کی قوت ایک منٹ زیادہ ہے۔

ہٹ کے رہنا۔ بن بلائے نہ جانا۔ کاسہ آرزو بڑھانے میں انتظار کرنا۔ ان اوصاف سے ظاہر ہے کہ مظہر محجوب طبیعت کا مالک ہے۔ اس سے یہ اندازہ نہ لگا لیجیے گا کہ مظہر عاشقانہ جذبے سے محروم ہے۔ نہیں اس کے برعکس اس میں ایک ایسا عاشق بھی موجود ہے کہ اگر قیس دیکھ لے تو شرما جائے۔ اس کی زندگی میں دو ایک بار ایسا بھی ہوا ہے کہ خاتون کو دیکھتے ہی بھانبڑ لگ گیا۔ وہ کپڑے پھاڑ کر باہر نکل آیا اور بہ نفس نفیس کاسہ گدائی بن گیا۔ منہ سے بولے یا نہ بولے جسم کا بند بند بولنے لگا۔

مظہر کی شادی کا واقعہ بھی الف لیلوی داستان سے کم نہیں ہے۔ خاتون تعلیم یافتہ تھی۔ ایک ادارے میں افسر تھی۔ بارعب تھی۔ پروقار تھی۔ ادب شناس تھی۔ اس سے بات کرنے

کے لیے ہمت اور جرأت درکار تھی۔ کیونکہ اس کی پیشانی پر جلی حروف میں لکھا تھا۔ پرے ہٹ کے بات کرو۔ مظہر نے کہا دیکھو پیاری اگر مجھ سے شادی کی طالب ہو تو ملازمت چھوڑ دو۔ تین سال گھر بیٹھو برتن مانجو۔ روٹیاں پکاؤ، جھاڑو لگاؤ، پھر بات کریں گے۔ کیا پتہ شاید۔۔۔

محترمہ نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ ادارے کے لوگ حیران تھے اتنا بڑا عہدہ چھوڑ دیا۔ سب نے باری باری سمجھایا۔ لیکن کیسے سمجھتی۔ سمجھ کے خانے کا تو فیوز اڑ چکا تھا۔ تین سال باورچی خانے میں آلو چھیلتی رہی۔ یہ محض خوش قسمتی تھی کہ فیصلہ اثبات میں ہو گیا۔ شادی ہو گئی۔ اس دیوتا میں ایک وصف یہ بھی ہے جو اس کے لیے تن من دھن داؤ پر لگا دے تو دیوتا اپنا استھان چھوڑ کر اس کے ہاتھ کی گجری بن جاتا ہے۔ دیوتا کو جیتنے کے لیے تن من دھن کو داؤ پر لگانا ضروری ہوتا ہے۔

میرے ماتھے میں اس فرد کے لیے ایک سجدہ ہے جو کامیابی اور ناکامی سے بے نیاز ہو کر تن من دھن کی بازی لگا دیتا ہے۔ شادی کے دس سال کے بعد میں نے محترمہ سے پوچھا بی بی یہ بتا کہ یہ سودا کیسا رہا۔ ظاہر ہے کہ محترمہ نے یہ راز پا لیا کہ جو کچھ بھی پانا ہے اندر سے پانا ہے۔ خوشی باہر سے نہیں آتی اندر سے پھوٹتی ہے۔ جس نے یہ بھید پا لیا وہ سدا سکھی ہو گیا۔

مظہر کی شخصیت میں تضادات کی کچھ زیادہ ہی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ کچھ زیادہ ہی نیگیٹو پازیٹو ہیں۔ کچھ زیادہ ہی اندھیرے ہیں۔ مظہر کو بیٹھے دیکھیے۔ لگتا ہے جیسے ایک معزز اور متوازن فرد ہے۔ بے شک ایک معزز اور متوازن فرد موجود ہے لیکن اس معزز اور متوازن فرد کی چٹی قمیض اور سفید کالر کے نیچے ایک جذباتی بچہ چھپا بیٹھا ہے۔ جس میں سے سیون اپ کی بوتل کی طرح بلبلے اٹھتے رہتے ہیں۔ یہ بچہ شہزادہ بچہ ہے اس شہزادے نے دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ایک پسندیدہ دوسرا ناپسندیدہ۔ جو پسند ہے وہ اچھا، واہ واہ، جو ناپسند ہے وہ لاحول ولا۔ آپ مظہر سے پوچھیے تو وہ کہے گا۔ مفتی کی بات غلط ہے حقیقت یہ ہے کہ جو اچھا ہے وہ پسند ہے۔ یہ صرف مظہر کی بات نہیں، ہم سب ایسے ہی سوچتے ہیں۔ جو پسند ہو اسے اچھا جانتے ہیں، ہم سمجھتے ہیں چونکہ اچھا ہے اس لیے پسند ہے۔ اپنی پسند ناپسند کو جائز قرار دینے کے لیے ہم دلیلیں گھڑتے رہتے ہیں۔ ہم سب گھوڑے کے آگے گاڑی جوتنے کے عادی ہیں۔ لیکن سچے دل سے سمجھتے ہیں کہ ہم نے گاڑی کے آگے گھوڑا جوت رکھا ہے۔ پتہ نہیں کس انسان دشمن نے یہ بات چلا رکھی ہے کہ معقول آدمی وہ ہے جو عقل پر چلتا ہے۔ ہم نامعقول سمجھے جانے سے خوف زدہ ہیں۔ اس لیے ہم نے خود فریبی کا ایک جال بچھا رکھا ہے جسے اہل دانش Wanting to believe کہتے ہیں۔

مظہر کو جذبات کی شدت کا یہ تحفہ وزیرآباد سے ملا ہے۔ مظہر وزیرآباد کا رہنے والا ہے۔

بنایا تو وزیر نے تھا لیکن وزیرآباد میں عوام بستے ہیں اور صرف بستے ہی نہیں راج کرتے ہیں۔ انہیں اپنی خوبیوں، کمیوں، کجیوں پر ناز ہے۔ وزیرآباد کا ہر فرد بلبلوں سے بھری ہوئی بوتل ہے شدت ہی شدت۔ اس بات کا متمنی ہے کہ کوئی اس کا کاگ اڑائے اور وہ شوں کر کے باہر نکلے۔ اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے کی مصداق۔

وزیرآبادیے خود پر تفاخر کے کئی ایک غلاف چڑھائے بیٹھے ہیں۔ خاندانی تفاخر، وزیرآبادی تفاخر، ذاتی تفاخر، مزاج طرہ دار ہیں لیکن محبتی پچ پچ کرنے والی دلدلی محبت، اور کامی، پسینے میں لت پت کامی کھانے کھلانے کے شوقین۔ مہمان بچ کر نہ جائے۔ خوش رہنے کے لیے وہ دولت کے محتاج نہیں۔ طبعاً غم خور ہیں۔ چھپ چھپ کر روتے ہیں کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ بھرم نہ کھل جائے۔

وزیرآبادیہ بیوی کو پاؤں کی جوتی سمجھتا ہے۔ کہتا ہے پہلے مجھے مان پھر میں جانوں گا تجھے۔ اگر وہ سچے دل سے مان لے تو میاں اپنی باگ اس کے ہاتھ میں پکڑا دیتا ہے کہ لے جدھر چاہے ہانک کر لے جا۔ لیکن اس کے باوجود اپنی پھنکار قائم رکھتا ہے۔

وزیرآبادیہ تھکا ہارا بابو ٹرین سے اترا۔ پنواڑی بولا او میدے پتہ ہے آج بالے قصائی نے تیرے یار طاہر کو مارا۔ اس پر میدے کے لیے گھر جانا حرام ہو گیا۔ اگرچہ ڈب میں چاقو موجود ہے۔ پھر بھی دکان سے دو بوتلیں اٹھائیں اور بالے قصائی کا دروازہ جا کھڑکایا۔

باہر نکل اوئے۔ بالے سے نپٹ کر اپنے دوست طاہر کے گھر گیا۔ پوچھا بالے نے تجھے مارا تھا کیا۔ فکر نہ کر میں نے حساب چکا دیا ہے۔

وزیر آبادیہ کا غصہ ناک پر دھرا ہوتا ہے۔

وہ لائن میں نہیں لگتا۔ لین میں لگنا اس کی شان کے منافی ہے۔

مظہر نے وزیر آبادی جملہ خصوصیات اپنے پلّے میں باندھ رکھی ہیں۔ اس کے باوجود تخلیقی اوکھے پن کی وجہ سے وہ وزیر آبادیوں سے بھی وکھرا ہے۔

اس بھوں بھوں کرتے ہوئے بھنورے کی دم میں بھڑ کا ڈنک بھی ہے اور جگنو کی روشنی بھی۔

آپ مظہر کو پسند کریں یا نہ کریں۔ اسے اچھا جانیں یا نہ جانیں۔ یہ آپ کی مرضی پر موقوف ہے۔ لیکن آپ کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ ایک تخلیق کار ہے۔ مستند تخلیق کار، منفرد تخلیق کار، چاہے مظہر نے وہ کہانی لکھ دی ہے جو بالآخر اسے لکھنی ہے یا ابھی نہیں لکھی۔ چاہے ابھی تک وہ بھور سمے میں ہے۔ لیکن وہ کرن جو چمکنے والی ہے ابھی سے لشکارے مار رہی ہے۔

دراصل مجھے یہ جائزہ یہیں ختم کر دینا چاہیے۔ یہی میری حد ہے۔ اس کے بعد رسمی ناقد کا ویہڑا شروع ہو جاتا ہے لیکن حدیں پار کر کے مار کھانے کی میری پرانی عادت ہے۔

مظہر کی تحریروں میں سب سے بڑا جذبہ یہ ہے کہ وہ ہٹ کر بات کرے۔ اک نیا زاویہ، نیا رُخ، نیا انداز، نئی سوچ وہ ہر بات میں اپنی انفرادیت کا رنگ جمانے کا خواہاں ہے۔ اس نے اپنے پہلے مجموعے میں پیش لفظ کو ایک نیا رنگ عطا کیا۔ ایک انوکھا رنگ دوسرے مجموعے میں فہرس کی عمومیت کو بھی گوارا نہ کیا۔ پہلے مجموعے میں مظہر نے فلیپ پر رسمی تنقید کو سجایا لیکن دوسرے مجموعے میں وہ اس سے بے نیاز ہو گیا۔

مظہر کی منفرد ہونے کی خواہش شاید نفس لاشعور سے پھوٹی ہو۔ جو اب ایک شعوری خواہش میں بدل چکی ہے۔ اور اس کے بعد بند بند میں بس چکی ہے۔ عمومیت کے خوف سے خود کو محفوظ کرنے کے لیے اُس نے عمومیت سے نفرت پال رکھی ہے۔ میری دانست میں



فنکار دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو اپنی آنکھ سے گرد و پیش کو دیکھتے ہیں اور اس دیکھ میں گرد و پیش کی نسبت دیکھنے والی آنکھ کا رنگ حاوی رہتا ہے۔ دوسرے وہ ہوتے ہیں جن کی کوشش ہوتی ہے کہ دیکھنے والی آنکھ گرد و پیش کے منظر میں حائل نہ ہو۔

برٹرینڈ رسل نے کہا تھا۔ میری آرزو ہے کہ میری آنکھ خدا کی آنکھ بن جائے اور میں اُس آنکھ سے اس دنیا کو دیکھ سکوں جس میں نہ لاگ ہو نہ لگاؤ۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ بے لاگ لگاؤ والی آنکھ ہی بڑا ادب پیدا کر سکتی ہے۔ ذات کی آنکھ والوں نے بھی عظیم ادب پارے تخلیق کیے ہیں۔

شراب کشید کرنے والی ایک کمپنی نے جس کا نام بیک Beck تھا ایک اشتہار نکالا تھا کہ ہر سڑک پر ہر راستہ ہر پگ ڈنڈی بیکس بیئر Becks Beer کی طرف جاتی ہے۔ ایسے ہی مظہر کی ہر تحریر ہر کہانی مظہر کی شخصیت کی جانب لے جاتی ہے۔ یوں مظہر کی تحریریں ذات کی ست رنگی سے مالا مال ہیں۔ اگر آپ شخصیت کے رنگ دیکھنا چاہتے ہیں تو آپ پر لازم ہے کہ اخلاقی نقطہ نظر سے بے نیاز ہو جائیں ورنہ آپ شخصیت کے حسین مناظر اور دلچسپ تضادات کے مشاہدے سے محروم رہ جائیں گے۔

مظہر الاسلام نے کہانی کیسے بنی کے عنوان کے تحت اپنی شخصیت کے کونوں کھدروں کو یوں بے باکی، لیکن نہایت رنگین اور حسین انداز سے بے نقاب کیا ہے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔

مظہر اپنی شخصیت میں رچی بسی تلخیوں، نفرتوں، کج رویوں کا برملا اظہار کرتا ہے۔ وہ اپنی انا پسندی کو کھلے دل سے اپناتا ہے۔ اخلاقی قیل و قال کو خاطر میں نہیں لاتا۔ وہ خود کو پیش نہیں کرتا۔

مظہر کا اپنی شخصیت کے بارے میں خود نوشت، بیان بے حد منفرد ہے رنگین ہے جاذب ہے۔

کہتا ہے غصہ، خفگی اور تنہائی تو مجھے ورثے میں ملے ہیں۔ میں اپنی انا کے چاک پر چڑھا ہوا ہوں۔ اپنی انا کے صندوق میں بند ہوں۔

عورت کے متعلق مظہر کا اعتراف ہے کہ بڑی عمر کی خواتین جاذب نظر ہیں۔ بیٹی کی نسبت ماں زیادہ اچھی لگتی ہے۔ لکھتا ہے عورت کی گود میں سوئی ہوئی موت باعث تسکین ہے۔ موت سے مراد۔ انا کی موت ہے، حوالگی کا سکون۔ لیکن بسا اوقات عورت اسے خواہش کے تنور میں روٹی کی طرح لگا کر بھول جاتی ہے۔

مظہر کی شخصیت کو اگر آپ نیک بد یا پسند ناپسند کے حوالے سے بے نیاز ہو کر دیکھیں تو وہ زندگی سے بھرپور ہے۔ وہ اظہار میں بے باک ہے۔ نڈر ہے۔ مجھے ایسے لگتا ہے جیسے گھوڑوں کے شہر میں اکیلا آدمی اور باتوں کی بارش میں بھیگی لڑکی کے درمیانی وقفہ میں کوئی جوار بھاٹا اٹھا ہے۔ کوئی بل ڈوزر گزرا ہے۔ حنا مالیدہ ہاتھوں نے غضب کی مدھانی چلائی ہے کوئی تندور والی اسے انگاروں سے تپتے ہوئے تندور میں روٹی لگا کر بھول گئی ہے۔ پتہ نہیں جانے میں یا انجانے میں ظاہر ہے کہ مظہر ایک عظیم بپتی سے گزرا ہے۔ یا شاید اب تک گزرنے کے عالم میں ہے۔ بہرصورت ایک بات واضح ہے کہ اس انا کے پنجرے میں بند پنچھی کو دو متوازن پاؤں دو چھیڑ دینے والی آنکھیں اور مخروطی اور حنائی انگلیاں ہی قید سے نجات دلا سکتی ہیں۔

مظہر ایک بڑا فنکار ہے۔ چاہے وہ انا کے پنجرے میں قید ہو یا لاگ لگاؤ کی فضاؤں میں آوارہ پنچھی کی طرح اڑان میں مصروف۔ ہر صورت میں اس کی تخلیقات میں جان ہے جاذبیت ہے۔ خدا کرے اس کی زندگی میں ایک عظیم تر جوار بھاٹا اُٹھے۔ غضب کی مدھانی چلے۔ کوئی بل ڈوزر چلے تا کہ انا کا پنجرہ ٹوٹ جائے اور مظہر کی خوابیدہ صلاحیتیں جاگیں۔

اور یہ شمع ہر رنگ میں جلے

☆

اشفاق احمد

۱۹۶۶ء

## داستان گو

گزشتہ دو ایک سال سے اشفاق احمد نے بڑی دھوم مچا رکھی ہے۔ وہ جگہ جگہ مجمع لگائے کھڑا ہے۔ ریڈیو پر، ٹی وی پر، محفلوں میں، سماجی گیٹ ٹوگیدر میں عوام اس کے پروگرام کا انتظار کرتے ہیں۔ دانشور اس کے ڈراموں پر بحث کرتے ہیں۔

بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ یہ رنگین اور منفرد باتوں کے جال بن کر مجمع لگانے والا درحقیقت گونگا ہے۔ اس کی شخصیت دکھ اور چپ کے تانے بانے سے بنی ہے۔ اس کی بزم آرائی اور زعفران زاری شخصیت کے ان بنیادی عناصر سے فرار کی سعی ہے۔

اگر آپ اس کی شخصیت کے بنیادی عناصر سے واقف ہونا چاہتے ہیں تو اسے اس وقت دیکھیے جب وہ اکیلے میں بیٹھا ہو جب اسے یہ احساس نہ ہو کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے یا اسے دیکھے جانے کا امکان موجود ہے۔ اگر اسے ذرا بھی شک پڑ گیا تو اس کے اندر کی بنی بجی طوائف خاتون ہوشیار ہو جائے گی۔

اکیلے میں اشفاق احمد کے چہرے کے خطوط نیچے کی طرف ڈھلک جاتے ہیں۔ پیشانی کی سلوٹیں رینگ رینگ کر باہر نکل آتی ہیں۔ آنکھیں اندھے کنوئیں بن کر ڈوب جاتی ہیں۔ چہرے پر اکتاہٹ ڈھیر ہو جاتی ہے۔

اشفاق احمد کھاتے پیتے پٹھان گھرانے میں پیدا ہوا۔ بہت سے بھائیوں میں ایک کے سوا سب سے چھوٹا۔ باپ ایک قابل محنتی اور جابر پٹھان تھا جس کی مرضی کے خلاف گھر میں پتا بھی نہیں ہل سکتا تھا۔ گھر کا ماحول روایتی تھا۔ بندشیں ہی بندشیں۔ اس کے باوجود

اشفاق کی شخصیت میں بنیادی طور پر پٹھانیت کا عنصر مفقود ہے۔

اشفاق احمد کی شخصیت میں دُکھ اور چپ کا عنصر میرے لیے ایک معمہ ہے چونکہ میں نے زندگی میں آج تک اشفاق احمد سا کامیاب آدمی کہیں نہیں دیکھا۔

اس نے جوانی میں روایت توڑ محبت کی۔ اسے اچھی طرح علم تھا گھر والے کسی غیر پٹھان لڑکی کو بہو بنانے کے لیے تیار نہ ہوں گے۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ گھر میں اپنی محبت کا اعلان کرنے کی اس میں کبھی جرأت پیدا نہ ہوگی۔ اس کے باوجود ایسے حالات پیدا ہوئے کہ وہ محبت میں کامیاب ہوگیا۔

شادی کے بعد مجبوراً اسے گھر چھوڑنا پڑا۔ اس وقت وہ بے سہارا تھا بے وسیلہ، گھر کا چولہا جلانے کے لیے مجبوراً اسے سکرپٹ رائٹر بننا پڑا۔ اس زمانے میں سکرپٹ رائٹنگ کی اس قدر مانگ نہ تھی کہ گزارہ ہو سکے۔ اشفاق احمد کو اس کاروبار میں صرف کامیابی حاصل نہیں ہوئی بلکہ شہرت بھی ملی۔ بے شک اشفاق نے جدوجہد کی، محنت کی۔ لیکن محنت کامیابی کی ضامن نہیں ہوتی۔

تقسیم کے بعد جب میں اسے پہلی مرتبہ ملا تو وہ بنیادی طور پر وہی کچھ تھا جو آج ہے۔ دکھ اور چپ کے تاروپود سے بنا ہوا ٹاٹ جس پر یہاں وہاں سنہرے تاگے سے کاڑھی ہوئی پھل پتیاں تھیں۔ آج بھی وہی ٹاٹ ہے۔ البتہ ٹاٹ پن کچھ اور بڑھ گیا ہے۔ سنہری پھل پتیوں کی چمک زیادہ نمایاں ہوگئی ہے۔ ٹاٹ اور سنہرے پن کا تضاد زیادہ واضح ہوگیا ہے۔

ان دنوں میں بمبئی سے آیا ہوا مہاجر تھا۔ اپنے عزیزوں کو مشرقی پنجاب سے بچا کر لا چکا تھا۔ کوئی ذریعہ معاش نہ تھا۔ مہاجر کیمپ میں مقرر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔

ایک روز کیمپ کے ایک ویران کونے میں جب میں حالات کی وجہ سے پریشان کھڑا تھا تو ایک چٹی سفید شگفتگی اور تازگی سے بھرپور مٹیار میرے روبرو آ کھڑی ہوئی۔ آنکھیں چمکا کر بولی آپ ممتاز مفتی ہیں۔

جی۔ میں نے جواب دیا۔

ہم نے آپ کی آپا پڑھی ہے۔



بہت اچھا کیا آپ نے۔

بولی میں ساتھ والے کیمپ میں ملازم ہوں کبھی اُدھر آیئے گا۔

جی اچھا۔ میں نے جواب دیا۔

بولی میرا نام اشفاق احمد ہے۔

پہلی مرتبہ اسے دیکھ کر ایسے لگا جیسے گلابی مخمل پر سنہرے پھول کاڑھے ہوں۔

پھر اشفاق اور میں روز ملنے لگے۔

جوں جوں میں اس کے قریب آتا گیا مخمل ٹاٹ میں بدلتی گئی۔ سنہرے پھل، بوٹے اُبھرتے گئے۔ طوائف کی پسواج کبھی کبھی کھلنے لگتی اس لیے نہیں کہ اشفاق کے اندر کی طوائف بہت نمایاں تھی بلکہ اس لیے کہ وہ میرے اندر کی طوائف سے زیادہ بھڑکیلی تھی۔ ہر فنکار میں ایک طوائف ہوتی ہے۔ کسی میں ننگی کسی میں ادھ کھلی کسی میں مستور مثلاً ابوالاثر میں بالکل ننگی تھی۔ محمد طفیل میں مستور ہے۔ انتظار میں ادھ کھلی ہے۔ اشفاق میں گھونگھٹ نکال کر سامنے بیٹھی رہتی ہے۔ اس زمانے میں ہم لارنس باغ میں اوپن ایئر تھیٹر میں ملا کرتے تھے۔ اوپن ایئر تھیٹر ذوبی کے قبضے میں تھا۔ ذوبی اشفاق کا دوست تھا اور جانا پہچانا آرٹسٹ تھا۔ ذوبی خوش باش نوجوان تھا۔ انداز میں سنجیدگی تھی۔ بات میں پھلجھڑی تھی۔

اوپن ایئر تھیٹر میں پہنچتے ہی اشفاق کے اندر کا ڈرامائی نقالیہ باہر نکل آتا۔ پھر رنگین باتوں کے سنہرے جال ہوا میں اڑتے۔ نقلیں ممکس، قصے کہانیاں چٹکلے، لطیفے، اشفاق احمد تماشا ہوتا ہم تماشائی ہوتے اور اوپن ایئر تھیٹر واقعی تھیٹر بن جاتا۔

اشفاق احمد ٹیلنٹڈ فنکار ہے۔ اس کی ٹیلنٹ کا مرکز آنکھ اور کان ہیں۔ خصوصاً کان۔ وہ مجھ سے زیادہ دیکھتا ہے، زیادہ سنتا ہے۔ اس کا ذہن ہر تفصیل کو ریکارڈ کر لیتا ہے اور اس کا نطق اسے من وعن ری پروڈیوس کر سکتا ہے۔

ان دنوں اشفاق احمد ایک لقادق جزیرے میں رہتا تھا جو رابنس کروزو کے جزیرے سے کہیں زیادہ ویران تھا۔ اشفاق احمد کا یہ جزیرہ ایک بہت کھلی نیم چھتی تھی جو ایک وسیع و عریض رستے بستے مکان کی اوپر کی منزل پر واقع تھی۔

جب بڑے خان گھر پر نہ ہوتے تو نچلی منزل میں اک میلا لگ جاتا شور شرابا، ہنسی مذاق لیکن نیم چھتی میں ہر وقت ہو کا عالم ہوتا۔ وہاں چاروں طرف کتابوں کے ریک بھرے ہوئے تھے جن میں رنگارنگ کی کتابیں تھیں۔ ان کے درمیان فرش پر اشفاق احمد یا تو مطالعہ میں مصروف ہوتا اور یا مستقبل کے منصوبے بناتا جاگتے کے خواب دیکھتا۔

اس جزیرے کو دیکھ کر میں نے جانا کہ اشفاق احمد صرف دکھ اور چپ ہی نہیں ازلی اکیلا بھی ہے۔ وہ بذاتِ خود ایک جزیرہ ہے جو کسی کو کنارے لگنے نہیں دیتا۔ جو نہیں چاہتا کہ کوئی اس کی تنہائی میں مخل ہو۔

سارا سارا دن وہ کتابوں کے انبار میں بیٹھا رہتا۔ بے نام دکھ کا مارا ہوا۔ بے وجہ چپ۔ تلے دبا ہوا۔ پھر آہستہ آہستہ ساری نیم چھتی ایک عظیم اکتاہٹ سے لبالب بھر جاتی۔ اس میں ایک وحشت بیدار ہوتی۔ لپک کر وہ سنہرے پھل بوٹوں والا چغہ پہن لیتا۔ چغہ پہنتے ہی چہرے کے زاویے اوپر کو اُبھر آتے۔ ہونٹوں پر روغنی تبسم کھلنے لگتا اور وہ چٹکیاں بجاتا ہوا نیم چھتی کی سیڑھیاں اترنے لگتا۔ پھر یہ خوش باش نوجوان اوپن ایئر تھیٹر میں جا پہنچتا۔ وہاں ڈگڈگی بجاتا۔ گھنگھرو چھنکاتا۔ مجمع لگاتا تھیلے سے رنگین باتوں کے جال نکالتا۔ گنگناتا۔ گاتا، ڈرامے کھیلتا، قہقہے لگاتا، خود ناچتا دوسروں کو نچاتا۔ لیکن یہ دور زیادہ دیر کے لیے نہیں چلتا تھا۔ اس کے بعد پھر وہی جزیرہ وہی ہو حق، وہی دکھ، وہی چپ، وہی تنہائی، وہی اشفاق احمد۔ اس زمانے میں اشفاق کی زندگی اس خاتون کی طرح گزر رہی تھی جو سارا دن ننگے سر ننگے پاؤں ان دھلے منہ اور لٹ پٹ بال لیے دھوپ میں بیٹھی ہونسیاں پانے میں لگی رہتی ہو اور شام کو ہار سنگار کر کے پشواج پہن کے طوائف بن جاتی ہو۔

پتہ نہیں فنکار کی تخلیق میں قدرت اس قدر اہتمام کیوں کرتی ہے۔ اپاہج بنا کر ناچنے کی انگیخت دیتی ہے۔ گونگا بنا کر باتوں کی پھلجھڑیاں چلانے پر اکساتی ہے۔ پتہ نہیں قدرت ایسا کیوں کرتی ہے۔ مگر یقیناً وہ ایسا کرتی ہے۔

اس زمانے میں ایک ویران نیم چھتی میں تنہائی ڈکھ اور چپ کے بنیادی رنگوں سے قدرت ایک فن کار کی تخلیق کر رہی تھی۔

پتہ نہیں کن وجوہات کی بنا پر اشفاق احمد کی شخصیت میں ہفت رنگی عناصر پیدا ہو چکے ہیں۔ ایک بے نیاز صوفی بابا۔ رکھ رکھاؤ سے سرشار۔ ایک دنیادار خودنمائی سے بھرپور ایک خاتون۔ پتھر کا بنا ہوا ایک دیوتا۔ دوسروں کو نصیحتیں کرنے پر پھبتیاں کسنے والا ایک تلقین شاہ۔ اپنی منوانے والا گھر کا مالک۔ سن کر جذب کر لینے والا ایک عظیم کان۔

اشفاق کے والد ایک عظیم شخصیت تھے۔ اتنی عظیم کہ انھوں نے گھر کے تمام افراد کو کبڑا بنا رکھا تھا۔ ان کی وجہ سے گھر میں بالشتیوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی جب یہ گلیور گھر ہوتا تو کسی کو دم مارنے کی اجازت نہ ہوتی۔ گھر سے باہر ہوتا تو دھما چوکڑی مچ جاتی۔

بیگم اس سوچ میں کھوئی رہتی کہ عجز، ادب، احترام اور دنیاداری کا کونسا مرکب ایجاد کیا جائے جس کے زور پر ظلِ الٰہی کو ڈھب پر لایا جا سکے۔

خان منزل میں صرف پٹھان خصوصیات کی قدر و منزلت تھی۔ چونکہ اشفاق ان خصوصیات سے محروم تھا۔ اس لیے گھر میں وہ سب سے چھوٹا بالشتیا تھا۔

اشفاق میں انفرادیت کی ایک کلی لگی ہوئی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کوئی انوکھی بات کرے۔ انوکھا کام کرے، انوکھی خبر سنا کر دنیا کو حیران کر دے۔ خان منزل میں اس کا یہ جذبہ تشنۂ تکمیل رہا۔ دل میں ایک کانٹا سا لگا رہا۔ ردعمل یہ ہوا کہ اب وہ کسی کو گلیور ماننے کے لیے تیار نہیں کسی پہلو سے خود کو بالشتیا تسلیم کرنے سے منکر ہے۔

اگرچہ وہ اپنی فنکارانہ عظمت کا تذکرہ خود نہیں کرے گا لیکن اس کا جی چاہے گا کہ دوسرا کرے۔ دوسرا کرے تو اشفاق کے چہرے پر پھلجھڑیاں چلنے لگیں گی۔ چہرے کے زاویے اوپر کو اُبھر آئیں گے آنکھوں میں تبسم پھوٹے گا۔

کسی دوسرے فنکار کی عظمت کی بات چھڑ جائے تو وہ بات کو کاٹے گا نہیں لیکن ہاں میں ہاں بھی نہیں ملائے گا۔ اشفاق احمد کی شخصیت کے سادھوپن سے مجھے انکار نہیں لیکن اس کی فنکارانہ خاموشی کے گھونگھٹ تلے چھپے رہنے کے باوجود بڑی طوطا چشم ہے۔

اس جزیرے کی بوجھل تنہائی میں اشفاق احمد نے جو اظہار کا پہلا طریقہ آزمایا وہ مصوری تھا۔ یہ ذوبی سے میل ملاپ کی وجہ سے تھا۔ لیکن کچھ دیر کے بعد اس نے مصوری

چھوڑ کر ادب کو اپنا لیا۔ اور وہ مختصر افسانے لکھنے لگا۔

مصوری کا دور صرف تین چار سال رہا۔ اس کے دو عمل مجھے ابھی تک یاد ہیں۔ پہلے عمل کا نام کال بیل تھا۔ تصویر میں نسائی جسم کا وہ برقی بٹن دکھایا گیا تھا جسے دبانے سے محترمہ رکھ رکھاؤ اور لاج کے پردے چاک کر کے باہر نکل آتی ہے۔ تصویر دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے باہر نکل آنے والی محترمہ دراصل ایک جن ہو جسے انسانی بوتل میں قید کر رکھا ہو۔

دوسرے عمل کا کوئی نام نہ تھا۔ ہوتا تو ''دی فالک درمن'' ہوتا۔ تصویر میں ایک عورت دکھائی گئی تھی۔ جس میں جنسی تقاضوں کی گٹھڑی کندھوں پر رکھی ہوئی تھیں۔ اور وہ آرزوؤں کی ان مٹکیوں کو بر سر عام چھلکاتی پھرتی تھی۔

پتہ نہیں اشفاق احمد نے عمل نگاری میں جنس کا موضوع کیوں اپنایا۔ چونکہ اشفاق احمد کا جنس سے لگاؤ ضمنی ہے۔

جنس کے لحاظ سے مرد کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو جذبے کا دریچہ کھولے بغیر جنس کے ایوان میں چہل قدمی کے شوقین ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ کہ جب تک جذبات کا دروازہ نہ کھلے جنس کے خدوخال نہیں اُبھرتے۔ اور تیسرے وہ کہ جذبات کی کھڑکی کھل بھی جائے تو بھی جنس سے خائف رہتے ہیں۔ اشفاق احمد تیسری قسم سے تعلق رکھتا ہے۔ ان دنوں اشفاق احمد کی آرزو تھی کہ شوخ اور طرح دار لڑکیوں کو باتوں کے جال بُن کر اپنی طرف متوجہ کر لے۔ متاثر کر لے۔ جب وہ تاثر سے بھیگ جاتیں۔ تو اشفاق پر گھبراہٹ طاری ہو جاتی ''اب کیا ہوگا'' اشفاق اب بھی عورت کے قرب سے ڈرتا ہے۔ قریب مت آؤ دور کھڑی ہو کر بات کرو۔

لیکن نسائی نفسیت کے مطابق فاصلے نہیں بلکہ قرب محفوظ ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ آگے بڑھنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس اشفاق کے لیے فاصلہ محفوظ تھا۔ اس لیے وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوتا۔ زندگی میں وہ بار بار پیچھے ہٹا۔ الٹے پاؤں بھاگا۔ ہونکتا ہوا اپنی نیم چھتی میں پہنچا۔ سچے دل سے باتوں کے جال بننے سے توبہ کی لیکن باتوں کے جال بننے پر وہ مجبور تھا۔ بار بار توبہ ٹوٹی۔

حتیٰ کہ گورنمنٹ کالج میں وہ محترمہ منظرِ خاص پر آ گئی۔

وہ محترمہ بڑی چتر کار تھی۔ اندر سے قدیم اوپر سے جدید۔ اوپر سے سادہ مرادی اندر بن ٹھن ہی بن ٹھن۔ اوپر سے ٹھہراؤ ہی ٹھہراؤ۔ اندر جذبات کی ہلچل۔ اوپر ذہن ہی ذہن اندر دل ہی دل۔ وہ محترمہ دروپدی اور گیشیا کا سنگم تھی۔ وہ محترمہ متاثر ہو کر آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے ہٹنے کی عظمت کو جانتی تھی۔ وہ محترمہ ان مشرقی خواتین میں سے تھی جو پیچھے ہٹنے والوں کو پہچانتی ہیں۔ اور خود پیچھے ہٹ کر انہیں پیچھے ہٹنے کی ندامت سے بچا لیتی ہیں۔

بڑے واقعات ہمیشہ چھوٹی سی بات سے جنم لیتے ہیں۔

ایک روز محترمہ کالج کے برآمدے سے گزر رہی تھی۔ اشفاق نے سوچا کوئی منفرد بات کروں۔ اس نے ہاتھ پھیلا دیا۔ ایک آنہ دے دیجیے۔ کس لیے محترمہ نے پوچھا۔ سگریٹ پیوں گا۔

محترمہ نے اکنی ہتھیلی پر رکھ دی۔ فتنہ و فساد کے ایوان کی بنیاد میں پہلی اینٹ رکھ دی گئی۔

پھر بات بڑھ گئی۔ اشفاق احمد سارا دن موقعہ ڈھونڈتا تا کہ ہاتھ پھیلا کر کہے ایک آنہ۔ محترمہ منتظر رہنے لگی۔ پھر اہتمام کرنے لگی کہ جیب میں ٹوٹی ہوئی اکنی موجود رہے۔ بات بڑھی تو محترمہ آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے ہٹنے لگی۔ اشفاق حیران رہ گیا۔ وہ ''اب کیا ہوگا'' کے فکر سے آزاد ہو گیا۔ اس لیے آگے بڑھنے لگا اور آگے اور آگے۔ یہ اس کے لیے ایک انوکھا تجربہ تھا جس میں آگے بڑھنے کی لذت تو موجود تھی لیکن فاصلہ کم ہونے کا خدشہ نہ تھا۔ آگے بڑھتے بڑھتے وہ اس مقام پر پہنچ گیا جہاں سے واپسی ممکن نہیں رہتی۔

اشفاق طبعاً ایک گیلی لکڑی ہے۔ بھڑک کر جلنے کی صلاحیت سے محروم، صرف سلگنا جانتا ہے۔ سال ہا سال سلگتا رہا۔ محترمہ میں انتظار کرنے کا حوصلہ تھا۔ حالات نامساعد تھے۔ خاندان روایتی تھا۔ باپ جابر تھا۔ اشفاق گونگا تھا۔ آخری قدم اٹھانے کی ہمت نہ تھی۔ ایک بھائی اور دو دوستوں نے زبردستی اٹھا کر ملا کے سامنے بٹھا دیا۔ محترمہ کی والدہ تعلیم یافتہ تھی۔ سمجھ دار تھی۔ وسعت دل کی حامل تھی۔ اس نے تعاون کیا۔ شادی ہو گئی۔ گھر

والوں نے اسے بھگوڑا قرار دے دیا اور لاتعلق ہو گئے، پلے کچھ تھا نہیں کہ گھر کا چولہا جلتا رہتا۔ دونوں میاں بیوی نے کانوں پر قلم ٹانگے۔ اور سکرپٹ لکھوالو چلو جی۔ کوئی سکرپٹ لکھوالو۔ کا ہوکا دیتے ہوئے گھر سے باہر نکل گئے۔ یہ محترمہ بانو قدسیہ تھی۔ اشفاق احمد نے برش اور رنگ کو کیوں تیاگ دیا۔ اس کی جگہ قلم کو کیوں اپنالیا۔ غالباً اس لیے کہ عمل میں وہ اتنی تفصیلات نہیں دکھا سکتا تھا جو داستان گو کے بورے میں بھری ہوئی تھیں۔ اصولی طور پر تو اسے مغنی ہونا چاہیے تھا چونکہ وہ ایک عظیم کان کا مالک ہے۔ لیکن اشفاق کو انسانی کردار سے دلچسپی تھی۔ خالی آواز کا زیروبم اسے جذب نہ کر سکا۔ اس لیے اشفاق احمد افسانہ نویس بن گیا۔

ادب میں شہرت پانے کے بعد دنیائے ادب میں رکنا اس کے لیے مشکل ہو گیا۔ اس کے اندر کی طوائف کا دم گھٹنے لگا۔ اور وہ شومین بزنس میں جا شامل ہوا۔ اولیں دور میں اشفاق احمد کو کچھ کرنے کا شوق تھا۔ اب اسے کچھ کر دکھانے کا شوق ہے۔

اشفاق احمد ایک پرفیکشنسٹ ہے۔ وہ جو کام بھی کرتا ہے، اس کے اندر دھنس جاتا ہے۔ اس قدر اندر دھنس جاتا ہے کہ لت پت ہوئے بغیر باہر نہیں نکلتا۔ مثلاً جب وہ ماڈل ٹاؤن میں مکان بنا رہا تھا تو کئی ایک ماہ کے لیے معمار بن گیا۔ چنائی اور پلستر کے کاموں کے اندر دھنس گیا۔ جب وہ مکان میں نلکے لگوا رہا تھا تو آٹھ روز برانڈرتھ روڈ کے چکر لگاتا رہا۔ اس نے تمام ٹونٹیاں دیکھیں۔ کس کس کا منہ کھلا ہے کس کس کا بند بند۔سا ہے۔ بیچ میں کتنے کتنے چکر ہیں۔ کس کس کا واشل مضبوط ہے۔ کھولیں تو کتنی دھار نکلتی ہے۔ بند کریں تو چونے کی صلاحیت کس قدر ہے۔ آٹھ دن کی تحقیق کے بعد وہ ٹونٹیوں پر تفصیلی مقالہ لکھ سکتا تھا۔ کہ پاکستانی کارخانوں کی بنی ہوئی ٹونٹیوں کے کیا کیا خواص ہیں۔ کیا کیا خوبیاں ہیں کیا کیا خامیاں ہیں۔ یہ تفصیلات اکٹھی کرنے کے بعد اس نے مکان کے نلکوں کے لیے ٹونٹیاں خریدیں۔

کباب بنانے کا شوق پیدا ہوا تو لاہور کے معروف کبابیوں سے کوائف اکٹھے کرتا رہا۔ قیمہ کیسا ہونا چاہیے۔ مصالحہ کیسا ہونا چاہیے۔ آنچ کیسی کتنی ہو۔ اس کے بعد اس نے کباب بنانے کی سیخیں خرید لیں۔ اور میاں بیوی مل کر کباب سازی کی مشق کرتے رہے۔ اب اشفاق کے ہاتھ کے بنے ہوئے کباب منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ اکثر دوستوں کو مدعو کرتا ہے۔ خود کباب بنائے جاتا ہے۔ دوست کھائے جاتے ہیں۔

اس شوق تحقیق کو اشفاق کام میں نہیں لاسکتا۔ اس کی تحقیق کا مقصد صرف لذت تحقیق ہے۔ ورنہ آج گلبرگ میں اس کی دکان ہوتی اور سارے لاہور میں اشفاق کبابیے کی دھوم ہوتی۔

اشفاق احمد نے آج تک اپنے صرف ایک فن سے مالی فائدہ حاصل کیا ہے۔ اور وہ ہے سکرپٹ رائٹنگ۔ عرصہ دراز تک اشفاق کے گھر میں حساب کتاب سکرپٹوں میں ہوتا رہا۔ کرایہ مکان چار سکرپٹ۔ باورچی خانے کا خرچ آٹھ سکرپٹ، علاج معالج ڈیڑھ سکرپٹ۔ لین دین دو سکرپٹ آج بھی بانو سے پوچھو یہ صوفہ کتنے میں خریدا تھا تو وہ کہے گی اچھی طرح یاد نہیں شاید تین سکرپٹ لگے تھے۔

آج بھی میاں بیوی ہنگامی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے قلم کا پھاوڑا چلاتے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ دونوں کے سکرپٹوں سے مشقت کے پسینے کی بو نہیں آتی۔ ان کے گھر چلے جاؤ تو یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ منشیوں کا گھر ہے۔ الٹا وہ تو فارغ البال میزبانوں کا گھر لگتا ہے۔ یہ آج کی بات نہیں ان دنوں بھی ان کا گھر فارغ البالیوں کا گھر لگتا تھا جب چولہا جلائے رکھنے کا مسئلہ پیش پیش تھا۔

اشفاق کی خوش قسمتی کا ایک اور پہلو ملاحظہ ہو۔ اشفاق احمد نے ایک خاتون سے عشق کیا۔ کئی ایک سال وہ اس کے عشق میں گلتار رہا۔ عشق میں کامیاب ہوا۔ خاتون بیوی بن کر گھر آئی تو وہ محبوبہ نہ تھی بلکہ عاشق نکلی۔ ورنہ اشفاق احمد کے جملہ کس بل نکل جاتے۔ محبوب طبیعت وہ ازلی طور پر تھا۔ بیوی کی آمد کے بعد بالکل ہی دیوتا بن گیا۔ کانٹا اشفاق کو چبھتا ہے تو درد بانو کو ہوتا ہے، ہتھ چکی اشفاق چلاتا ہے تو آبلے بانو کے ہاتھوں میں پڑتے ہیں۔

حیرت کی بات ہے کہ ایک خالص پکی دانشور نے پتی بھگتی میں اپنا سب کچھ جذبات ذہن روح تیاگ رکھا ہے۔ بانو بہت بڑی مفکر ہے وہ ہر بات میں صاحب رائے ہے۔ عقل وخرد

سے بھرپور لیکن جب اشفاق طلوع ہو جائے تو سب کچھ سپاٹ ہو جاتا ہے۔ عقل، خرد، دانشوری۔

اشفاق کو شریفانہ قسم کا غصہ نہیں آتا غصہ تو آتا ہے لیکن غصے میں وہ بھڑک کر جلنے کی عشرت سے محروم ہے۔ وہ چڑ چڑ کرتا ہے۔ سلگتا ہے، بل کھاتا ہے اور اپنی سلگن کا دوسرے کی ناک میں دھواں دیتا رہتا ہے۔ کئی بار اس کی چڑ چڑ اس قدر شدید ہو جاتی ہے کہ گھر بھٹیاری کی کڑاہی بن کر رہ جاتا ہے۔ چڑ چڑ دانے بھنتے رہتے ہیں۔

یہ چڑ چڑ بھی اس کے لیے خوش قسمتی کا باعث بن گئی۔

گمان غالب ہے کہ ایک دن جب بھٹیارن دانے بھون رہی تھی۔ اسے وہ شخصیت یاد آ گئی جس نے اسے چڑ چڑ کا تحفہ بخشا تھا۔ وہ گلیور جس نے بچپن میں اسے ٹھگنا بنائے رکھا تھا۔ اس وقت اشفاق احمد اپنے نئے سکرپٹ کے لیے موضوع سوچ رہا تھا۔ اس نے بچپن کے گلیور کا قصہ لکھ دیا۔

یوں تلقین شاہ وجود میں آ گیا۔

تلقین شاہ ایک جاذب توجہ کردار ہے۔ لوگوں نے تلقین شاہ سنا تو بھونچکے رہ گئے۔ ہر کسی کے دل کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے بالشتیے نے سر نکالا۔ اور دوسروں کو تلقین کرنے والے گلیور پر تالیاں بجانے لگا۔ ہم سب میں کہیں نہ کہیں ایک چھپا ہوا بالشتیا موجود ہے۔ جس کا وجود کسی نہ کسی تلقین شاہ کا مرہون منت ہے۔

تلقین شاہ کی آمد پر بہت سے بھرے ہوئے پھوڑے پھوٹ بہے دلوں میں تنے ہوئے پیچ و تاب ڈھیلے پڑ گئے۔ دبے ہوئے غصے تمسخر کی شکل میں متبسم ہو گئے۔ انتقام کے جذبات ترس میں بدل گئے۔ پند و نصیحت کا بھانڈا چوراہے میں پھوٹ گیا۔ تلقین شاہ دلچسپ کردار ہی نہیں وہ بہت اچھا ''سائی کی ایرسٹ'' بھی ہے۔ ایک ذہنی ڈاکٹر جس نے بہت سے کبڑوں کو سیدھا کر دیا۔ بالشتیوں کو قد و قامت عطا کیا۔ گونگوں کو زبان بخشی، دل میں پڑی ہوئی گرہوں کو کھولا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بتوں کو توڑ دیا۔ لوگوں نے فرط محبت سے اس ۔ شکن کو آنکھوں پر بٹھا لیا۔ اشفاق احمد ہکا بکا رہ گیا۔ اسے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ

شہرت کسے کہتے ہیں۔ کہ عوام آنکھوں پر بٹھا لیں تو آسمان کے تارے قدموں میں آ گرتے ہیں۔ مگر شہرت گھر والوں کو راس نہ آئی۔ اشفاق احمد گھر میں بالکل ہی پتھر کا بت بن کر بیٹھ گیا۔ کامیابی بڑی ظالم چیز ہے۔ وہ انسان کو پتھر کا بنا دیتی ہے۔

اس کامیابی پر بھی اشفاق احمد کو شکایت ہے۔ کہتا ہے۔ یارو کیسی اندھیر نگری ہے۔ تلقین شاہ کو تخلیق کرنے والے کو کوئی نہیں پوچھتا۔ تلقین شاہ پر جان چھڑکتے ہیں۔ لکھنے والے اشفاق احمد کو نہیں مانتے اس صداکار کے دیوانے ہیں جو یہ کردار بولتا ہے۔ شکر ہے تلقین شاہ کا پارٹ ادا کرنے والا خود اشفاق احمد ہے ورنہ کوئی اور ہوتا تو اشفاق احمد تلقین شاہ کا گلا گھونٹ دیتا اور یا خودکشی کر لیتا۔

اپنی تخلیق میں اشفاق احمد کسی دوسرے فرد کو کریڈٹ میں حصہ دار بنانے کے لیے تیار نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ تمام تر کریڈٹ لکھنے والے کا حق ہے۔ آپ اسے کہیں کہ یار تیرے ٹی وی ڈرامے میں فلاں شخص نے اچھا رول کیا۔ یہ بات اسے ناگوار گزرے گی۔ فوراً جواب میں کہے گا۔ ہاں اس نے خاصا کام کیا۔ بڑی ڈھونڈ کے بعد یہ لڑکا تلاش کیا تھا۔ ریہرسل میں آیا تو بالکل کچا نکلا۔ بڑی محنت کرنی پڑی۔۔۔ خیر نبھا گیا۔ کریڈٹ دینے میں اشفاق احمد کٹر بنیا ہے۔

اشفاق احمد ایک باغ و بہار ساتھی ہے۔ خوش گفتار دوست ہے۔ بظاہر نرم مگر بڑا سخت گیر افسر ہے۔ چڑ چڑ کرنے والا خاوند ہے۔ جو اپنی سلگن سے گھر والوں کی ناک میں دھواں دیتا رہتا ہے۔ بڑا چالاک جی حضوریہ ماتحت ہے۔ کام اپنی مرضی کے مطابق کرتا ہے۔ افسر کو یہ احساس دیتا ہے کہ اس کی مرضی کے مطابق ہو رہا ہے۔ پسینہ بہانے والا کامی ہے۔ منہ زبانی مرد ہے۔ عظیم پراپیگنڈسٹ ہے۔ اثر ڈالنے کا بادشاہ ہے۔ خود پسند ہے۔ سیلف سفیشنٹ ہے۔

اشفاق احمد نے بانو کی تخلیقی قوتوں کو سچے دل سے کبھی تسلیم نہیں کیا۔ حالانکہ ادبی میدان میں بانو کی حیثیت اشفاق سے بلند تر ہے۔ اگر آپ بانو کی تخلیق کاری کے متعلق بات کریں تو کہے گا ہاں اچھی لکھتی ہے۔ لیکن یار بڑی مغز ماری کے بعد اسے یہاں لایا

ہوں۔اب بھی میرے فقرے چراتی رہتی ہے۔

اشفاق احمد کی خود پسندی کی زیادہ تر ذمہ داری بانو پر عائد ہوتی ہے۔بانو اشفاق سے بے حد محبت کرتی ہے اور اس کی محبت کا شیرا اتنا گاڑھا ہے کہ وہ چپ چپ کرتی رہتی ہے۔ اشفاق اس شیرے کی دلدل میں یوں بیٹھ رہتا ہے جیسے بھینس راب کے جوہڑ میں پھنسی ہو۔

اشفاق کو اپنے رنگ میں دیکھنا ہو تو اس وقت دیکھئے جب وہ کچھا بنیان پہنے درخت کی چھاؤں میں کھاٹ پر بیٹھا کچھ کھا پی رہا ہو۔اشفاق کھانے کا رسیا ہے بشرطیکہ کھاجا من بھاتا ہو وہ پسند کی چیز کھاتا ہے۔اور پھر بسیار خوری کا شکار ہو جاتا ہے۔جب وہ کھا رہا ہو تو اندر کی طوائف بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے۔کوئی دیکھتا ہے تو پڑا دیکھے۔وہ اس انہماک سے کھاتا ہے کہ گرد و پیش معدوم ہو جاتے ہیں۔لذت میں لتھڑ جاتا ہے۔یوں جیسے مینڈک کیچڑ میں لت پت ہو رہا ہو۔اس وقت بانو بھی قابل دید ہوتی ہے۔وہ خوشی سے لت پت ہو رہی ہوتی ہے۔ایک طرف ڈالڈا ہی ڈالڈا دوسری طرف ممتا ہی ممتا۔

اشفاق احمد ذات کا مستری ہے۔اسے مشینوں سے محبت ہے۔اور گیجٹ اس کی جان ہیں میرے سکوٹر کو دیکھ کر وہ ہمیشہ احتجاجاً بڑبڑ کرتا رہتا ہے۔ظالمو تم اس ننھی سی جان کا ذرا خیال نہیں رکھتے۔تمہیں کیا پتہ کہ ایک چھوٹا سا نازک سا پسٹن اپنی ننھی سی جان کے بل بوتے پر لوہے کے اتنے بڑے کھڑکھڑے کو دھکیل کر چلاتا رہتا ہے۔ظالمو اس ننھی سی جان کا کچھ تو خیال کیا کرو۔اس کے گھر میں مشینوں، گیجٹوں اور اوزاروں کی ایک بھیڑ لگی ہوئی ہے۔چاہے اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی نہ ہو۔دکان میں نئے گیجٹ کو دیکھ کر بچے کی طرح مچل جائے گا۔اسے غور سے دیکھے گا۔اس کی ورکنگ کو سمجھے گا۔اس سے کھیلتا رہے گا۔پھر اس کو خریدنے کے لیے تڑپتا رہے گا۔جب تک خرید نہ لے گا چین سے نہیں بیٹھے گا۔اشفاق نے اپنے گیراج میں ایک ورک شاپ بنا رکھی ہے۔جو تمام اوزاروں اور سامان سے لیس ہے نتیجہ یہ ہے کہ اس کے تینوں بیٹے اعلیٰ قسم کے مستری ہیں۔لکڑی اور لوہے دونوں کاموں میں دسترس رکھتے ہیں۔

فارغ وقت میں اشفاق اپنی مشینوں اور گیجٹوں کو باہر نکالتا ہے پیار سے صاف کرتا



ہے۔تیل دیتا ہے، گریس لگاتا ہے۔کل پرزے چیک کرتا ہے۔کوئی نقص ہو تو اسے دور کرتا ہے۔آپ اشفاق سے اس کی موٹر مانگیں۔کبھی نہ دے گا۔خود کو ڈرائیور بنا کر پیش کر دے گا۔

آج بھی اتنی شہرت کا مالک ہونے کے باوجود اتنی جان پہچان ہونے کے باوجود، میل ملاپ کے باوجود اشفاق احمد اندر سے وہی رابنسن کروزو ہے۔جو کئی ایک برس پہلے خان منزل کی نیم چھتی میں مقیم تھا۔بنیادی طور پر وہ آج بھی لوگوں سے ملنے سے ہچکچاتا ہے۔

اکیلے میں وہ یوں بیٹھا ہوتا ہے جیسے مگرمچھ ساحل کے کنارے دھوپ میں کیچڑ میں لت پت پڑا ہوتا ہے۔اس وقت اگر کوئی اطلاع دے کہ فلاں صاحب ملنے آئے ہیں تو اس کے ماتھے پر تیوری اُبھرتی ہے۔تلوار سی دھار والی تیوری۔ڈرائنگ روم کی طرف جاتے ہوئے اس کے چہرے پر جلی حروف میں لکھا ہوتا ہے۔مارے گئے۔

یہ اور بات ہے کہ ملاقاتی کمرے میں پہنچ کر اس کے اندر کی طوائف جاگ اٹھے اور وہ باتوں کے سنہرے جال بننا شروع کر دے۔شاید آپ میری بات نہیں مانیں گے اگر میں کہوں کہ لاہور میں اتنے سال رہنے کے باوجود وہ کوئی دوست نہیں بنا سکا۔کوئی ایک آدمی بھی ایسا نہیں جس کا اشفاق انتظار کھینچے۔جسے کوئی بات بتانے کے لیے بے قرار ہو۔اس میں دوست بنانے کی صلاحیت سرے سے مفقود ہے۔۔۔حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک سیلف سفیشنٹ آدمی ہے۔اشفاق احمد اینٹی سوشل نہیں صرف ان سوشل ہے۔اس نے کئی بار شدت سے محسوس کیا ہے کہ اسے سوشل بننا چاہیے۔کئی بار میاں بیوی نے بیٹھ کر سوشل بننے کا پروگرام بنایا کہ شام کو سوشل وزٹ کیا کریں گے آج ان کے ہاں کل اُن کے ہاں۔انہوں نے قابل وزٹ لوگوں کی ایک لسٹ بنائی درجہ وار لسٹ۔بازار سے ایک جامع کتاب خریدی جس میں سوشل گفتگو کی تفصیلات درج تھیں۔سوشل آداب درج تھے۔ایک مہینے کی تیاری کے بعد جب عمل کا موقعہ آیا تو ایک ہفتہ وزٹ کرتے رہے۔آٹھویں دن دونوں بیٹھے آہیں بھر رہے تھے۔مشکل کام ہے۔اشفاق نے کہا۔بات نہیں بنی بانو نے جواب دیا۔الٹا بگڑ

رہی ہے۔ اشفاق نے کہا اور سوشل پروگرام ختم ہو گیا۔ اشفاق احمد کے گھر کا مرکز ڈرائنگ روم نہیں بلکہ باورچی خانہ ہے۔ باورچی خانے کے ایک جانب میز لگا ہوا ہے۔ یہ باورچی خانہ ہی ڈرائنگ روم ہے۔ یہی ڈائننگ روم ہے، یہی سٹنگ روم ہے۔

اشفاق کے گھر کا باورچی خانہ سارا دن اور آدھی رات تک یوں چلتا رہتا ہے جیسے رہٹ والا کنواں۔ اس رہٹ پر بانو بندھی رہتی ہے۔ یہ بانو کا کمال ہے کہ بندھی ہونے کے باوجود بندھی نہیں دِکھتی۔ وہ باورچی خانے میں یوں ایستادہ نظر آتی ہے جیسے جھیل میں کنول کا پھول اُگا ہو۔ دونوں ہی مہمان داری کے جذبے سے یوں بھرے ہوئے ہیں جیسے گلا ہوا مالٹا رس سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ اشفاق پٹھان ہے۔ بانو جاٹ ہے۔ دونوں ہی کھلانے کے متوالے ہیں، سونے پر سہاگا نور بابا نے چھڑکا۔

نور بابا صوفی منش درویش تھا۔ اس کا ڈیرا لاہور چھاؤنی کی ایک سڑک پر واقع تھا۔ نور بابا کا مسلک لوگوں کو کھانا کھلانا تھا۔ پتہ نہیں اشفاق ڈیرے پر کیسے جا پہنچا۔ بابا کو اشفاق کی باتیں بہت پسند آئیں۔ بابا اشفاق سے محبت کرنے لگا۔ لہٰذا اشفاق کا ڈیرے پر جانا لازم ہو گیا۔

نور بابا کہتا تھا۔ پتر لوگوں کو کھلاؤ۔ جو کچھ تم خود کھاتے ہو پہلے اسے حلال کرلو۔ خود کھانے سے پہلے دوسروں کو کھلاؤ۔ دوسروں کو کھلاؤ گے تو وہ حلال ہو جائے گا۔ سودا خریدو تو اسے پہلے حلال کرلو۔ دوجے کے لیے آٹا خریدو چاول خریدو۔ خود کپڑا پہننا ہے تو پہلے دوسرے کے لیے کپڑا خریدو۔

اشفاق کو بات دل لگی۔ اس نے بانو کو بتائی دونوں نے فیصلہ کرلیا کہ کھلاؤ۔ کھلاؤ۔ کھلاؤ۔ یوں ان کا باورچی خانہ چلنے لگا یوں چلنے لگا جیسے رہٹ چلتا ہے۔ یہ رہٹ آج بھی چل رہا ہے۔ بانو اس رہٹ سے بندھی ہے۔ اسے چلا چلا کر اس کی نسیں تار تار ہو چکی ہیں۔ پٹھے سخت ہو چکے ہیں۔ جسم میں جان نہیں رہی۔ لیکن رہٹ چل رہا ہے۔

اشفاق احمد کے گھر سے مجھے محبت ہے۔ میرے لیے وہ یوں ہے جیسے طوفان زدہ پانیوں میں سرسبز جزیرہ ہو۔ وہ میرے لیے پناہ گاہ ہے، عشرت کدہ ہے۔ وہ پاکیزہ جگہ جہاں



ذکرِ حبیب رہتا ہے۔

مجھے اس گونگے اکیلے رابنسن کروزو سے شدید لگاؤ ہے۔ جو فرش پر اپنی انا میں لت پت پڑا رہتا ہے۔

مجھے اس فرائی ڈے سے بے پناہ محبت ہے جو ممتا کے گاڑھے شیرے کی کڑاہی لبالب بھرے خدمت کے جذبے سے سرشار پتی بھگتی کا دیا جلائے بیٹھی ہے۔

مجھے ان تین جنوں سے پیار ہے۔ جو دو بڑے تخلیق کاروں کے سائے تلے رہ کر بھی کبڑے نہیں ہوئے۔

-☆-

۱۹۸۹ء

# پھل پتی

ثاقبہ کی شخصیت پھل پتیوں سے بنی ہے، جس میں سے چنبیلی کی خوشبو آتی ہے اور جس کے ''اورا'' Aura سے ہالہ صاف نظر آتا ہے۔

اندر جھانکنے کا موقعہ ملے تو کبھی کبھار شک پڑتا ہے کہ صرف نرم و نازک پھل پتیاں ہی نہیں، سٹیل بھی لگتا ہے جیسے پھل پتیوں کی اوٹ میں Primordial Woman یا رائڈر ہیگرڈ کی ''شی'' چھپی بیٹھی ہے۔ پرائی مارڈیل وومن میں تین بنیادی خصوصیتیں ہوتی ہیں۔ کشش، تحمل اور آہنی عزم۔

اُس میں ''کُن'' کہنے کی شکتی موجود ہے۔ وہ طوفان کو باندھ سکتی ہے۔ دریا کا رُخ موڑ سکتی ہے۔ مہا یوگی کا گیان دھیان توڑ سکتی ہے۔ ماتا ہری کو سکھا سکتی ہے۔ ٹارزن کو سدھا کر انگلی پر بٹھا سکتی ہے۔ یہ صلاحیتیں ثاقبہ میں موجود ہیں۔ جب چاہے انہیں برت سکتی ہے لیکن یہ خصوصیات اس کی شخصیت پر طاری نہیں ہیں۔ طاری وہی پھل پتیاں ہیں، خوشبو ہے اور روشن ہالہ ہے۔

اس کتاب میں ثاقبہ کی شخصیت کو شامل کرنا ایسا ہے جیسے شدھ راگ میں بربجت سُر لگانا۔ چونکہ نہ تو ثاقبہ چمکیلی ہے نہ اوکھی ہے۔ لیکن کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ ممنوعہ سُر کو سجاوٹ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ بہر حال ثاقبہ کی شخصیت ''وکھری'' ضرور ہے۔ ثاقبہ سے رابطہ قائم ہونے سے پہلے میں سمجھتا تھا کہ ایک ٹھنڈی میٹھی برف میں لگی ہوئی خاتون ہے جو گریس فل اور حسین ہونے کے علاوہ تخلیق کار ہے مصنفہ ہے۔ جو ادبی محفلوں کو سجا دیتی ہے۔



چلو ٹھیک ہے میں نے سوچا۔ ہے تو بڑی ہو، اپنا کیا جاتا ہے۔

پھر خیال آتا کہ اسلام آباد میں بیگمات کی مٹھاس درحقیقت ایک سوشل افیئر ہوتا ہے جو شوگر کوٹنگ کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن ثاقبہ کی مٹھاس بیگماتی نہیں تھی۔ بیگمات کی بھیڑ میں وہ وکھری نظر آتی تھی۔ اس کی خوشبو بھی میڈ ان پیرس نہیں تھی۔ خس جیسی تھی۔ میں نے کسی سے پوچھا۔ یہ اٹرنل ٹین ایجر کون خاتون ہے۔

جواب ملا۔ تم اتنے بے خبر ہو گیا۔ اتنا بھی نہیں جانتے کہ یہ خاتون ایک پرانے جانے پہچانے علمی اور ادبی خاندان کی فرد ہے۔

وہ مٹھاس کچھ زیادہ ہی خوشگوار اور مفرح ہو گئی۔

میں نے پھر پوچھا۔ یہ بتاؤ کہ اب یہ خاتون کیا ہے۔

جواب ملا اب یہ گورنر کی بیگم ہے۔

وہ مٹھاس پھر سے شوگر کوٹڈ ہو گئی۔

جسمانی طور پر ثاقبہ چٹ کپڑی ہے۔ چٹ کپڑی سادہ لباس پہنتی ہے۔ میک اپ کی محتاج نہیں ہوتی۔ لگتا ہے جیسے سجاوٹ بناوٹ سے بے نیاز ہو۔ دراصل وہ سادگی کو کام میں لانا جانتی ہے اور ایسے کام میں لاتی ہے کہ میک اپ شرمندہ ہو کر منہ چھپا لے۔

ظاہری شخصیت دیکھو تو لگتا ہے جیسے ثاقبہ کے پاس کوئی اسم اعظم ہے جس کے زور پر وہ سدا بہار خاتون بنی ہوئی ہے۔

ایسی ٹین ایجر جس میں گریس فل بہاؤ ہے۔ ایسا بہاؤ جس نے ٹھہراؤ کا دامن تھام رکھا ہے اور یہ تضاد دکھتا نہیں۔

باطنی شخصیت کے حوالے سے۔ ثاقبہ نے میرے علم کی دھجیاں اڑا دی ہیں۔ میرے سارے مفروضے تہس نہس کر دیئے ہیں۔ وہ یوں آئی جیسے ہاتھی چینی کی دکان میں آ گھسا ہو۔ اس کے باوجود میں نے ثاقبہ سے کچھ کچھ سیکھا بھی ہے۔

ثاقبہ کو مل کر میں نے جانا ہے کہ انسان میں خیر کا جذبہ اس قدر فراواں ہے جیسے گندھے آٹے میں پانی۔ دکھتا نہیں پر ہے۔ اور یہ جو چاروں طرف شر ہی شر پھیلا ہوا نظر آتا ہے یہ

دراصل وہ چٹکی بھر نمک ہے جو آٹے میں ملا ہوا ہے اور یوں ذائقہ دے رہا ہے جیسے جزو اعظم ہو۔

ثاقبہ سے مل کر میں نے جانا کہ جس روز زندگی میں شر کا عنصر خیر پر حاوی ہو جائے گا اس روز یہ دنیا ختم ہو جائے گی۔

ثاقبہ سے مل کر میں نے یہ بھی جانا کہ قدرت نے اسے بڑی تخلیقی قوتیں عطا کی ہیں۔ اور ثاقبہ نے جی بھر کفرانِ نعمت کی ہے۔ تخلیق کاری کی جانب اس قدر سرسری توجہ دی ہے جیسے پھولوں کے باغ میں گھاس کو دی جاتی ہے۔ تخلیق کی جانب بے توجہی کی وجہ یہ ہے کہ اس کے سر پر فلاحی کاموں کا بھوت سوار ہے۔ اس نے کئی ایک فلاحی ادارے کھول رکھے ہیں۔ کئی ایک بچوں کی اکادمیاں چلا رکھی ہیں۔ معذور بچوں کی تربیت گاہیں قائم کر رکھی ہیں۔ ان اداروں کی دیکھ بھال کے لیے اس کی بیشتر زندگی سفر میں گزرتی ہے۔

ثاقبہ نے جتنے بھی ادبی مضامین لکھے ہیں بیشتر ہوائی سفر کے دوران لکھے ہیں۔

فلاحی ادارے تو ہمارے ہاں بیسیوں ہیں جو زیادہ تر بیگمات چلا رہی ہیں۔ سوشل ورکرز جلسے کرتے ہیں جن میں بڑے افسر مہمانِ خصوصی کے طور پر بلائے جاتے ہیں۔ مینا بازار لگائے جاتے ہیں۔ فن فیئرز چلائے جاتے ہیں۔ جن میں فن زیادہ اور فیئر کم کم۔ تصویریں کھنچوائی جاتی ہیں۔ جو اخباروں کے رنگین صفحات پر شائع کی جاتی ہیں۔ یوں سوشل ورک تفریح بن جاتا ہے۔ تفریح اور نام ساتھ ساتھ۔ لیکن ثاقبہ کے فلاحی کاموں میں صرف کام ہی ہوتا ہے نہ تفریح نہ نام۔ تفریح کی وہ متحمل نہیں ہو سکتی نام سے الرجک ہے۔

زندگی کے متعلق ثاقبہ نے بہت سی خوش فہمیاں پال رکھی ہیں۔ مثلاً وہ اس تسلسل سے خیرات کرتی ہے جیسے ملک سے غربت کا خاتمہ کرنے کا عزم کر رکھا ہو۔ اگر اس کا بس چلے تو سارا گھر لٹا دے۔ پتہ نہیں اس کے میاں اس بات کو کیسے برداشت کر لیتے ہیں۔ اگر میں کبھی صاحب اقتدار بن جاؤں تو پہلا کام یہ کروں کہ ثاقبہ کے میاں کو "نشانِ حوصلہ" سے نواز دوں گا۔

ثاقبہ سے میرا رابطہ ۱۹۸۴ء میں ہوا تھا۔



قلم قبیلہ کے بلاوے پر ادبی سیمینار میں شمولیت کے لیے میں کوئٹہ گیا۔ وہاں تین دن کے دوران ثاقبہ نے مہمان داری کے ایسے پھول کھلائے کہ سارا کوئٹہ ثاقبہ کی خوشبو سے بھر گیا۔

یہ دیکھ کر میرے ذہن کا توازن ہل گیا۔ نہیں نہیں یہ خاتون گورنر کی بیگم نہیں ہو سکتی۔ اور یہ گورنر کیسا گورنر ہے جسے اتنا بھی معلوم نہیں کہ گورن کیسے کرتے ہیں اور وہ کیسے گوارہ کرتا ہے کہ اس کی بیگم یوں مہمانوں کی خدمت کرتی پھرے جیسے بیاہ والے گھر کی "نائن" ہو۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا ایسا کبھی ہوا نہیں۔

اشفاق احمد میرے ساتھ تھا۔ اس نے مجھے بڑبڑاتے سنا تو کہنے لگا۔ ایسا کبھی ہوا نہیں کا مطلب۔

میں نے کہا یہ خاتون گورنر کی بیگم ہو سکتی ہے کیا۔

اشفاق بولا۔ ہوتی نہیں۔ مگر ہے۔ اور ہے کو ماننا پڑتا ہے۔

اشفاق کی عادت ہے کہ ایسے موقعہ پر صوفی بن کر بیٹھ جاتا ہے۔ میں نے کہا تو دیکھتا نہیں وہ کمرہ کمرہ گھوم رہی ہے۔ ہر مہمان کو پوچھ رہی ہے۔ ہماری ان کہی خواہشات کو پورا کر رہی ہے۔ اتنی ممتا۔ خالی خدمت ہی نہیں۔ ممتا بھری خدمت۔ دیکھنے میں ٹین ایجر نظر آتی ہے لیکن ممتا کے دھارے بہہ رہے ہیں۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ نہیں میں نہیں مانتا۔ اِٹ از ناٹ اِن دی فٹنس آف تھنگز۔ میں نہیں مانتا۔

کیوں نہیں مانتے۔ وہ بولا۔ وجہ۔

میں نے کہا بلاوجہ نہیں مانتا کر لو میرا کیا کرنا ہے۔

جب میں کوئٹہ سے واپس آیا تو نہ ماننے کے باوجود ثاقبہ کی خوشبو ساتھ لے آیا اور آج تک اس خوشبو نے میرے گھر کا گھیراؤ کر رکھا ہے۔

ثاقبہ کی شخصیت دریا کے مصداق ہے۔ اس میں خس و خاشاک ڈال دو۔ گوبر پھینک دو۔ شوشو کر دو۔ یہ دریا ناپاک نہیں ہوتا۔

ثاقبہ کی شخصیت کا بنیادی وصف یہی ہے کہ گردوپیش کے منفی اور تخریبی اثرات اس کا

دل میلا نہیں کر سکتے۔ ماحول کی تلخی، شدت، تشدد، غم و غصہ سے وہ آزردہ نہیں ہوتی۔ مایوس کیا، نا امید نہیں ہوتی۔

صاحبو آپ کے بارے میں تو مجھے علم نہیں اپنی کیفیت یہ ہے کہ شکوہ شکایت کی بات پر کان کچھ زیادہ کھل جاتا ہے۔ سکینڈل ہو تو ساتھ باچھیں بھی کھل جاتی ہیں۔ راہ چلتے جھگڑا فساد دیکھ کر پاؤں رُک جاتے ہیں۔ آنکھ میں چمک لہراتی ہے۔ سارا وجود تماش بین بن جاتا ہے۔ بندہ بشر کے لیے یہ چھوٹی چھوٹی عیاشیاں ہیں، عشرتیں ہیں۔ لیکن ثاقبہ ان معصوم لذتوں سے سراسر محروم ہے۔

میں نے دو ایک بار ثاقبہ کو سکینڈل سنانی چاہی۔ وہ ایک دم چپ ہو گئی۔ اس کی خاموشی بوجھل ہوتی گئی۔ دفعتاً میں نے محسوس کیا جیسے پتھر کے بُت سے مخاطب ہوں۔ میں رُک گیا۔

ثاقبہ نے موضوع بدل دیا۔ یوں میری بات بلیک آؤٹ ہو گئی۔

ایک دن میں ماحول کی تلخی کی بات کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ناخوشگوار اثرات نظر آئے۔ بولی کیا یہ ضروری ہے کہ ماحول کی ناخوشگوار باتوں کی طرف توجہ دی جائے۔ میں نے کہا توجہ دینا یا نہ دینا کیا اپنے بس کی بات ہے۔ ہاں وہ مسکرائی اپنے بس کی بات ہے۔

وہ کیسے۔ میں نے پوچھا۔

بولی میں نے بٹن لگا رکھے ہیں۔

بٹن لگا رکھے ہیں؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔ کیسے بٹن۔

بولی آن آف بٹن۔ ناخوشگوار بات ہو تو میں بٹن آف کر دیتی ہوں۔ اچھی بات ہو تو آن کر دیتی ہوں۔

میں نے کہا میں تو ایسے نہیں کر سکتا۔

بولی میرے اللہ نے یہ گفٹ مجھے دے رکھا ہے۔

اگر اللہ مجھے بھی کوئی ایسا بٹن عطا کر دیتا تو میں زندگی کے بہت سے جھمیلوں سے بچ جاتا۔ یقین جانئے اللہ کے ہاں بڑا فیورٹ ازم ہے۔

ثاقبہ کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے جیسے اللہ اس کے اندر چوکڑی مارے بیٹھا ہے۔



صوفی لوگ کہتے ہیں کہ اگر ایک بار اللہ کسی کے اندر چوکڑی مار کر بیٹھ جائے تو پھر نکلتا نہیں۔ کر لو جو کرنا ہے۔ نہ اسے علم نکال سکتا ہے، نہ عقل، نہ دلیل۔

ایک روز میں ڈی ایچ لارنس کی ایک نظم پڑھ رہا تھا عنوان تھا:

Out of the hands of God-a falling.

مَیں، اللہ کے ہاتھوں سے گر گیا ہوں گرا جا رہا ہوں گرے جا رہا ہوں۔

قدرت اللہ شہاب نے پوچھا کیا پڑھ رہے ہیں آپ۔

میں نے کہا، ڈی ایچ لارنس کی نظم ہے۔ کمال کی نظم ہے۔ قدرت نے وہ نظم پڑھی۔

بولا خوب نظم ہے۔ لیکن ---

لیکن کیا میں نے پوچھا۔

بولا۔ بات جھوٹی ہے۔

واہ یہ کیا بات ہوئی کہ نظم خوب ہے۔ بات جھوٹی ہے۔

بولا جو خود کو اللہ کے ہاتھ میں سونپ دے۔ پھر وہ گر نہیں سکتا۔ وہ گرنے دے بھی۔

معلوم ہوتا ہے ثاقبہ نے خود کو اللہ کو سونپ رکھا ہے۔

پچھلے دنوں کی بات ہے میں نے محفل میں ثاقبہ پر ایک مضمون پڑھا محفل ختم ہوئی تو دوست بولے۔ مفتی اپنے نام مربعے الاٹ کرانے کا ارادہ رکھتا ہے۔

صاحبو آپ سے کیا پردہ ہے میں نے یہ ارادہ بھی کر دیکھا۔ تمہید کے طور پر میں نے ثاقبہ سے ایک چھوٹی سی سفارش کے لیے کہا۔ وہ بولی میرے میاں اور میں نے باہمی معاہدہ کر رکھا ہے کہ ہم سفارش نہیں کریں گے۔

شیخ چلی کے سر سے مربعوں کی مٹکی گر کر چُور چُور ہو گئی۔

-☆-

# جلتا بجھتا

ابن انشا کی شخصیت جلتے بجھتے مٹی کے دیے کی مصداق تھی۔ بجھ جاتا تو گھپ اندھیرا چھا جاتا۔ جلتا تو بھورسماں بندھ جاتا۔

بنیادی طور پر وہ گھپ اندھیرا تھا۔ بجھ جاتا تو چہرہ ڈھلک جاتا۔ حسیات ساکت ہو جاتیں۔ بے تعلقی اور اکتاہٹ کے ڈھیر لگ جاتے۔ ایک بے نام دھندلکا چھا جاتا اور اس دھندلکے میں ایک فرد کھویا کھویا، اکیلا، گونگا۔

جلتا تو چہرہ مسکراہٹ سے منور ہو جاتا۔ اس مسکراہٹ میں مسرت کم خلوص زیادہ چھپا خلوص بے بسی بھرا، ٹوٹ بھرا، پرنم۔

شہرت پانے سے پہلے وہ اکثر و بیشتر بجھا رہتا تھا۔ شہرت پانے کے بعد بجھے رہنے کے دورانیے کم ہوتے گئے۔ مسکراہٹ میں چمک بڑھ گئی۔ گونگا بولنے لگا۔

لگتا تھا جیسے اس کی یادوں کے طاقچے میں کوئی پھنیر سانپ کنڈلی مارے بیٹھا ہے۔ ڈر کے مارے اس نے یادوں کا طاقچہ بند کر رکھا تھا۔ یادوں کی روشنی سے خود کو محفوظ کرنے کے لیے اَن جانے میں یا شاید مہا چالاکی سے خود پر گھپ اندھیرا طاری کر رکھا تھا۔

بڑا شاعر بنانے کے لیے قدرت کیا کیا جتن کرتی ہے۔

شیر محمد خان ۱۹۲۷ء میں پھلور کے قریب ایک گاؤں تھلہ میں رنگڑ راجپوت خاندان میں پیدا ہوا۔ باپ منشی خان ایک معمولی کسان تھا۔ تھوڑی سی زمین تھی۔ مشکل سے گزارہ ہوتا تھا۔ اس دلخراش حقیقت کو بھولنے کے لیے پنجابی میں شعر کہنے کا شغل اپنا رکھا تھا۔ اچھے شعر کہتا تھا۔ خوش گلو تھا۔ یوں گزر بسر ہو رہی تھی۔



شیر محمد کو بچپن میں بکریاں چرانا پڑیں۔ تعلیم حاصل کرنے کے امکانات بہت کم تھے۔ شوق باپ سے ورثہ میں پایا تھا۔ شوق کا یہ عالم تھا کہ آٹھویں جماعت میں ایک ہفتہ وار ادبی جریدہ شائع کرنا شروع کیا۔ یہ جریدہ آٹھ صفحات پر مشتمل ہوتا۔ شیر محمد خود ہی کاتب تھا خود ہی مدیر۔ سرکولیشن تو بہت تھی لیکن تعداد اشاعت صرف ایک تھی۔ ہاتھ سے لکھا جاتا۔ ہاتھوں ہاتھوں پڑھا جاتا۔

ابن انشا کا پہلا نام شیر محمد خان تھا۔ پھر اس کے ساتھ چودھری کا اضافہ ہوگیا۔ جب وہ جریدے کا مدیر بنا تو لازم تھا کہ اپنے نام کے ساتھ تخلص کا اضافہ کرے۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے اپنا نام چودھری شیر محمد خان مایوس صحرائی عدم آبادی رکھ لیا۔ دیر تک یہی نام چلتا رہا۔ پھر اسے احساس ہوا کہ یہ نام بہت لمبا ہے۔ اسے بدل کر قیصر صحرائی لکھنا شروع کر دیا۔ جوانی میں وہ پھر سے اپنے نام سے غیر مطمئن ہوگیا۔ اب کی بار اپنے والد منشی خان کے حوالے سے ابن انشا کا نام اپنا لیا۔

دسویں جماعت لدھیانہ سے جیسے تیسے پاس کی۔ لدھیانے میں اپنے جریدے کی وجہ سے ادیبوں اور ادب پسندوں سے راہ و رسم ہوگئی۔ ساحر لدھیانوی اور حمید اختر اس کے پرانے دوستوں میں سے ہیں۔

اس زمانے میں ترقی پسندی کی تحریک زوروں پر تھی۔ ترقی پسندوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا۔ لہٰذا ان جانے میں ابن انشا ترقی پسندانہ راہ پر چل نکلا۔ ابتدا میں اس نے طویل نظمیں لکھیں، ان نظموں میں بڑی جان تھی لیکن یہ دور ہنگامی ثابت ہوا۔ ابن انشا کی شاعری اس وقت جوبن پر آئی جب اس کے کلام میں ذات کا جوگ اُبھرا۔ دسویں پاس کرنے کے بعد کالج میں تعلیم حاصل کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ نوائے وقت کے حمید نظامی کے بلانے پر شوق ایڑ لگا کر اسے لاہور لے آیا۔ لاہور میں وہ بُری طرح سے دربدر ہوا۔ ٹیوشنیں پڑھائیں۔ اخباروں میں کام کیا۔ ٹھوکریں کھائیں۔ بڑی مشکل سے بی اے کیا۔ پھر دلی میں پوسا انسٹیٹیوٹ کے ایک رسالے میں نوکری مل گئی۔ وہاں دیوندر ستیارتھی سے میل ہوا۔

تقسیم کے وقت وہ دلی میں ریڈیو نیوز میں مترجم تھا۔ اس زمانے میں دِلّی ریڈیو سٹیشن

پر بڑے بڑے ادیبوں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ کرشن، منٹو، راشد، بیدی، مہندر، یوں ادیبوں سے میل جول بڑھا۔ پھر برصغیر کی تقسیم پر دِلّی سے لاہور اور لاہور سے کراچی پہنچا۔ کراچی ریڈیو نیوز میں چراغ حسن حسرت کے ساتھ کام کرتا رہا۔ وہاں اسامی تخفیف میں آ گئی تو احمد بشیر نے ولیج ایڈ میں پاک سرزمین کا ایڈیٹر بنا دیا۔

ابن انشا کی پہلی شادی بچپن ہی میں ہو گئی تھی۔ دلہن بڑی تھی، دولہا چھوٹا۔ جب اسے سہرے لگا کر بمبو کاٹ پر بٹھایا گیا تو ضد کرنے لگا کہ میں سیٹ پر نہیں بلکہ اس بانس پر بیٹھوں گا جس کے ساتھ گھوڑا جتا ہوا ہے اور بانس پر ہی بیٹھ کر سسرال گیا۔

پتہ نہیں کیوں یہ شادی اس کے ذہن میں ایک پھوڑے کی حیثیت رکھتی تھی۔ کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کرتا تھا۔ کوئی کرتا تو ذہن کا فیوز اڑ جاتا۔ اس شادی سے دو بچے ہوئے۔ ان کی کفالت ضرور کی لیکن انہیں دور رکھا۔ کبھی اپنایا نہیں۔ کسی سے ان کا تذکرہ نہیں کیا۔ پھر بیوی سے علیحدگی ہو گئی تو انشا نے یادوں کا طاقچہ ہمیشہ کے لیے مقفل کر دیا اور خود پر کھویا پن طاری کر لیا۔

۱۹۵۷ء میں مَیں پہلی بار انشا سے ولیج ایڈ کے دفتر میں ملا۔ احمد بشیر نے چکر چلایا اور ڈی ایف پی سے میری خدمات مستعار لے لیں۔ یوں میں بھی ولیج ایڈ کے دفتر میں منتقل ہو گیا۔

یہ دفتر صدر میں کیفے ٹیریا کے قریب ایک چھوٹی سی کوٹھی میں واقع تھا۔ دفتر میں صرف چار افسر تھے۔ حفیظ جالندھری ڈائریکٹر تھے۔ احمد بشیر ان کا نائب تھا۔ ابن انشا پاک سرزمین کا ایڈیٹر تھا اور میں فلم سکرپٹ افسر تھا۔ جسے حفیظ صاحب نے اپنا پی اے بنا رکھا تھا۔

پانچ دن میں حفیظ صاحب مجھے ایک ڈی او لکھوایا کرتے۔ پھر دس روز اسے پالش کرنے میں گزارتے۔ اس پر دن رات مسلسل سات آٹھ گھنٹے شدت سے محنت کرتے۔

یہ دفتر ہمارے لیے صرف دفتر ہی نہ تھا۔ ہمارا کلب تھا، تفریح گاہ تھا، کافی ہاؤس تھا، گھر تھا، اکھاڑہ تھا۔



اس دفتر میں ڈھائی سال مجھے انشا کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ وہاں میں نے پہلی مرتبہ اس جلتے بجھتے دیے کو دیکھا، دیر تک میں سوچتا رہا کہ یہ بجھتا کیوں ہے۔ پھر مجھے پتہ چلا کہ یہ تو ازلی طور پر بجھا ہوا ہے۔ پھر یہ حیرت دامنگیر ہوتی کہ اتنی گہری بجھن کے باوجود یہ جلتا کیسے ہے۔

کبھی سوچتا کہ یہ تو ایک کھلاڑی عورت کے مصداق ہے جو ایک ساعت آپ کی طرف یوں بیگانہ وار دیکھتی ہے جیسے آشنا نہ ہو۔ دوسری ساعت مسکرا کر آپ کی گود میں آ بیٹھتی ہے۔ کبھی محسوس کرتا بکارِ خویش ہشیار دیوانہ ہے۔ کبھی یوں لگتا جیسے قلندر ہے جو نفی اثبات کی منزل میں پھنسا ہوا ہے۔

کئی بار ایسا ہوا کہ دفتر کے باہر سڑک کی دوسری پٹڑی سے انشا نے مجھے آواز دی۔ ادھر آنا ضروری بات ہے۔ سڑک پار کر کے اُدھر گیا تو انشا کا نام و نشان نہ تھا اگلے روز دفتر میں پوچھا انشا تم نے مجھے بلایا تھا پھر چلے کیوں گئے تھے۔ بولا ''اچھا میں چلا گیا تھا کیا۔''

ایسی باتیں روز ہوتی تھیں۔ پوچھتا تو وہ حیرت سے میری طرف دیکھتا تھا۔ میں نے ایسے کیا تھا۔ اس کے انداز میں اتنی معصومیت ہوتی کہ مزید بات کرنے کی ہمت نہ پڑتی۔

کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ ابن انشا نے کام کرتے کرتے کوئی دوررس بات کہہ دی۔ میں نے کہا انشا، واہ کیا خوب بات کی تو نے۔ چونک کر بولا۔ کون سی۔ میں نے بات دہرائی حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ہنسا۔ ہائیں میں نے یہ بات کی تھی۔ مفتی جی کہیں آپ اپنی باتیں میرے منہ میں تو نہیں ڈال رہے۔

بڑی سے بڑی بات بھی انشا کو جذب نہیں کر سکتی تھی۔ آپ اسے قتل کی لرزہ خیز داستان سنائیں۔ ابتدا میں وہ شوق سے سنتا تھا پھر سوئچ آف کر کے بیٹھ جاتا۔ بظاہر ہاں ہاں کرتا رہتا۔ اس لحاظ سے وہ ایک کچھوے کی مصداق تھا۔ ہر چند ساعت کے بعد وہ اپنے خول میں دبک جانے پر مجبور تھا۔

رابطے کے اولین دور میں مَیں سمجھتا رہا کہ اس کے کھوئے اور اکیلے پن کو عشق سے تعلق ہے۔ اس کے عشق کے کوائف جان کر یہ مفروضہ بھی دم توڑ کر رہ گیا۔

انشا کی شخصیت کی طرح اس کا عشق بھی منفرد تھا۔ عام طور پر بڑے عاشق واپسی کی کشتیاں جلا دیتے ہیں۔ تاکہ میدان میں پیٹھ دکھانے کا خطرہ نہ رہے۔ انشا نے آگے بڑھنے کی کشتیوں کو بھی آگ لگا دی تھی تاکہ کہیں کامیابی کی صورت نہ پیدا ہو جائے۔ کہیں بیراگ کو چھوڑ کر محبوب کی طرف مائل نہ ہو جائے۔ کہیں وصال کی قیامت نہ ٹوٹ پڑے۔

احمد بشیر کا کہنا ہے کہ انشا نے بڑی سوچ بچار سے عشق لگایا تھا۔ ایسی محبوبہ کا چناؤ کیا تھا جو پہلے ہی کسی اور کی ہو چکی تھی۔ شادی شدہ تھی بچوں والی تھی۔ جس کے دل میں انشا کے لیے جذبہ ہمدردی پیدا ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔ جس سے ملنے کے تمام راستے مسدود تھے۔ اپنے عشق کو پورے طور پر محفوظ کر لینے کے بعد اس نے عشق کے ساز پر بیراگ کا نغمہ چھیڑ دیا۔

مواقع تو ملے لیکن انشا نے کبھی محبوبہ سے بات نہ کی۔ ہمت نہ پڑی۔ اکثر اپنے دوستوں سے کہا کرتا۔۔۔ ”یار اُسے کہہ کہ مجھ سے بات کرے۔“ اس کے انداز میں بڑی منت اور عاجزی ہوتی پھر عاشق کا جلال جاگتا۔۔۔ کہتا۔۔۔ ”دیکھ اس سے اپنی بات نہ چھیڑنا۔ باتوں باتوں میں بھرمانہ لینا۔“

محبوبہ تیز طرار تھی۔ دنیا دار تھی۔ پہلے تو تمسخر اڑاتی رہی، پھر انشا کی دیوانگی کو کام میں لانے کا منصوبہ باندھا۔ اس دلچسپ مشغلے میں میاں بھی شریک ہو گیا۔ انشا کو فرمائشیں موصول ہونے لگیں۔ اس پر انشا پھولے نہ سماتا۔ دوستوں نے اسے بار بار سمجھایا کہ انشا وہ تجھے بنا رہی ہے۔ انشا جواب میں کہتا کتنی خوشی کی بات ہے کہ بنا تو رہی ہے۔ یہ بھی تو ایک تعلق ہے۔ تم مجھے اس تعلق سے محروم کیوں کر رہے ہو۔

ایک روز جب وہ فرمائش پوری کرنے کے لیے شاپنگ کرنے گیا تو اتفاق سے میں بھی ساتھ تھا۔ میں نے انشا کی منتیں کیں انشا جی اتنی قیمتی چیز نہ خریدو۔ تمہاری ساری تنخواہ لگ جائے گی۔

انشا بولا مفتی جی۔ تمہیں پتہ نہیں اس نے مجھے کیا کیا دیا ہے۔ اس نے مجھے شاعر بنا دیا۔ شہرت دی، زندگی دی۔ انشا کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔



ایک روز میں نے احمد بشیر سے پوچھا یار یہ انشا جو اپنے اندر ایک تابوت اٹھائے پھرتا ہے یہ عشق سے متعلق نہیں تو کیا پہلی شادی سے متعلق ہے۔ احمد بشیر بولا مجھے علم نہیں۔ شاید پہلی شادی سے متعلق ہو۔ مثلاً انشا کے لیے لاہور ایک پھوڑا ہے۔ وہ لاہور کی بات نہیں کرتا۔ لاہور کی بات کرو تو اٹھ کر چلا جائے گا۔

کیوں لاہور کو کیا ہے میں نے پوچھا۔

شاید اس لیے کہ اس کی مطلقہ بیوی لاہور میں رہتی ہے۔

میں نے کہا یار اسے لاہور بھیجو۔ سرکاری حکم دو تاکہ ٹال نہ سکے۔

اگلے روز ہی وزارت کی طرف سے حکم موصول ہو گیا کہ انشا فلاں کام کے لیے لاہور جائے۔

انشا اس حکم کو دیکھ کر سخت گھبرا گیا۔ سارا دن حکم نامے کو سامنے رکھ کر بیٹھا رہا۔ شام کو کہنے لگا۔ لو لاہور ہی جانا ہے نا۔ تو ہو آؤں گا لاہور سے۔ اس میں کیا مشکل ہے بھلا۔

اگلے روز احمد بشیر اور میں اسے سٹیشن پر چھوڑنے گئے۔ گاڑی روانہ ہو گئی تو میں نے احمد بشیر سے کہا تُو تو کہتا تھا یہ لاہور نہیں جائے گا۔

حیرت کی بات ہے۔ احمد بشیر نے جواب دیا۔

اگلے روز جب ہم دفتر میں بیٹھے تھے تو دفعتاً ابن انشا داخل ہوا۔ ہم نے کہا یار تُو تو لاہور گیا تھا۔

بولا میں بھی کل سے یہی سوچ رہا ہوں۔ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ یہاں سے گاڑی چلی تو میں پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ گاڑی رُکی تو اتر کر میں نے چائے پی سگریٹ خریدے۔ پھر گاڑی میں آ بیٹھا پڑھنے لگا۔ پھر جو دیکھا تو گاڑی کراچی کے اسٹیشن پر کھڑی ہے۔ مجھے تو خود سمجھ میں نہیں آ رہا کہ گاڑی کراچی سے چل کر پھر سے کراچی کیسے پہنچ گئی۔

ان دنوں ابن انشا میں خودکشی کا رجحان بڑی شدت پر تھا۔ یہ رجحان موروثی تھا۔ درحقیقت اسے زندگی سے محبت تھی۔ موت کا ڈر اتنی شدت سے غالب تھا کہ کبھی کبھی اس

کے اعصاب پر سوار ہو جاتا جس سے گلوخلاصی کے لیے وہ جذبہ خودکشی کا سہارا لیتا تھا۔ ہر چھ ماہ یا سال کے بعد اسے شدت کا دورہ پڑتا تھا۔

احمد بشیر کو پتہ چلا تو اس نے بڑا ہمدردانہ انداز اختیار کیا۔ کہنے لگا انشا یہ تو معمولی بات ہے فنکاروں اور ادیبوں کو ایسے دورے پڑا ہی کرتے ہیں۔ اگر تم اپنی زندگی ختم کرنا چاہتے ہو تو کوئی مضائقہ نہیں ہاں ایک بات ضروری ہے خودکشی ایسے انداز سے کرنی چاہیے کہ ایک تو خود کو تکلیف نہ ہو دوسرے پولیس والے گھر والوں کو تنگ نہ کریں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بدنامی نہ ہو، جگ ہنسائی نہ ہو۔

انشا کو آخری دلیل بہت پسند آئی چونکہ وہ بدنامی اور جگ ہنسائی سے، بہت خائف تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ احمد بشیر نے انشا سے وعدہ لے لیا کہ جب بھی دورہ پڑا وہ احمد بشیر سے مشورہ کیے بغیر کچھ نہیں کرے گا۔

اس کے بعد چار ایک بار آدھی رات کے وقت احمد بشیر کے گھر کا دروازہ بجا۔ باہر انشا کھڑا تھا۔ اوسان خطا، ازخود رفتہ۔

احمد بشیر اس کے ساتھ باہر نکل جاتا۔ اور وہ دونوں رات بھر کراچی کی سڑکوں پر گھومتے ہوئے خودکشی کا منصوبہ تیار کرتے رہتے۔

احمد بشیر کہتا۔ سلیپنگ پلز اُونہوں۔ یہ سخت نامناسب طریقہ ہے۔ ہسپتال لے جاتے ہیں بچ جانے کا امکان ہوتا ہے۔ بچ جاؤ تو بڑا شور شرابا ہوتا ہے۔ افیون سخت تکلیف دہ چیز ہے۔ پھر سوچنا یہ ہے کہ پولیس کے نام کیسا خط لکھا جائے کہ گھر والے ملوث نہ ہوں۔

یوں احمد بشیر بولے جاتا بولے جاتا حتیٰ کہ پوہ پھوٹ جاتی اور دورے کی شدت ختم ہو جاتی۔

انہی دنوں ابن انشا قدرت اللہ شہاب سے متعارف ہوا۔ قدرت اللہ کی شخصیت سے وہ بہت متاثر ہوا۔ یہ تعلق اتنا بڑھا کہ آخری دور میں دوسرے تمام تعلقات مدھم پڑ گئے۔

انہی دنوں اس کی مصروفیات میں اضافہ ہو گیا۔ حلقہ احباب میں عالی اور گلڈ شامل ہو گئے۔ پھر مرکزی حکومت راولپنڈی میں منتقل ہو گئی تو اس نے قدرت اللہ کو خط لکھنے شروع کر دیئے۔ یہ خط رنگینی روانی اور مزاح سے بھرپور ہوتے تھے۔

ایک دن شہاب نے کہا انشا آپ مزاح کیوں نہیں لکھتے۔ اس پر بہت ہنسا بولا شہاب صاحب اب آپ مجھ سے مزاح لکھوائیں گے۔ کئی ایک سال وہ ہمارے مشوروں کو مذاق سمجھتا رہا، پھر پتہ نہیں کیسے اس نے اپنا پہلا کالم لکھا۔ ایک پھلجھڑی سی چل گئی۔ انشا اچنبھے میں رہ گیا۔

وہ منفرد سادھو شاعر جس نے کبھی اپنا کلام دوسروں کو نہ سنایا تھا جس کے پاس گھنٹوں بیٹھ کر بھی آپ کو پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ شاعر ہے۔ دوستوں سے پوچھتا پھرتا آج آپ نے اخبار نہیں پڑھا کیا۔ جیب سے اخبار خرید کر احباب میں بانٹتا پھرتا۔ دفتر میں ملاقاتیوں کے سامنے اپنے کالموں کے تراشوں کی فائل رکھ کر معذرت کرتا۔ آپ اجازت دیں تو میں ایک ضروری نوٹ لکھ لوں جب تک آپ یہ فائل پڑھیں۔ وقت کٹی کے لیے وہ ابن انشا جو جواہرات کو اپنے چیتھڑوں میں چھپائے رکھتا تھا ٹیڈی پیسوں کو کھنکھنانے لگا۔

اگرچہ شہرت نے ابن انشا پر شدت سے اثر کیا لیکن بنیادی طور پر انشا وہی انشا رہا۔ ہاں ضمنی طور پر اس میں بڑی تبدیلیاں عمل میں آئیں۔

شہرت نے اسے بیساکھیاں عطا کر دیں۔ لنگڑا چلنے لگا۔ اس کی بے بسی بھری مسکراہٹ میں دم خم پیدا ہو گیا۔ خود اعتمادی نے گرتے کو سنبھال لیا۔ لیکن مکلّف قمیض اور یونیسکو سوٹ تلے وہی جٹا دھاری سادھو براجمان رہا۔ اس کے بجھنے کے تواتر میں تخفیف تو ہو گئی لیکن بجھن جوں کی توں قائم رہی۔ البتہ وہ عشق کی گھٹن سے آزاد ہو گیا اور محبوبہ کی ذات سے بے نیاز۔ انہی دنوں ابن انشا نے لاہور بیریر کو پار کر لیا۔

جب ولیج ایڈ کا محکمہ تخفیف میں آنے لگا تو انشا، قدرت اللہ سے کہنے لگا۔ شہاب صاحب زندگی میں میری صرف ایک آرزو ہے اگر آپ اُسے پورا کر دیں تو موج ہو جائے۔ کونسی شہاب نے پوچھا؟

انشا نے جیب سے کچھ کاغذات نکالے کہنے لگا یہ دیکھئے یونیسکو کے پلان کے مطابق پاکستان میں ایک نیشنل بک سنٹر بننے والا ہے۔ مجھے اس کا ڈائریکٹر بنا دیجیے۔

شہاب نے کہا یہ نوکری تو بالکل معمولی ہوگی۔

مجھے معمولی ہی چاہیے۔

اس میں ترقی کی گنجائش نہ ہوگی۔ شہاب نے کہا۔

مجھے ترقی نہیں چاہیے۔ قیام چاہیے انشا نے جواب دیا۔

یہ بھی پتہ نہیں شاید یہ محکمہ پانچ سال کے بعد قائم ہو، چاہے دس سال بعد قائم ہو، شہاب نے کہا۔

میں انتظار کروں گا۔ نیشنل بک سنٹر کے قیام کے بعد انشا کو ملک ملک گھومنا پڑا۔ کتاب کے متعلق عالمی کانفرنسوں میں شمولیت کرنی پڑی۔ اس کی کارکردگی دیکھ کر یونیسکو نے انشا کو ایک آسامی آفر کر دی جس کی تنخواہ اس کی تنخواہ سے بیس گنا زیادہ تھی۔ انشا نے یونیسکو کی آسامی کو رد کر دیا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ انکار کی وجہ کیا ہے تو انشا نے کہا میں پاکستان کی نوکری چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ اسے پاکستان سے عشق تھا۔

انشا کو شاپنگ کا بہت شوق تھا۔ گھنٹوں دکانوں میں گھومتا پھرتا۔ کوئی پوچھتا انشا جی کیا خریدنے کے ارادے ہیں تو کہتا یہی میں سوچ رہا ہوں۔ انشا کی محبوب ترین دکانیں کھلونوں کی دکانیں تھیں۔ گھنٹوں کھلونے دیکھنے کے بہانے ان سے کھیلتا رہتا اور آخر میں ایک گڑیا خرید کر گھر لے آتا۔ بیرونی ممالک میں جہاں بھی گیا وہاں سے کبھی کوئی کام کی چیز نہ خریدی لیکن ہر ملک سے ایک گڑیا ضرور خریدی۔

گھر میں ایک بڑی الماری ان گڑیوں کے لیے مخصوص تھی۔ یہ الماری ملک ملک کی رنگارنگ گڑیوں سے بھری ہوئی تھی۔ پتہ نہیں یہ گڑیاں وہ کس کے لیے خرید کر لاتا تھا۔ گھر میں دولڑکے ضرور تھے انہیں گڈیوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

ایک روز مجھ سے کہنے لگا مفتی جی کوئی مصروفیت نہ ہو تو میرے ساتھ چلو مجھے بہت ضروری شاپنگ کرنی ہے۔

آج کل یہ رواج عام ہے کہ لوگ کسی نہ کسی کو شاپنگ کے لیے ساتھ لے جاتے ہیں۔ تاکہ چیز خریدنے کا فیصلہ کرنے میں مدد دے۔ میں سمجھا شاید اسی وجہ سے انشا مجھے ساتھ لے



جا رہا ہے۔ دکان میں داخل ہونے سے پہلے وہ مسکرا کر کہنے لگا مفتی جی شاپنگ میں میری مدد کرنا۔۔۔ خریدنے میں نہیں بلکہ نہ خریدنے میں۔ اس پر میں بہت حیران ہوا۔ بہر حال دو گھنٹے ہم دکانوں میں گھومتے رہے۔ انشا چیزیں پسند کرتا رہا اور میں ان میں عیب نکالتا رہا۔

آخری دکان میں انشا کو ایک نکٹائی پسند آ گئی میں نے حسب معاہدہ نکٹائی میں نقص نکالنے شروع کر دیئے جب دکاندار کاؤنٹر کی طرف گیا تو انشا نے منت سے کہا مفتی جی ایک نکٹائی تو خرید لینے دو۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

ایک روز انشا بہت پریشان تھا۔ میں نے پوچھا کیا بات ہے۔ بولا بس حسب عادت پریشان ہوں تحقیق کے بعد مشکل سے پتہ چلا کہ احمد بشیر سے ملنے گیا تھا۔ احمد بشیر سخت مالی مشکلات میں مبتلا تھا۔ دروازے پر مالک مکان کرایے کے لیے تقاضہ کر رہا تھا۔ انشا نے دو ماہ کا کرایہ ادا کر دیا اور احمد بشیر سے ملے بغیر لوٹ آیا۔

اب اسے یہ فکر دامن گیر تھا کہ کہیں مالک مکان دوبارہ کرایہ وصول نہ کر لے۔ اسے یہ بھی گوارہ نہ تھا کہ دوست کو یہ علم ہو کہ انشا نے کرایہ ادا کر دیا ہے۔

بات نہ کہنے میں انشا کو کمال حاصل تھا۔ اس کے قریبی دوست بھی اس کی ذاتی زندگی کے بہت سے پہلوؤں سے واقف نہ تھے۔ مثلاً روزنامہ امروز کا بیان ہے، دروغ برگردن راوی، کہ انشا نے ایم اے کرنے کے بعد کراچی یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری حاصل کی تھی لیکن اس نے اس تفصیل کے متعلق کبھی تذکرہ نہ کیا۔ نہ خود کو ڈاکٹر سمجھا۔

ابن انشا کی باتیں دانشورانہ باتوں سے مختلف ہوتی تھیں۔ ان میں عقل دلیل یا ذہانت کی چمک نہ ہوتی تھی۔ وہ ذہن سے نہیں بلکہ دل سے پھوٹتی تھیں۔ چینی کی رکابی میں رکھ کر پیش نہیں کی جاتی تھیں۔ چمکیلی باتیں کرنے سے انشا محروم تھا۔ چمکدار بات کو بھی مٹی میں رول دیتا۔ اس کے منہ سے نئی بات بھی یوں سنائی دیتی جیسے دقیانوسی ہو۔ منہ زبانی ٹھس تھا۔ تحریر میں چمکتا تھا۔

کہتے ہیں بن انشا بہت بڑا کالمسٹ تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی تحریریں کالم میں چھپی تھیں۔ لیکن وہ کالمسٹ نہیں تھا بلکہ مزاح نگار تھا۔ کالم نویس کے لیے لازم ہے کہ اسے

سیاسی شعور حاصل ہوا اور اس کی طنز میں کاٹ ہو۔ انشا میں نہ تو سیاسی شعور تھا نہ اس کے طنز میں کاٹ تھی۔ بڑی سے بڑی طنز ایسے لطیف انداز میں لکھتا کہ لطافت محسوس ہوتی، کاٹ نہیں۔ انشا کے مزاج میں سادگی تھی روانی تھی۔ فکر نہ تھا۔ مٹی کے تیل کی بو نہ آتی تھی۔

انشا کو سمجھانا، دلیل دینا، بحث کرنا، وقت ضائع کرنے کے مترادف تھا۔ اسے بدلنا ممکن نہ تھا۔ اس پر اثر انداز ہونا ناممکن۔ اس کے برتاؤ کے خلاف احتجاج کرنا یا اس سے روٹھنا بے معنی تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرنا لاحاصل تھا۔

آپ ایک حد تک اس کے قریب جا سکتے تھے۔ اس کے بعد دھندلکے کی دیوار حائل ہو جاتی۔ اس دیوار میں کوئی دروازہ نہ تھا۔ جس سے آپ داخل ہو سکتے۔ خود انشا کو علم نہ تھا کہ اس دھندلکے کی دیوار کے پیچھے کیا ہے۔

ایک حد تک آپ انشا کی توجہ جذب کر سکتے تھے چونکہ وہ زیادہ دیر اپنے خول سے باہر نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ ازلی طور پر اکیلا تھا۔ گونگا اور دکھی۔ آخری ایام میں جب اسے پتہ چلا کہ وہ ہاجسن کی بیماری میں مبتلا ہے تو ایک دم اپنی زندگی سے مایوس ہو گیا۔ اس حد تک کہ اس نے خطوں میں غزلوں میں اور کہیں کہیں کالم میں "حافظ خدا ہمارا" قسم کے مضمون باندھنے شروع کر دیئے۔ اس پر اس کے قریبی دوست آگے بڑھے تاکہ انشا میں زندگی کے متعلق بھروسہ پیدا کریں۔ بڑی مشکل سے انہوں نے انشا کے دل سے موت کی "پری آکوپیشن" دور کی۔ شہاب اس عمل میں پیش پیش تھا۔

پھر ڈاکٹر اجمل اور قدرت اللہ شہاب نے کوشش کر کے انشا کا تبادلہ لندن کرا دیا جہاں ہاجسن ڈیزیز کا واحد ہسپتال ہے۔

ہسپتال میں انشا نے علاج کی پہلی قسط پوری کر لی۔ اس کی صحت اس حد تک بحال ہو گئی کہ پھر سے جینے کے پروگرام مرتب ہونے لگے۔

پھر انکوائری کمیٹی نے اس کی اسامی کو تخفیف میں لا کر اسے وطن واپس آنے کا حکم دیا۔

یہ حکم ایسے بھونڈے انداز سے دیا گیا کہ انشا کو شدید جھٹکا لگا۔



اگرچہ شہاب نے مل ملا کر اسے علاج مکمل کر لینے کی مہلت لے دی لیکن اس کی صحت پھر سے بحال نہ ہو سکی۔ ذہن پر اس قدر شدید چوٹ لگی کہ مفلوج ہو گیا۔ نو روز ہسپتال میں گہری بے ہوشی میں پڑا رہا۔ دسویں روز انتقال کر گیا۔

آج سے کئی ایک سال پہلے میرے پبلشر نے ایک منصوبہ بنایا تھا کہ مشہور ادیبوں کی آپ بیتیاں پیش کی جائیں۔ اس سلسلے میں، میں نے انشا کو لکھا کہ اپنی آپ بیتی لکھے۔ ابن انشا نے اپنی شخصیت کے متعلق جو مضمون لکھا وہ حرف بحرف درج ذیل ہے۔

"تم نے جو سکیچ مانگا ہے اس کی نوعیت معلوم نہیں ہوئی۔ اگر تھرڈ پرسن میں چاہیے تو میں کیوں لکھوں۔ تم خود کیوں نہ لکھو۔ لیکن نہیں میاں تمہارا کیا اعتبار کہ کیا لکھ دو۔ لہٰذا اپنی عزت اپنے ہاتھ میں ہے۔ چند سطریں لکھ رہا ہوں انہیں گھٹا بڑھا لو۔"

مشرقی پنجاب کے دوآبے کا دہقانی کہیں بھی پہنچ جائے لاہور، کراچی، لندن، کیلی فورنیا اپنی ادا سے فوراً پہچانا جاتا ہے۔ یہ لوگ لکھتے بھی ہیں تو وارث شاہ کے استاد کے بقول مونج کی رسی میں موتی پروتے ہیں لیکن ابن انشا کو موتی چنداں نہیں بھاتے۔ اپنی مونج کی رسی میں وہ کاٹھ کے منکے پروتا ہے۔ اس کا محاورہ لہجہ دلی لکھنؤ ہر جگہ کی سکہ بندی سے دور ہے اور سچ پوچھو تو یہی ایک سلیقے کی بات اس نے کی ہے۔ ورنہ ادب کے بازار میں جس کی تعریف پوچھو، اپنے کو فلاں ابن فلاں اور موتیوں کا خاندانی سوداگر بتاتا ہے۔

ابن انشا کو بارہا اللہ کا شکر ادا کرتے دیکھا گیا ہے کہ اس کے خاندان میں کوئی صاحب دیوان یا بے دیوان شاعر نہیں ہوا۔ ورنہ اسے یا تو اس کے نام کا سہارا لینا پڑتا اور یا اس کی وجہ سے شرمندہ ہونا پڑتا۔

سیّد انشا اللہ خان انشا سے بھی اس کی نسبی نسبت نہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہے۔ اور خطوں میں اسے سید ابن انشا تک لکھتے ہیں۔ یہ چاہتا تو اس نسبت سے سیّد بن سکتا تھا لیکن عزت سادات بھی اسے کبھی مرغوب نہیں ہوئی۔ اپنی دہقانیت پر خوش ہے اور اللہ اسے اسی میں خوش رکھے۔

پڑھائی کو دیکھئے تو اس نے اعلیٰ تعلیم پائی ہے۔ تجربے کو دیکھئے تو بڑے پاپڑ بیلے ہیں

اور ایران، توران بلکہ فرنگستان تک گھوما ہے۔ مطالعہ میں اُردو، پنجابی اور انگریزی سے باہر فارسی اور ہندی سے بھی شغف ہے۔ نظم نثر سبھی میں قلم آزمائی کی ہے لیکن اپنے لیے باعث عزت فقط شاعری کو سمجھتا ہے۔ شاعری جس میں جوگی کا فقر، طنطنہ، وارفتگی اور آزادگی ہے۔

بات چیت کیجیے تو بعض اوقات بقراطیت بھی چھانٹے گا۔ لیکن اصل میں بقراطوں سے نفور ہے۔ فقط انشاہی ہے بقول خود:

شاعر ہے تو ادنیٰ ہے عاشق ہے تو رسوا ہے
کس بات میں اچھا ہے کس وصف میں اعلیٰ ہے

بچوں کے لیے بھی شاعری کی ہے۔ لیکن ایسی نظمیں تو بچے بھی لکھ سکتے ہیں۔ یا شاید بچے ہی لکھ سکتے ہیں۔ نثر لکھنے کا انداز شگفتہ ہے جسے مزاح لطیف بھی کہتے ہیں لیکن اس ذیل میں کم لکھتا ہے حالانکہ اس کا میدان یہی ہوتا تو خوب ہوتا۔

خاموش ہے، عزلت گزیں ہے، بھلکڑ ہے، ذمہ داریاں قبول نہیں کرتا تاکہ نبھانی نہ پڑیں۔ فخر اپنے دوستوں پر کرتا ہے جو اس پر یا اس کی سادگی بھولپن یا حمق پر جان چھڑکتے ہیں اور ناز اٹھاتے ہیں۔

عشق بھی کرتا ہے جو لوگ سمجھتے ہیں کہ میاں قیس کے انتقال کے ساتھ یہ قوم ناپید ہوگئی ہے وہ اس سے ملیں۔ یہ ہماری نہیں ابن انشا کی اپنی فرمائش ہے:

انشا سے ملو اس سے نہ روکیں گے ولیکن
اس سے یہ ملاقات نکالی ہے کہاں کی!
مشہور ہے ہر بزم میں اس شخص کا سودا
باتیں ہیں بہت شہر میں بدنام میاں کی

☆۔



۱۹۸۹ء

# چومکھیہ

صاحبو میں ناقد نہیں ہوں۔ الحمدللہ کہ نہیں ہوں۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں عار نہیں ہے کہ میں تخلیقی تنقید کی صلاحیت نہیں رکھتا اور رسمی تنقید کا عصا اٹھانا مجھے گوارا نہیں۔ اس لیے میں الطاف گوہر کی کتاب پر بات نہیں کروں گا۔ صرف اس کی شخصیت پر بات کروں گا۔ آپ سے سچ سچ کہہ دوں تو کیا حرج ہے کہ میں اس کی شخصیت کے متعلق بات کرنے کا بھی حق نہیں رکھتا اس لیے کہ مجھے اس کی قربت میں رہنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ دور سے ہی دیکھتا رہا ہوں لیکن الطاف گوہر ان لوگوں میں سے ہے جو دور سے بھی دِکھتے ہیں، یہی اس کی بدقسمتی ہے۔

اگرچہ الطاف گوہر کو دیکھنے کی خوبی عطا ہوئی ہے لیکن دیکھنے کی صلاحیت سے نوازا نہیں گیا۔ آپ کہیں گے میاں اگر تو اس کی کتاب پر بات نہیں کر سکتا اس کی شخصیت سے واقف نہیں تو پھر کس منہ سے بات کرنے کے لیے روسٹرم پر آ کھڑا ہوا ہے۔ تو جناب والا اس کی وجہ یہ ہے کہ میں الطاف گوہر کا پرانا مداح ہوں اور مجھے یہ گوارا نہیں کہ اس محفل میں شمولیت سے محروم رہوں۔

میری دانست میں الطاف گوہر کا المیہ یہ ہے کہ اللہ نے اسے بہت سی صلاحیتیں عطا کر دیں۔ صلاحیتوں کے چوراہے میں کھڑا کھڑا وہ کنفیوز ہو گیا ادھر جاؤں۔ اُدھر جاؤں۔ کدھر جاؤں نتیجہ۔۔۔ کہاں کا دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا۔

بے شک الطاف گوہر نے اپنی قابلیت کا لوہا منوایا۔ پاکستان کی سطح پر خود کو منوایا۔ بین الاقوامی سطح پر اپنی دھاک بٹھائی۔ نام پیدا کیا۔ مقام پیدا کیا۔ سب کچھ پایا لیکن اپنوں سے

سکھ نہ پایا، سکون کی دولت سے محروم رہا۔ سب کچھ پا کر کھو دیا۔ بے قدری بڑی ظالم ہوتی ہے۔

دوستو، آپس کی بات ہے یہ تو ہوگا۔ جہاں آگ ہوگی وہاں دھواں تو ہوگا۔ ایسا تو ہوتا ہی ہے۔ کیوں ہوتا ہے۔ پتہ نہیں۔ پر ہوتا ہے۔ صلاحیتوں کی دیوالی بجی ہو تو لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ آنکھوں میں رڑک پیدا ہوتی ہے۔ دلوں میں کانٹا لگ جاتا ہے۔ حسد کا دھواں اٹھتا ہے۔ ''بجھا دو'' کی سرگوشی اُبھرتی ہے۔

ماننا ہی پڑتا ہے کہ ابھی تک ہم نے دوسروں کی خوبیوں کا اعتراف کرنا نہیں سیکھا۔ یہاں تک کہ Give the devil his due کے بھی روادار نہیں ہیں۔

ساری شرارت ارسطو کی ہے جس نے سوچے سمجھے بغیر اعلان کر دیا کہ Man is a rational animal کچے سیب کو گمان ہو گیا کہ میں رس سے بھرا ہوا۔ اس خوشی میں وہ پھولے نہ سمایا ڈال سے ٹوٹ کر زمین پر گر گیا۔ ارسطو کا یہ جھوٹ آج بھی ہمارے دانشوروں کے سر پر چڑھ کر بول رہا ہے کیسے نہ بولے۔ خوش کن جھوٹ میٹھا ہوتا ہے اسے آخ تھو کون کرے۔

سچی بات یہ ہے کہ انسان اپنی سفید قمیض اور سٹف کالر کے باوجود ایک جذباتی حیوان ہے۔ شرف صرف یہ ہے کہ کبھی کبھار عقل کا آنا جانا رہتا ہے۔ وہ منکوحہ نہیں ہے۔ ساتھ نہیں رہتی کبھی کبھی آ جاتی ہے جھوٹی تسلیاں دے جاتی ہے۔

الطاف گوہر نے بھی دنیا کا جی جلانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ فنانس میں اپنا لوہا منوایا۔ انتظامیہ کر دکھا! صحافت میں لشکارے مارے۔ ادب میں دیئے جلائے۔ سیاست کو ڈرائی کلین کرنے کی جسارت کر دکھائی۔ تحریر کا جادو جگایا۔ تقریر میں خود کو منوایا۔ دیس میں رہنے والے بیگانوں میں اپنائیت کا احساس بیدار کیا۔ شورشی قیدی کو اپنی ذمہ داری پر تین دن کے لیے ناجائز رہائی دے کر پابند اخلاق کر دکھایا۔

صاحبو! الطاف گوہر بہت بڑا جواری ہے اس نے زندگی میں انسانی ہمدردی اور وطن دوستی کے حوالے سے بڑے بڑے جوئے کھیلے۔ اس نے ساری زندگی Aught کو مدنظر رکھ



کر گزاری اور is کا مذاق اڑایا۔ مسلسل is کو نظر انداز کرتا رہا۔ جناب والا is بہت بڑا آمر ہے بے رحم ہے انتقام لیتا ہے۔ حیرت ہے کہ الطاف گوہر اتنے سال بیوروکریسی کے میڈیا کروں میں عزت کی زندگی گزارنے میں کیسے کامیاب ہو گیا۔

الطاف گوہر کو تو بہت پہلے نوکری سے برخواست ہو جانا چاہیے تھا۔

دستور ہے کہ جن کی ذہانت جگنو کی طرح لشکارے مارتی ہے اور اس کے شعلے کے گرد ذہانت اور حس کا ہالا بنا ہوتا ہے، وہ بجھا دیئے جاتے ہیں۔ الطاف گوہر اتنا بڑا دانشور ہے لیکن اس کی سمجھ میں اتنی سی بات نہیں آئی۔ یہ بات ہمارے کسی دانشور کی سمجھ میں نہیں آتی۔ کہ صرف میڈیا کر حکمرانی کرتے ہیں۔ راج کرے گا خالصہ۔

جناب والا صرف اسلام وہ مذہب ہے جس نے اس حقیقت کی نشاندہی کی ہے کہا لوگو بین بین جیو لیکن یہ انکشاف ایسی زیر لبی میں کیا گیا کہ بات ہم تک نہیں پہنچی۔ بے شک Intelligence اور Sensitivity اللہ کے دو بہت بڑے تحفے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی وہ استروں کی مالائیں بھی ہیں۔ ان مالاؤں کو دکھاؤ نہیں چھپائے رکھو۔ اس دنیا میں سکھ چاہتے ہو تو میڈیا کر کا بھیس بنائے رکھو۔ وہ فرد واحد جس کو ساری دنیا عظیم ترین انسان تسلیم کر چکی ہے اس کے گلے میں پتہ نہیں کتنی استروں کی مالائیں تھیں Super Intelligence اور Super Sensitivity پتہ نہیں کیا کیا لیکن اس نے میڈیا کر زندگی بیت کر دکھا دی یہ کتنا بڑا معجزہ ہے۔

بھٹو کے ساتھ ایسا کیوں ہوا جیسا کہ ہوا اس لیے کہ اس کی ذہانت لپٹیں مارتی تھی۔ آنکھیں چندھیاتی تھیں۔ اللہ کرے محترمہ اس بات کو پلے باندھ لے۔

میں مانتا ہوں الطاف گوہر میں تفاخر نہیں ہے اس نے کبھی التزاماً اپنی صلاحیتوں کی نمائش نہیں کی، لیکن ماننا پڑتا ہے کہ اندر قابلیت کی کنی ہو تو وہ رڑکتی رہتی ہے۔ پھر اس کا کیا کیا جائے کہ صلاحیتیں اس کے چہرے پر دھرنا مار کر بیٹھی ہیں۔ دور سے دکھتی ہیں۔ آج بھی دکھتی ہیں۔

الطاف گوہر میں ایک جھجک [illegible]

ہے۔ شاید بچپن میں ماحول کی تلخی نے پیدا کی ہو یا ازلی دین ہو۔ عجز اللہ کی بہت بڑی دین ہے۔ عجز ایک جاذب شے ہے جو قابلیت کی تلخیوں کو جذب کر لیتا ہے۔ عجز بہت بڑا ٹرانکولائزر ہے۔ دوستو میں نے اپنی ۸۳ سالہ زندگی میں تین ٹرانکولائزر پائے ہیں۔ دہی، درود شریف اور عجز۔

میری دانست میں الطاف گوہر سے ایک بھول ہوگئی۔ اس وقت جب وہ صلاحیتوں کے چوراہے میں سوچ رہا تھا کہ کدھر جاؤں بدقسمتی سے وہ اس راستے پر چل نکلا جہاں قابلیت لوگوں کو چبھتی ہے۔ انفرادیت شاک کرتی ہے جہاں روٹین کا راج ہے جہاں "میں" واحد مرکز ہے۔ میں، میں، میں۔

الطاف گوہر کو علم و ادب کا راستہ اپنانا چاہیے تھا۔ جہاں بالآخر قابلیت کا احترام ہوتا ہے۔ انفرادیت کی تعظیم ہوتی ہے۔ ہاں وہ علم و ادب کے راستے پر آیا تھا۔ ابتدائی دور میں وہ بڑے ادب و احترام سے ادب کے ایوان میں داخل ہوا تھا۔ نام کا نہیں کام کا جذبہ لے کر آیا تھا۔ اس کے ساتھی ادب نواز ہونے کے باوجود بڑے ادبی پھنے خاں تھے۔ مختار صدیقی تھا۔ میرا جی تھا۔ اعجاز تھا، ضیاء تھا، بخاری تھا۔ قیوم نظر تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر حلقہ ارباب ذوق کو چالو کرنے کے لیے سارے جتن کیے۔ ہال میں کرسیاں لگائیں انہیں جھاڑا۔ پونچھا، گھنٹوں بیٹھ کر ادیبوں کا انتظار کیا۔ پھر ہال سے باہر سڑک پر جلسے کے سامعین اکٹھے کرنے کی کوششیں کیں۔ راہ گیروں کی منتیں کیں کہ آؤ ادبی جلسے میں شمولیت کر لو۔ کیا حرج ہے۔ جب سامعین اکٹھے ہو جاتے تو وہ بڑے ادب عجز و احترام سے بیک بنچر بن کر بیٹھ جاتا۔

جناب والا یہ جو آپ آج ادب کی فائیو سٹار ہوٹلی محفلیں دیکھ رہے ہیں جہاں وڈیرے وزراء حاکم تشریف لانا گوارا کرتے ہیں، یہ خوش بختیاں ادب کو کب نصیب تھیں۔ حیرت ہے کہ آج کیسے نصیب ہوگئیں یا اللہ تیرے بھید تو ہی جانتا ہے۔

اگر الطاف گوہر کی توجہ ادب پر مرکوز رہتی تو وہ ایوانِ ادب کو چھوڑ کر نہ جاتا۔ گمان غالب ہے کہ وہ ادیبوں کی برادری کو دیکھ کر حوصلہ ہار گیا۔ سول سروس میں جا کر بھی اگر



الطاف گوہر ادب سے ناطہ جوڑے رکھتا تو بھی بات بن جاتی۔ لیکن الطاف گوہر تخلیقی ہونے کے علاوہ ازلی طور پر کامی بھی ہے۔ چیلنجی طبیعت کا مالک ہے جہاں چیلنج دیکھا بیٹھ گئے۔ دھرنا مار کر بیٹھ گئے۔ تن من دھن کی بازی لگا دی۔ پھر یہ بھی ہے کہ بی بی سول سروس بڑی غنڈی ہے۔ یوں نگاہوں پر اٹھا لیتی ہے کہ کسی اور جانب دیکھنے نہیں دیتی بہرحال الطاف گوہر نے قدرت اللہ شہاب کی طرح ادب کو اہمیت نہ دی۔ الطاف گوہر کی تصنیف "تحریریں چند" کا عنوان ہی ظاہر کر رہا ہے کہ کتنی سرسری توجہ ہے۔ البتہ اس کتاب کے مطالعہ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ الطاف گوہر کا زاویہ نظر کس قدر مثبت ہے اور اس میں بڑی تخلیقی صلاحیتیں ہیں۔ ادب سے بے اعتنائی برت کر اس نے اردو ادب کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے۔

-☆-

# پتی بھگت

آپ بانو کو جانتے ہیں چونکہ وہ مصنفہ ہے۔ قدسیہ کو نہیں جانتے جو فرد ہے۔ میں قدسیہ کو جانتا ہوں بانو کو نہیں جانتا۔ بانو قدسیہ کو غالباً کوئی بھی نہیں جانتا۔ اس لیے کہ بانو قدسیہ ایک نہیں دو افراد ہیں جس طرح کسی کسی بادام میں دو مغز موجود ہوتے ہیں۔ اسی طرح بانو قدسیہ کی شخصیت کے دو پہلو ہیں۔ الگ الگ۔ ایک بانو۔ دوسری قدسیہ۔

شاید آپ کبھی مظفر آباد گئے ہوں گے جہاں دریائے نیلم اور دریائے جہلم کا سنگم ہوتا ہے۔ ایک طرف سے دریائے جہلم آتا ہے، گدلا، مٹیالا، شوریدہ سر۔ دوسری طرف سے نیلم آتا ہے۔ نیلا، شفاف، پرسکون پھر وہ دونوں مل جاتے ہیں اور مل کر کئی ایک فرلانگ تک ایک طرف نیلے شفاف اور دوسری طرف گدلے مٹیالے پانی کے دھارے ساتھ ساتھ پہلو بہ پہلو بہتے رہتے ہیں۔ اسی طرح بانو قدسیہ میں ساتھ ساتھ پہلو بہ پہلو شخصیت کے دو دھارے بہہ رہے ہیں۔ ایک نیلا شفاف ذہن کا دھارا۔ دوسرا گدلا مٹیالا جذبات کا دھارا۔ ایک بانو دوسرا قدسیہ۔

میں بانو قدسیہ سے واقف نہیں ہوں اس لیے اس کی شخصیت قلم بند کرنے سے قاصر ہوں۔ صرف یہی نہیں کہ واقف نہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ میں اس سے واقف ہونا چاہتا ہی نہیں۔ میں ہی نہیں گھر میں کوئی بھی اس سے واقف نہیں، نہ اشفاق، نہ نوکی، نہ کیسی، نہ سیری۔ کوئی بھی بانو سے واقف ہونا نہیں چاہتا۔

گھر میں تین مظلوم رہتے ہیں۔ بانو، قدسی اور اشفاق احمد۔ بانو کو قدسی جینے نہیں دیتی، قدسی کو اشفاق احمد جینے نہیں دیتا۔ اشفاق احمد کو خود اشفاق احمد نہیں جینے دیتا۔ گھر میں



تینوں اکٹھے رہتے ہیں اس لیے گھر چوں چوں کا مربہ ہے۔ اشفاق احمد پٹھان ہے۔ قدسیہ جاٹ ہے بانو بے ذات ہے۔ اشفاق برہمن ہے۔ قدسیہ شودر ہے۔ بانو ہاری ہے بانو شہد کی مکھی ہے۔ قدسیہ پروانہ ہے۔ اشفاق بھڑ ہے، بانو ذہن ہے قدسی دل ہے، اشفاق ذہن ہے، بانو مسلمان ہے، قدسی ہندو ہے، اشفاق یوگی ہے۔

بانو کے لیے فکر منزل ہے، قدسی کے لیے پتی بھگتی، اشفاق کے لیے ذات منزل ہے۔

قدسی کی شخصیت کا جزو اعظم پتی بھگتی ہے۔ اسے ملنے سے پہلے میں سمجھتا تھا کہ محبت پھولوں کا ہار ہوتی ہے اور جسے پتی بھگت بیوی مل جائے تو اس کے لیے گھر جنت بن جاتا ہے۔ اب مجھے پتہ چلا ہے کہ بے شک گھر جنت بن جاتا ہے لیکن پتی پر محبت کے پھولوں کے اتنے ہار ڈھیر ہو جاتے ہیں اور وہ یوں دب کر رہ جاتا ہے جیسے تازہ کفنائی ہوئی میت پڑی ہو اور اس میں سے مشک کافور کی بو آنے لگتی ہے۔

اگر آپ پتی بھگتی کا مفہوم سمجھنا چاہتے ہیں تو میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ چند ایک روز اشفاق احمد کے گھر میں قیام کیجیے۔

اگر اشفاق قدسی کی موجودگی میں بر سبیل تذکرہ آپ سے کہے کہ اس گھر میں تو سامان کے یوں انبار لگے ہوئے ہیں جیسے سٹیٹس گھر ہو، میرا تو دم رکنے لگا ہے تو اگلے روز گھر میں چٹائیاں بچھی ہوں گی۔ پیڑھیاں دھری ہوں گی سارا گھر خالی پڑا ہوگا۔

اگر کسی روز لاؤڈ تھنکنگ کرتے ہوئے اشفاق کہہ دے بھئی چینی کھانا مجھے بہت پسند ہے تو چند دنوں کے بعد کھانے کی میز پر چینی کھانے یوں لگے ہوں گے جیسے وہ گھر کی نہیں بلکہ ہانگ کانگ ریستوران کی میز ہو۔

ایک روز اشفاق احمد نے کہا قدسیہ، نور بابا کی بات میرے دل میں کھب گئی ہے فرماتے ہیں کوئی چیز خریدو تو پہلے اسے حلال کرلو پھر استعمال کرو۔ میں نے پوچھا وہ کیسے حضور بولے اپنے لیے چار قمیصیں خریدو تو ساتھ کم از کم ایک قمیض اللہ کے نام پر دینے کے لیے ضرور خریدو۔ مہینے کا سودا خریدو تو ساتھ بیس سیر یا من آٹا اللہ کے نام پر دینے کے لیے ضرور خریدو۔ اسکول میں اپنے بچے کی فیس ادا کرو تو ساتھ ہی کسی حاجت مند بچے کی فیس بھی

ادا کرو۔ اس طرح وہ خرچ جو تم اپنی ذات پر کرو گے، حلال ہو جائے گا۔

اگلے روز اشفاق احمد دفتر سے لوٹا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک اجنبی لڑکا گھر میں بیٹھا ہے۔

قدسی سے پوچھا یہ کون ہے۔ قدسی بولی ہمارے تین بیٹے مدرسے میں پڑھتے ہیں۔ ان کے اخراجات حلال کرنے کے لیے میں نے ایک حاجت مند بچہ گھر رکھ لیا ہے، ہم اسے تعلیم دلوائیں گے، اس کی پرورش کریں گے۔ آج بھی اشفاق کے گھر میں ایک نہیں تین لڑکے پرورش پا رہے ہیں اور باقاعدہ سکول میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

ایک روز کھانا کھاتے ہوئے اشفاق نے کہا کھانے کا مزہ تو ان دنوں آتا تھا جب اماں مٹی کی ہنڈیا میں پکایا کرتی تھیں۔ آج کل ککرز نے بربادی کر رکھی ہے۔ اگلے روز قدسی کے باورچی خانے میں چار مٹی کی ہانڈیاں چولہوں پر رکھی ہوئی تھیں۔

اس سے شاید آپ یہ سمجھیں کہ پتی بھگت کا مقصد خاوند کو خوش رکھنا ہوتا ہے۔

اُونہوں۔ یہ بات نہیں۔

میاں کو خوش رکھنے کی کوشش تو ہر بیوی کرتی ہے۔ آج کل کی بیوی نے میاں کو خوش رکھنے کا ایک نرالا طریقہ ایجاد کر رکھا ہے۔

پہلے وہ میاں کی پسند ناپسند کو بدلتی ہے۔ ایسا جنتر منتر پھونکتی ہے کہ میاں ہر وہ چیز پسند کرنے لگتا ہے جو بیوی کی پسند ہو۔ بیوی اپنے پسند کے کام کرتی ہے لیکن اس انداز سے کرتی ہے کہ میاں یہ سمجھے کہ اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنی خواہشات کی قربانی دے رہی ہے۔

قدسی میاں کی پسند ناپسند بدلنے کی کوشش نہیں کرتی۔ الٹا اپنی پسند ناپسند کو میاں کی پسند ناپسند کے مطابق ڈھال لیتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ میاں کی ہر خواہش کو پورا کرے۔ چاہے وہ خواہش قدسی کے مفاد کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

میری دانست میں جان اور مال کی قربانی دینا اتنا دشوار نہیں جتنا خیالات کی قربانی۔

پتی بھگتی کے علاوہ قدسی کو ایک اور بیماری لاحق ہے۔ یہ ایک کمپلشن ہے۔ اسے خدمت کرنے کا جنون ہے۔



اللہ نہ کرے کہ آپ کو قدسی کے زیرِ خدمت رہنے کا اتفاق ہو۔ یہ افتاد مجھ پر پڑ چکی ہے۔

پچھلے دنوں کی بات ہے کہ مجھے استھمیٹک برانکائیٹس کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ الرجی کا میں پرانا مریض ہوں۔ پنڈی کے ڈاکٹر نے کہا الرجی کا علاج نہیں شروع کیا جا سکتا۔ جب تک چھاتی سے بلغم صاف نہ ہو۔

اشفاق نے کہا میں تمہارا علاج دوا سے نہیں بلکہ غذا سے کروں گا۔ اشفاق کا ایمان ہے کہ غذا میں جو دوا کا عنصر ہے وہ خالی دوا سے زیادہ پُراثر ہے۔

اشفاق نے سوچ سوچ کر میرے لیے غذاؤں کا ایک لمبا چوڑا چارٹ بنایا۔ قدسی نے نرس کے فرائض سنبھال لیے۔ اٹھارہ دن قدسی نے اشفاق کی ہدایات کے مطابق مجھے یوں غذائیں کھلائیں جیسے چڑیا بچے کو چوگا کھلاتی ہے۔ اس نے اتنی احتیاط سے مجھے رکھا جیسے میں کانچ کا گلاس تھا۔ جوں جوں میری صحت بہتر ہوتی جاتی توں توں قدسی کی احتیاط بڑھتی جاتی۔ پندرہ دن کے بعد میں زبردستی وہاں سے بھاگ آیا۔ اگر ایک مہینہ اور رک جاتا تو یقیناً جب گھر پہنچتا تو میرے منہ میں چوسنی ہوتی اور ہاتھ میں جھنجھنا۔

قدسی کی بھگتی صرف میاں تک محدود ہے لیکن جذبہ خدمت کی کوئی حد نہیں کوئی ہو۔ ولی ہو، محتاج ہو۔

اشفاق کو دیکھ کر میں حیرت میں ڈوب جاتا ہوں یہ شخص کس مٹی کا بنا ہوا ہے۔ جو بیس سال قدسی سے بھگتی اور خدمت کرانے کے باوجود ابھی تک اپنے پاؤں پر چلتا ہے۔ بوٹ کے تسمے کھولنے کی ترکیب ابھی تک نہیں بھولا۔ ازخود پاٹی پر بیٹھ جاتا ہے۔ چمچے کی بجائے گلاس میں پانی پیتا ہے اگر اشفاق کی جگہ میں ہوتا تو جھولے میں پڑا ہوتا۔ منہ میں دودھ کی بوتل ہوتی۔ گلے میں چوسنی لٹک رہی ہوتی اور میں اپنی خوش قسمتی پر پھولے نہ سماتا۔

آج سے دس سال پہلے بانو کی تصنیف ''شہرِ بے مثال'' پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے برسبیل تذکرہ بانو قدسیہ کے متعلق بات کی تھی مجھے اجازت دیجیے کہ اقتباس پیش کروں۔

شاید آپ کو اشفاق کے گھر جانے کا اتفاق ہوا ہو۔ اشفاق آپ کو بڑے تپاک سے

ملے گا۔ اور پھر اپنی باتوں کا رنگین جال بچھا دے گا۔ اشفاق باتوں کا رسیا ہے۔ گمان غالب ہے کہ اس کی باتوں کے جال میں پھنس کر آپ کو پتہ بھی نہ چلے کہ کمرے میں ایک سادہ سی گھریلو سی، میلی سی، بے زبان عورت داخل ہو چکی ہے۔ ایسی عورت جو آپ کی توجہ کو جذب کرنے کی کوشش نہیں کرتی جس کی طرف دیکھنے پر آپ خود کو مجبور نہیں پاتے جسے ایک نظر دیکھ کر آپ آسانی سے نظر انداز کر سکتے ہیں۔

پھر آپ دیکھیں گے کہ وہ آپ کو چائے کا پیالہ پیش کر رہی ہے۔ اخلاقاً آپ اس کی طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ وہ خوش اخلاقی سے آپ سے دو ایک باتیں کرے گی اور پھر یا تو کمرے سے باہر نکل جائے گی اور یا وہیں کسی کونے میں مودبانہ بیٹھ کر خود کو معدوم کر دے گی۔ آپ کی باتوں میں لقمہ نہیں دے گی، بحث میں حصہ نہیں لے گی، اشفاق کے لطیفوں پر یوں ہنسے گی جیسے پہلی مرتبہ سن رہی ہو۔ آپ پر ظاہر نہ ہونے دے گی کہ زیر بحث موضوع پر اسے بھی کچھ کہنا ہے۔

اوّل تو اس بے پر کی چیونٹی کے متعلق آپ سوچیں گے ہی نہیں خیال آ بھی جائے تو آپ محسوس کریں گے ''تت تت کتنی اچھی ہے بیچاری۔''

لیکن اگر آپ چار ایک دن کے لیے اشفاق کے گھر میں قیام کریں تو آپ دیکھیں گے کہ یہ ''تت تت بیچاری'' کونوں سے نکل کر ابھر رہی ہے، ابھرے جا رہی ہے، پھیل رہی ہے، پھیلے جا رہی ہے حتیٰ کہ سارا گھر قدسی سے بھر جائے گا۔

آپ دیکھیں گے کہ ابھی وہ ادھر چھوٹے سیری کو کپڑے پہنا رہی تھی اب ادھر بیٹھی جیاگریفیکل میگزین کا مطالعہ کر رہی ہے۔ ہائیں۔ وہ تو باورچی خانے میں شلغم کا اچار تیار کرنے لگی۔ لو وہ تو برآمدے میں سلائی کی مشین پر بیٹھی محمد شاہ رنگیلے گنگنا رہی ہے۔ ابھی وہ صحن میں سلاد کے بوٹے ٹھیک کر رہی تھی، اب بریگیڈیئر اشتیاق سے آرمی ڈرل کے سٹائل پر بحث کرنے لگی، ابھی ڈرائنگ روم میں بنی بجی گڑیا نما خواتین کی بے مقصد مہمل باتوں پر گھاگ دنیادار کی طرح یوں قہقہے لگا رہی تھی جیسے واقعی محظوظ ہو رہی ہو۔ ارے لو وہ تو چادر کی بکل مارے پران پتی کے حضور میں مودبانہ کھڑی پڑوسن سے جا کر ملنے کی آگیا لے رہی



ہے۔

پتہ نہیں کیسے وہ ہر جگہ موجود ہوتی ہے۔ ہر بات میں دلچسپی لیتی ہے، ہر کھیل میں بچوں کی طرح شامل ہو جاتی ہے۔

اس کے سامنے اشفاق کے سمیت گھر کے سارے کردار ماند پڑ جاتے ہیں۔ معدوم ہو جاتے ہیں۔ ساری چیزیں اپنی جاذبیت کھو دیتی ہیں اور اس کی شخصیت یوں چھا جاتی ہے جیسے کوہستانی زیرہ ہو۔

چند ایک سال ہوئے ہم چار دوست مسعود قریشی، محمد عمر، عبداللہ اور میں کاغان گئے تھے۔ ناران کے قریب ہمیں ایک کوہستانی مل گیا۔ اس سے ہم نے پاؤ بھر کوہستانی زیرہ خریدا۔ اسے رومال میں باندھ کر ہم نے پوٹلی بنالی۔ ہوٹل پہنچ کر ہم نے وہ پوٹلی میز پر رکھ دی کھانا کھایا اور سو گئے۔

آدھی رات کے وقت عمر نے چلا کر کہا یارو کمرے میں کیا ہے آج!

مسعود بولا ہاں یار کچھ ہے ضرور۔

عبداللہ کہنے لگا اسی وجہ سے مجھے بھی نیند نہیں آ رہی۔

میں نے جواب دیا بو سی ہے جو سونے نہیں دیتی۔

ساری رات ہمیں نیند نہ آئی۔

صبح ہوئی تو سارا کمرہ کوہستانی زیرے کی خوشبو سے بھرا ہوا تھا ناشتے کے وقت انڈا کھایا تو گویا وہ بھی زیرے کا بنا ہوا تھا۔ چائے میں باورچی نے پتی کے بجائے زیرہ ڈال رکھا تھا۔ پینے کا پانی زیرے کا عرق تھا۔ سگریٹ میں تمباکو کی جگہ زیرہ بھرا ہوا تھا۔ ہم سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

مسعود بولا ٹھہرو۔ وہ چپکے سے اٹھا دو انگلیوں سے زیرے کی پوٹلی اٹھائی یوں جیسے مرا ہوا چوہا ہو۔ عقبی کھڑکی سے اسے دریا میں پھینک کر ہاتھ جھاڑے اور پھر اطمینان سے کرسی پر آ بیٹھا۔

قدسی اور اس پوٹلی میں صرف دو فرق ہیں۔ پوٹلی نے اپنا راز فاش کر دیا تھا اور پوٹلی کو

دریا میں پھینکا جا سکتا تھا۔

پتہ نہیں کیوں میں ہمیشہ غیر شعوری طور پر قدسی کو ہندو سمجھتا رہا ہوں حالانکہ قدسی اسلامی جذبے سے یوں نچڑتی ہے جیسے رس گلا شیرے سے اور قدسی کی امی پر تو ہر وقت اسلامی دیوانگی مسلط رہتی ہے۔ اس حد تک کہ جی گھبرانے لگتا ہے۔ نمازیں، وظیفے، مسئلے ایک اسلامی جنون ہے جو مدّ ہی مد جانتا ہے جزر سے آشنا نہیں۔

غیر شعوری کو چھوڑیئے شعوری کی بھی سن لیجیے۔ جب قدسیہ گھر میں گھومتی پھرتی ہے تو مجھے اس کے ماتھے پر سیندھور کی بندی صاف نظر آتی ہے۔ جب کبھی میں میرا کا بھجن سنتا ہوں تو پیش منظر میں قدسی آ کھڑی ہوتی ہے۔ جب وہ چنگیر اٹھائے ہوئے باورچی خانے کی طرف جا رہی ہوتی ہے تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے پوجا کی تھالی پکڑے مندر جا رہی ہے۔

اس ہندنی میں دیوی بھی ہے اور ناری بھی جیسے شکنتلا ساوتری اور راج نرتکی ایک ہی جسم میں اکٹھی ہو گئی ہوں۔

تنہائی میں بیٹھے ہوئے ان جانے میں شدھ راگ گنگنانا اس کی پرانی عادت ہے۔ کسی زمانے میں اس نے کتھک اور کتھا کلی کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ نرہت اور مُندرا اس کے جسم میں ایسے رچ بس گئے ہیں کہ ان جانے میں پھوٹ پھوٹ کر نکلتے رہتے ہیں۔

قدسی کی شخصیت کے جملہ پہلوؤں کو یکجا کر دیا جائے تو گیشیا جنم لیتی ہے۔

آپ کہیں گے بھئی بانو کی بات کیوں نہیں کرتے۔ بانو کی بات قدسی کرنے بھی دے۔ صرف قدسی ہی نہیں۔ بانو کی بات کرنے کو میرا جی نہیں چاہتا۔ آپس کی بات ہے۔

قدسی میری دوست ہے میں اسے پیار کرتا ہوں۔ بانو میری حریف ہے ہمارے درمیان پروفیشنل رقابت کی دیوار حائل ہے۔ غضب خدا کا کل کی چھوکری ہمارے ہاتھوں میں پلی۔ آج ہمیں آنکھیں دکھاتی ہے کیا زمانہ آیا ہے۔

بانو کو گھر میں کوئی نہیں پوچھتا۔ اشفاق اسے مانتا نہیں اس لیے درخور اعتنا نہیں سمجھتا۔ میں اسے مانتا ہوں کچھ زیادہ ہی مانتا ہوں اس لیے درخور اعتنا نہیں سمجھتا۔ اشفاق نے بانو کی کوئی تخلیق آج تک نہیں پڑھی۔ البتہ مربیانہ انداز میں کہتا رہتا ہے، بانو کبھی وقت ملا تو تیری



تازہ کہانی پڑھوں گا۔

ایک روز مجھ سے کہہ رہا تھا۔ ہاں اچھا لکھتی ہے میرا مطلب ہے خاصہ۔ پھر وہ مجھ سے قریب تر ہو کر بولا تلقین شاہ کے جملے چرا لیتی ہے ٹانکنے نہیں آتے۔

میں نے پہلے ہی کہہ دیا کہ میں بانو سے واقف نہیں ہوں اور نہ ہی واقف ہونا چاہتا ہوں۔ کئی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ بر سبیل گفتگو بانو بول اٹھتی ہے۔ ایسی گہری اور دور رس بات کہہ دیتی ہے کہ میں چونک جاتا ہوں۔ یہ کون بولا۔

پھر قدسی ہنس پڑتی ہے کوئی بھی نہیں جانتا قدسی کے کہنے پر بانو چپ کیوں ہو جاتی ہے۔ کبھی دل کے کہنے پر ذہن کا بھڑ چپ ہوا ہے کیا۔ کبھی دانشور نے کسی کی بات مانی ہے کیا۔ کبھی دانشور نے نمائش کو چھوڑا ہے کیا۔ کبھی مصنف چمکیلی بات لشکانے کے بغیر رہا ہے کیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

ضرور بانو اور قدسی کے درمیان کوئی خفیہ سمجھوتہ ہے جس کا بھید میں نے آج تک نہیں پایا۔ مجھے تو بانو اور قدسی کا باہمی رشتہ ناجائز قسم کا معلوم پڑتا ہے۔ شاید فلیم ریلیشن شپ ہو لیکن شعلہ کون ہے، پروانہ کون ہے۔

اشفاق کی عقل مندی کے سامنے میں سرِ تسلیم خم ہوں۔ اس نے بانو کو نہ مان کر خود کو محفوظ کر لیا ہے۔ اک چپ سو سکھ۔

میں ایسا احمق ہوں کہ اپنے لیے نت نئی مشکلات پیدا کرتا رہتا ہوں۔ بانو کو مان کر مشکل میں پڑا ہوں۔ اب دیکھ لیجیے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ بانو کی نئی تصنیف ''امربیل'' کا تجزیہ کرتا۔ رسمی واہ واہ کرتا رسمی عیب نکالتا۔ آپ سن کر تالی بجاتے اور میں خوش خوش گھر چلا جاتا۔ اس کے برعکس میں بانو قدسیہ کی شخصیت لے بیٹھا ہوں حالانکہ مجھے اچھی طرح علم تھا کہ بانو سے میں واقف نہیں ہوں۔ اس کی بات کروں گا تو مشکل میں پڑ جاؤں گا۔ نہ کروں گا تو آپ کہیں گے اچھی شخصیت ہے یہ جس میں غیر متعلقہ قدسی کی باتیں کیے جا رہا ہے اور متعلقہ بانو مصنفہ کو گول کر گیا ہے۔

بچپن میں بانو اور قدسیہ اکٹھی رہا کرتی تھیں، پھر قدسی جوان ہو کر باہمنی بن گئی تو بانو

شودھرانی بن کر رہ گئی۔ پھر باہمی کی جھکی جھکی آنکھیں اشفاق سے لڑ گئیں تو بانو کی کوئی حیثیت ہی نہ رہی۔ پھر جب اشفاق اور قدسی کی شادی ہو گئی تو قدسی نے بانو کو دوپٹے کی کنی میں باندھ کر محفوظ کر لیا۔ اس زمانے میں اشفاق اپنے ہاتھ میں گڈریے کا سونٹا لیے پھرتا تھا۔ قدسی کو خطرہ تھا کہ بانو کو سونٹا نہ لگ جائے۔ چوٹ نہ آ جائے۔

بانو نے کئی بار اپنے وجود کا اظہار کرنا چاہا۔ جب بھی وہ ادبی بات کرتی تو اشفاق کا رویہ کچھ ایسا ہوتا کہ بی بی آلو چھیلو، خان زادوں کے پوتڑے دھوؤ۔ میرے سلیپر ڈھونڈ کر پاؤں تلے رکھو۔ ادب کی بات چھوڑو۔ بانو کو بات سمجھ میں آ گئی کہ اس جاگیردار کے سامنے دال نہیں گلے گی۔ جان کی امان چاہتی ہو تو انڈر گراؤنڈ چلی جاؤ۔

پھر یہ کیچوی چپ چاپ انڈر گراؤنڈ رینگتی رہی۔ رینگتے رینگتے وہ براڈ کاسٹنگ ہاؤس تک جا پہنچی۔ ادبی جریدوں پر جا چڑھی، ٹی وی کی دہلیز پر جا پہنچی۔ الحمراء کی سٹیج پر براجمان ہو گئی۔

نہ ماننے کے باوجود اشفاق نے محسوس کیا کہ راج پاٹ خطرے میں ہے۔ اس نے اپنی شان مزید درخشاں کرنے کے لیے تلقین شاہ کا مرصع چغہ پہن لیا۔ ایک ہاتھ میں تو گڈریے کا سونٹا تھا ہی دوسرے میں حسرت تعمیر کا عصا پکڑ لیا۔ قدسی نے بتیرا کہا بانو بی بی میرے پتی کے لیے مشکلات پیدا نہ کر لیکن آپ جانتے ہیں دانشور جب انڈر گراؤنڈ چلا جاتا ہے تو اسے کوئی نہیں سمجھا سکتا۔ بانو باغی ہو چکی تھی۔

اشفاق اور میں بہت پرانے دوست ہیں۔ اس زمانے کے جب ابھی اشفاق احمد نہیں بنا تھا۔ جب وہ ایک گلابی کشمیرن تھا۔ پھر جب اس نے براڈ کاسٹنگ کا بھونپو پکڑ لیا تو مشکلات پیدا ہو گئیں۔ اس پر ہم دونوں نے ایک سمجھوتہ کر لیا جو آج تک قائم ہے۔

خان سن رہا ہو تو میں بآواز بلند کہتا ہوں۔ اشفاق تو جینئس ہے۔ ایک طرف گڈریا ہے دوسری طرف تلقین شاہ ہے تیسری طرف مشینوں کو سمجھتا ہے، چوتھی طرف آواز کا بادشاہ ہے۔ خان کی پیٹھ کے پیچھے کہتا ہوں، ہاں آواز کا بادشاہ ضرور ہے۔ مشینوں کو بھی سمجھتا ہے۔ لیکن ادب، اونہوں ادب میں دال نہیں گلتی۔



میری موجودگی میں اشفاق کہتا ہے ہاں مفتی کی لبیک کافی چلی ہے۔ اگرچہ میں نے خود نہیں پڑھی، کہتے ہیں اچھی کتاب ہے یقیناً ہو گی لیکن خیر۔ اور میری غیر موجودگی میں آپ چاہے مفتی کی تحریروں کی باتیں گھنٹوں کیے جائیں وہ چپ چاپ بیٹھا سنتا رہے گا ہنکارا تک نہیں بھرے گا۔

بانو سے بھی میں نے ایسا ہی سمجھوتہ کر رکھا ہے۔

مہینے میں کم از کم ایک بار میں التزاماً موقعہ پیدا کرتا ہوں، اور پھر بانو سے کہتا ہوں بانو تم کمال لکھتی ہو واہ واہ کیا فکر ہے کیا تخیل ہے انفرادیت ہے گہرائی ہے اندازِ بیاں ہے۔ اس پر بانو گھبرا کر کہتی ہے۔ نہیں نہیں میں تو کچھ بھی نہیں۔

پھر وہ میں تو کچھ بھی نہیں۔ دیر تک میرے کانوں میں گونجتا رہتا ہے۔ اور میری حیثیت بنی رہتی ہے۔

جہاں تک مجھے یاد ہے اشفاق کی شادی سے آج تک تین مرتبہ گھر میں بانو گنتی شمار میں آئی۔ پہلی مرتبہ ان دنوں جب اشفاق کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ ماں باپ اور بھائیوں نے اشفاق کو اپنی مرضی کی شادی کرنے کا حق نہیں دیا تھا۔ انہیں بانو قدسیہ کے خلاف کوئی شکایت نہ تھی۔ جھگڑا اس بات پر تھا کہ خان خاندان میں جاٹ کی آمیزش قابل قبول نہ تھی۔ اشفاق کے والد صاحب چونکہ ویٹریزی ڈاکٹر تھے اس لیے وہ بریڈ کے شدت سے قائل تھے۔

جب گھر والوں کو پتہ چلا کہ اشفاق نے خاندانی اصولوں کو ٹھکرا کر جاٹ سے شادی کر لی ہے تو انہوں نے اشفاق سے قطع تعلق کر لیا۔

ان دنوں اشفاق ابھی اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہوا تھا۔ آمدنی کی کوئی صورت نہ تھی۔ میاں بیوی کے ہاتھ میں سکرپٹ رائٹنگ کے سوا کوئی ہنر نہ تھا۔ لیکن ان دنوں سکرپٹ کی مانگ نہ تھی۔

بہر حال اشفاق نے پنسل کان پر اٹکائی۔ ہاتھ میں کاغذ کی سلپیں پکڑیں اور پھیری لگانے لگا "سکرپٹ لکھوا لو، سکرپٹ لکھوا لو" گھر میں قدسی نے بانو کو اپنے پلو سے کھولا۔

اسے پنسل کاغذ دے کر میز پر بٹھا دیا کہ کوئی آرڈر مل جائے تو لکھنے کا کام فی الفور کر دے۔

دوسری مرتبہ جب اشفاق فلم بنانے لگا تو بانو کو پھر سے میدان میں آنا پڑا۔ وہ چھتری لگا کر سٹوڈیو جا پہنچی اور وہاں ڈائریکٹر پروڈیوسر اشفاق احمد کی اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کرنے لگی۔

تیسری بار تب جب اشفاق نے ماڈل ٹاؤن میں مکان بنوایا۔ مکان بن گیا تو میں نے اشفاق سے کہا اب اسے کرائے پر چڑھا دو۔

اشفاق نے حیرت سے میری طرف دیکھا بولا مکان میں نے کرائے پر چڑھانے کے لیے نہیں بنوایا، خود رہنے کے لیے بنوایا ہے۔

پاگل ہو گئے ہو میں نے اسے سمجھایا۔

پاگل کیوں؟

قرض پر مکان بنواتے ہو اور پھر اسے کرائے پر نہیں دیتے۔ قرض کیسے اتارو گے۔

بات اشفاق کی سمجھ میں نہ آئی کیسے آتی پٹھان ہے۔ پٹھان نام و ناموس کی خاطر عقل کو تیاگ دینے سے گریز نہیں کرتا۔

بات بانو کی سمجھ میں آ گئی اس نے پنسل ہاتھ میں لی کاغذ کی سلپیں سامنے رکھیں اور میز پر بیٹھ کر سکرپٹ لکھنے لگی۔

۷۵ ہزار کا قرض سکرپٹوں سے اُتار دینا۔ بات میرے ذہن میں نہیں آتی۔ شاید آپ کی سمجھ میں بھی نہ آئے۔ کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ جبھی تو لوگ سمجھتے ہیں کہ اشفاق کو کہیں سے دبی ہوئی دولت ملی تھی جبھی اتنا عالیشان گھر بنا لیا۔

ایک دن میں نے اشفاق سے پوچھا کیا واقعی دبی ہوئی دولت ملی تھی۔ نہیں تو۔ وہ بولا۔

پھر لوگ کیوں کہتے ہیں کہ دبی ہوئی دولت ملی تھی۔

کہنے دو، وہ زیر لب بولا۔ مفت میں اپنی حیثیت بن رہی ہے۔ تمہیں کیا تکلیف ہے۔

صرف مکان ہی نہیں گھر میں جتنا ساز و سامان ہے سب سکرپٹوں سے بنا ہے۔ یہ



صوفہ تین سکرپٹوں سے خریدا تھا۔ وہ فرج پانچ سکرپٹوں کا آیا تھا۔ یہ کارپٹ دس سکرپٹوں کا ہے۔ یہ ٹیپ ریکارڈر بارہ سکرپٹوں کا ہے۔ ان سکرپٹوں میں اکیلا اشفاق ہی نہیں بانو بھی برابر کی حصہ دار ہے۔ اس کے باوجود گھر میں بانو کسی گنتی میں نہیں ہے۔

اشفاق تو بانو کے وجود کو مانتا ہی نہیں۔ خود قدسیہ، بانو کے وجود پر معذرت خواہ ہے۔

قدسی، بانو کے خلاف صرف اس لیے ہے کہ وہ اس کی پتی بھگتی میں حارج ہوتی ہے۔ اگر بانو کا بس چلے تو اشفاق کے برابر جا بیٹھے۔ اشفاق سے بحث چھیڑ لے۔ پٹاخ پٹاخ باتیں کرے، کیسے کیسے خیالات کا اظہار کرے۔ قدسیہ کے دیوتا کو انسان بنا کر رکھ دے۔ جبھی قدسیہ، بانو کو دبا کر رکھتی ہے۔ سر اُٹھانے نہیں دیتی۔ زبان کھولنے نہیں دیتی۔ اشفاق کے قریب پھٹکنے نہیں دیتی۔

اشفاق کے گھر آنے جانے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ کئی ایک لوگ تو ان کے مستقل مہمان ہیں۔ مثلاً میں خود ہوں۔ اس کے باوجود میں نے وہاں بانو کو کبھی نہیں دیکھا، نہ مجھے اس سے بات کرنے کا کبھی موقع ملا ہے۔ بانو کو تصنیف کا کام کرتے ہوئے میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ جس طرح مرغی انڈا دیتے وقت کسی کونے میں جا کر چپ چاپ بیٹھ جاتی ہے کسی کو پتہ نہیں چلتا کہ بیٹھی ہے یا کہاں بیٹھی ہے پھر فراغت کے بعد سارا گھر اس کی کک کک سے بھر جاتا ہے۔ میں نے کبھی بانو کو بیٹھے نہیں دیکھا البتہ اُٹھنے کے بعد کک کک ضرور سُنی ہے۔

بانو کی باتیں سُنی ہوں تو لازم ہو جاتا ہے کہ موزوں وقت کی تاک میں بیٹھے رہو۔

پہلی مرتبہ انجانے میں مَیں نے بانو کو باتیں کرتے ہوئے سن لیا تھا۔

ہوا یوں کہ قدسی کے بڑے بیٹے نوکی نے ڈرائنگ روم سے آ کر کہا امی باہر ایڈیٹر صاحب آپ سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد قدسی ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔

پھر ڈرائنگ روم میں کوئی با آواز بلند باتیں کر رہی تھی۔ افسانوں کی باتیں۔ کرداروں کی باتیں۔ مرکزی خیال کی باتیں۔ عورت کی عظمت کی باتیں۔ انداز بیان کی خصوصیات۔ ان باتوں سے فلسفہ، نفسیات اور جمالیات کی بُو آ رہی تھی۔ میں حیرت سے سن رہا تھا۔ سوچتا

یا اللہ اندر تو قدسی گئی تھی میں نے خود اسے اندر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ لیکن یہ باتیں کون کر رہی ہے۔ قدسی نے تو کبھی ایسی باتیں نہیں کیں۔ ان باتوں میں تو قدسی کا رنگ ہی نہیں ہے۔ قدسی تو خالی ہاں جی، ہاں جی ہے۔ یہ اگر مگر لیکن، چونکہ، چنانچہ کون ہے۔ پھر مجھے پتہ چلا کہ بانو کیا شے ہے۔

شکر ہے کہ بانو صرف ڈرائنگ روم تک محدود ہے، شکر ہے کہ میں ڈرائنگ روم سے تعلق نہیں رکھتا۔ ورنہ میرے لیے بھی مشکلات پیدا ہو جاتیں جس طرح اشفاق کے عزیز و اقارب کی بیگمات کے لیے مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔

اشفاق کے عزیز و اقارب کھاتے پیتے کاروباری لوگ ہیں۔ روپے پیسے کے حساب سے ان کا مرتبہ برہمن کا سا ہے اور اشفاق کا شودر کا۔ اس کے باوجود اشفاق سے میل جول رکھنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ دھن دولت حاصل کرنے کے بعد فن کو پیٹرانائیز کرنے کی خواہش اُبھرتی ہے۔ جانے پہچانے فن کاروں کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے نظر آنے کی کوششیں شروع ہو جاتی ہیں۔ اشفاق کے امیر رشتہ دار آتے تو فن سے ناطہ جوڑنے کے خیال سے ہیں لیکن جب وہ قدسیہ کے گھر میں قدم رکھتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی اور دنیا میں آ گئے ہوں۔

ان کے اپنے گھروں میں امارت ہے۔ بناوٹ سجاوٹ ہے، بہتات ہے۔ چوکیوں پر بیٹھ کر حکم چلانے والی بنی بجی بیگمات ہیں۔ یہ ”گملا لندن سے منگوایا تھا، پھولوں کا یہ ڈوڈا ہالینڈ سے حاصل کیا تھا“ قسم کی گفتگو بھی ہے، سبھی کچھ ہے۔ لیکن نہ قدسیہ بانو کے گھر کی سی سادگی ہے نہ خلوص ہے۔ نہ جذبہ خدمت ہے نہ ننگی اپنائیت ہے۔ بیچارے مرد بھونچکے رہ جاتے ہیں۔ ان کا جی چاہنے لگتا ہے کہ بار بار ان کے گھر آئیں، سو آتے ہیں اور ہر بار وہ اپنے ساتھ کوئی خیال کوئی احساس لے کر گھر لوٹتے ہیں۔ پھر اپنے گھر میں ردوبدل کرنے کی خواہش کا اظہار ہونے لگتا ہے۔ اس پر بیگم کا ماتھا ٹھنکتا ہے۔ اگر بانو قدسیہ کے گھر میں آنے جانے کا سلسلہ قائم رہا تو بات بگڑ جائے گی۔ گھر کو محفوظ رکھنے کے لیے لازم ہے کہ یہ سلسلہ ٹوٹ جائے۔



میاں بیچارہ تو جنتی مخلوق ہوتا ہے۔ بیگم جو رخ چاہے عطا کر دے۔ بس چند اشارات ہوتے ہیں۔ چند زیرلبی باتیں۔ میاں کو بانو قدسیہ اور اشفاق کے گھر سے شکایات پیدا ہو جاتی ہیں۔ آنے جانا کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔ گھر محفوظ ہو جاتا ہے۔

عزیز و اقربا کی بات چھوڑیئے میری اپنی یہ کیفیت ہے کہ میں قدسیہ کے گھر زیادہ دیر نہیں رہ سکتا۔ حد چار پانچ دن۔ اس کے بعد میں واپسی کے لیے بے قرار ہو جاتا ہوں۔ جی چاہتا ہے اُڑ کر اپنے گھر پہنچ جاؤں۔ میری اس بے قراری پر قدسی چڑ جاتی ہے۔ اسے اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ چار دن اس کے گھر میں رہنے کے بعد اپنے گھر میں ایڈجسٹ منٹ ہونی مشکل ہو جاتی ہے، اپنا گھر کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ گھر بار چھوڑ کر ویرانے میں جا کر جتی ستی ہو جاؤں۔

قدسی کو یہ بات سمجھ میں نہیں آئے گی کہ ان کے گھر رہنا کتنے دل گردے کا کام ہے۔

بہرحال یہ تو مسلم امر ہے کہ رشتہ دار مرد اور عورتیں دونوں قدسیہ کے گھر سے بے حد متاثر ہوتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ مرد متاثر ہو کر واہ واہ کرتے ہیں اور خواتین متاثر ہو کر توبہ توبہ کرتی ہیں۔ مرد وہاں جانے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں اور خواتین انہیں روکنے کے جتن کرتی ہیں۔

قدسیہ دراصل ایک ویدر کاک ہے جو ہوا کے مطابق اپنا رُخ بدلتی رہتی ہے۔ لیکن اسے احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ رُخ بدلتی ہے۔ ہوا خود اشفاق ہے۔ اشفاق ایک ایسی مشین ہے جو ہوا جنریٹ کرتی ہے۔ اگر اشفاق مشرق سے مغرب کو چلنے لگے تو قدسی ویدر کاک کا رُخ مغرب کی طرف ہو جائے گا اور سارا گھر مشرق سے مغرب کی طرف چلنے لگے گا۔ اگر اشفاق دفعتاً مشرق کی طرف چلنے لگے تو سارے گھر کا رُخ مشرق کی طرف ہو جائے گا۔ اور قدسی کو اس تبدیلی کی خبر بھی نہ ہوگی۔

مشکل یہ ہے کہ اشفاق کے اندر ایک دو ہوائیں نہیں بلکہ ہواؤں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ اور جذبہ تحقیق اس قدر زوروں پر ہے کہ وہ مختلف ہوائیں چلانے کے شغل میں مبتلا رہتا ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ اشفاق کے موسم خالص داخلی ہوتے ہیں۔ طبعاً وہ باہر کے موسم کا محتاج نہیں۔ اپنا موسم خود پیدا کرنے کا شوقین ہے۔ اس کے برعکس قدسیہ کے ہاں اپنا موسم ہے ہی نہیں۔ وہ اشفاق کے موسم کے ساتھ چلتی ہے۔ پہلے تو دونوں کی ہم آہنگی کی وجہ سے ادلتی بدلتی ہوائیوں کا اسے شعور ہی نہیں ہوتا تھا اب بچے جوان ہو چکے ہیں اس لیے وہ پوچھتے ہیں۔

ایک کہتا ہے امی پہلے ہم مشرق کی طرف جا رہے تھے اب شمال کی طرف چلنے لگے ہیں۔ بات کیا ہے۔

دوسرا کہتا ہے امی کی طرف سے کبھی کوئی ہوا چلتی ہے۔ کبھی کوئی، ایسا کیوں ہوتا ہے۔

بچوں کی ایسی باتیں قدسیہ کے لیے کوفت کا باعث ہوتی ہیں۔ قدسیہ بچی ہے اس کا رُخ تو کبھی بدلا نہیں ہمیشہ اشفاق کی طرف رہا ہے اسے کیا خبر کہ شمال کیا ہے، مشرق کیا ہے۔

اشفاق کا رُخ پہلے افسانہ نویسی کی طرف ہوا تھا پھر وہ تلقین شاہ بن گیا۔ پھر اسے پرچہ جاری کرنے کا شوق چرایا اور وہ داستان گو بن گیا۔ پرچہ چھاپنے میں ندرت اور طباعت کا جنون ہوا تو اس نے پبلشر بننے کی ٹھان لی۔

دساور سے چھپائی کی مشینیں آ گئیں۔ گھر کے ایک کمرے میں انہیں فکس کر دیا گیا۔ قدسیہ سلائی مشین چھوڑ پرنٹنگ مشین پر بیٹھ کر کپڑے کی جگہ کاغذ چلانے لگی۔

میں نے اشفاق کو لاکھ سمجھایا کہ میاں تم میں بزنس مین نہیں ہے، پبلشر نہ بنو، لیکن اشفاق کو سمجھانا میرے بس کی بات نہیں۔ ہمارے تعلقات کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ نہ میں اسے سمجھا سکتا ہوں نہ وہ مجھے سمجھا سکتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھانے کی لذت سے محروم ہیں۔ جب بھی موقع ملتا ہے ہم ایک دوسرے کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک سمجھاتا ہے دوسرا یوں جی جی کرتا رہتا ہے جیسے سمجھ رہا ہو۔ پھر جب یہ عمل ختم ہو جاتا ہے تو دوسرا اپنی ڈگر پر یوں چل پڑتا ہے جیسے سمجھانے والے نے اس ڈگر سے رکنے کی بجائے اس پر چلنے کی تاکید کی ہو۔

بہرصورت میں نے اشفاق کو بہت سمجھایا کہ پبلشر نہ بنے۔ وہ ہاں ہاں کرتا رہا اور اس



کا پبلشر بننے کا فیصلہ مزید پکا ہوتا گیا۔ جب کوئی چارہ نہ رہا تو میں نے اپنا جہازی ناول "علی پور کا ایلی" فافٹ ختم کر دیا اور پبلشنگ کے لیے اشفاق کو تھما دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پبلشر کی کمر ٹوٹ گئی چھپائی کی مشینیں اونے پونے پر بک گئیں اور بانو قدسیہ چھپائی کی مشین سے اٹھ کر پھر سے سلائی کی مشین پر جا بیٹھی اور کاغذ کی جگہ پھر سے کپڑا چلانے لگی۔

پھر اشفاق کا رُخ ٹیلی ویژن کی طرف ہو گیا۔ ٹیلی ویژن میں آؤٹ ڈور کرتے کرتے وہ نور بابا کے ڈیرے پر جا پہنچا۔

پھر گھر میں نور بابا کی کہاوتیں چلنے لگیں۔ کتاب وشنید کی باتیں بے معنی ہو کر رہ گئیں۔ دوا میں اثر نہ رہا۔ غذا دوا بن گئی۔ دوسروں کو کھانا کھلانا اور ان کی خدمت کرنا کارِ ثواب بن گیا۔ چنانچہ گھر نے ہوٹل کی شکل اختیار کر لی اور بانو قدسیہ ہیڈ بیرا اور چیف باورچن بن گئی۔

پہلے تو بچے حیران ہوئے پھر آہستہ آہستہ وہ بھی اسی راستے پر چل نکلے۔ لوگوں کو انٹرٹین کرنے کے کارِ خیر میں حصہ لینے کی خواہش کے تحت انہوں نے ہارمونیم اور طبلہ پر سنگت میں گانے کی مشق کی۔ اور بانو قدسیہ کے گھر میں کھانے کے علاوہ قوالیاں بھی ہونے لگیں۔

آنے جانے والوں کو پتہ چلا تو جذبہ ہمدردی سے ان کے دل پسیج گئے۔ اور بانو قدسیہ اور اشفاق کو ابلاغ نہ کرنا ان کے لیے مشکل ہو گیا۔

پھر بہیوں نے نور بابا کے ڈیرے سے اشفاق کا پتہ حاصل کر لیا اور وہ گھر آ کر پرمانینٹ گیسٹ بن گئے۔ اس پر قدسیہ اور اشفاق خوشی خوشی، بات بات پر کہنے لگے اللہ کی کتنی بڑی رحمت ہے۔

اللہ کی یہ رحمت کئی ایک سال تک جاری وساری رہی، بانو قدسیہ اس پر شکرانے کے سجدے دیتی رہی۔ اشفاق کی خوشی تو اکہری تھی بانو کی خوشی تہری تھی۔ کھلانے کی خوشی۔ خدمت کرنے کی خوشی۔ اور سب سے بڑھ کر پتی کو خوشی مہیا کرنے کی خوشی۔

لیکن ٹھہریئے ایک بات قابلِ وضاحت ہے لوگوں کو طعام کھلانے کا مسلک اپنانے سے پہلے بھی قدسی اور اشفاق مہمان نوازی کے بڑے قائل تھے۔ کیسے نہ ہوتے قدسیہ جاٹ

ہے اور اشفاق پٹھان ہے۔

ویسے تو قدسیہ اور میرے گھر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ لیکن بنیادی فرق یہ ہے کہ ہم انتظار کرتے رہتے ہیں کہ کب مہمان جائے تو ہم کھانا کھائیں۔ قدسیہ کے گھر میں اشفاق اور قدسی انتظار کرتے رہتے ہیں کہ کب مہمان آئے تو کھانا کھائیں۔

یہ تو بہت پہلے کی بات ہے جب اشفاق اور قدسیہ نے مل کر گھر بنایا تھا۔ جب اور اب میں بہت فرق ہے۔ جب آنے والے مہمان سیدھے باورچی خانے میں جا بیٹھتے تھے۔ جب قدسی کو احساس نہ تھا کہ وہ دوسروں کو کھلانا پسند کرتے ہیں یا دوسروں کو کھلا رہے ہیں یا دوسروں کو کھلانا کارِ ثواب ہے۔ جب انہیں یہ پتہ چلا تھا کہ مہمانوں کی آمد اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔

اب بات ہی اور ہے اب اللہ کی رحمت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ گھر میں رحمت کے سوا کچھ بھی نہیں رہا۔ کچھ دیر ہوئی اشفاق قدسی کے ہاں ایک صوفی آ مقیم ہوئے۔ پتہ نہیں وہ از خود آئے تھے یا انہیں اللہ نے بھیجا تھا۔ صوفی نے اشفاق کے کان میں پتہ نہیں کیا پھونک ماری کی نقشہ ہی بدل گیا۔ ساری رحمت درہم برہم ہو کر رہ گئی۔

اس نئی تبدیلی نے قدسیہ کو زچ کر دیا ہے۔ ویدر کاک کو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کس طرف کو رخ کرے۔ نئی ہوا جو چلنے لگی ہے اس کا رُخ تو ہے لیکن یہ رُخ جانی پہچانی سمتوں سے ہٹ کر ہے۔ اس لاسمتی ہوا نے زندگی میں پہلی بار قدسیہ کو زچ کر دیا ہے۔ پتی بھگت کے ہاتھ سے پران ناتھ کا پلو چھوٹتا جا رہا ہے۔ عمر بھر کی وہ منزل جس سے وہ چمٹی رہی ہے نظر سے اوجھل ہوتی جا رہی ہے۔ بانو قدسیہ آج ایسی ناؤ بنی بیٹھی ہے جس کا رڈار ٹوٹ گیا ہو۔ چپو بے کار ہو گئے ہوں۔ اس انقلاب عظیم کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ شاید قدسیہ اور بانو دونوں ہی ڈوب جائیں یا شاید اس لاسمتی گرداب میں قدسی معدوم ہو جائے اور بانو چپو اپنے ہاتھ میں لے لے اور زندگی میں پہلی مرتبہ بانو کو جینے کی اجازت مل جائے۔ امر بیل کا سایہ ختم ہو جائے اور بانو ہری بھری ہو جائے۔ اس بارے میں فی الحال کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

☆



۱۹۸۸ء

# ہر رنگ رنگی

شخصیتیں طرح طرح کی ہوتی ہیں۔

کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں دیکھ کر ترس آتا ہے، ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔

کچھ شخصیتوں کو دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوتی ہے۔ پیار آتا ہے۔

کچھ شخصیتیں ایسی طاقتور اور رعب دار ہوتی ہیں کہ دیکھ کر خوف آنے لگتا ہے۔

بشریٰ رحمٰن کو جب میں پہلی بار ملا تو اسے دیکھ کر ترس آیا، ہمدردی پیدا ہوئی۔ دوسری بار ملا تو خوشگوار حیرت ہوئی، پیار کرنے کو جی چاہا اور اب۔۔۔ اب مجھے بشریٰ رحمٰن سے خوف آنے لگا ہے۔

پہلی بار میں بشریٰ سے تب ملا جب اس نے رحمٰن سے نئی نئی شادی کی تھی۔ بیچاری یہ کہاں پھنس گئی۔ کسی آدم زاد سے بیاہ کرتی۔ اس جن کے پلے کیوں بندھ گئی۔ رحمٰن تو جن ہے اور جن بھی ایسا جسے آج تک کوئی بوتل میں بند نہیں کر سکا۔ جو کسی چراغ کی رگڑ کا پابند نہیں ہے جو "حاضر ہوں آقا، میرے لیے کیا حکم ہے" کی حوالگی سے قطعی طور پر نا آشنا ہے۔ بے نیاز ہے۔

رحمٰن اور میں پرانے ساتھی ہیں۔

رحمٰن کو میں اس زمانے سے جانتا ہوں جب اس نے عنفوانِ شباب میں قدم رکھا تھا۔ خوش شکل تھی خوش مزاج تھی۔ باتوں کی پھلجھڑیاں ورثے میں پائی تھیں۔ ایک بے نام پراسرار مگر خطرناک جاذبیت تھی۔

آنکھوں پر گھنی بھویں اور پیشانی کے درمیان ایک گھوری تھی جو گھورتی بھی تھی۔ گھورتی

کم کم پچکارتی زیادہ۔ میں زندگی بھر جنس کا طالب علم رہا ہوں۔ جنسی ماہرین نے مجھے وارننگ دے رکھی تھی کہ جس کی آنکھوں پر گھنی بھویں ہوں اور پیشانی پر گھوری ہو اس سے بچ کر رہنا۔ لیکن رحمٰن سے بچ کر رہنا ممکن نہ تھا۔ رحمٰن کی شخصیت کا جزو اعظم یہی ہے کہ اس سے بچ کر رہنا ممکن نہیں۔

پھر رحمٰن نے دیکھتے ہی دیکھتے سر پر دو سینگ نکال لیے۔ ایک ذہانت کا دوسرا کر دکھانے کا۔ اور مجھے پتہ چل گیا کہ وہ جن ہے۔

بشریٰ رحمٰن جاگیردارنی تھی۔ رحمٰن نودولتیا تھا۔ یہ رکھ رکھاؤ کی گود میں پلی تھی۔ وہ "ٹپر واسیا" تھا۔ یہ کومل تھی وہ تیور تھا۔ یہ بھیرویں تھی وہ دیپک تھا۔ شبنم اور شعلے کا میل دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ میں نے رحمٰن سے پوچھا یہ سبز پری کہاں سے اُٹھا لایا ہے تو بولا ہمارے نصیب میں سبز پریاں ہی لکھی ہیں۔ میں نے کہا اب ہو گا کیا۔ بولا اب ہم اس کی رکشا کریں گے۔ میاں بیوی کے تعلق کے اسرار سمجھنا میرے جیسے کتابی آدمی کے بس کی بات نہیں تخلیہ کے بھید کس نے جانے ہیں۔ وہاں منہ زبانی دعوے نہیں چلتے۔ پتہ نہیں کون کس کی رکشا کر رہا ہے۔ رحمٰن کی طرف دیکھتا ہوں تو لگتا ہے کہ وہ بشریٰ کی رکشا کر رہا ہے۔ بشریٰ کی طرف دیکھتا ہوں تو لگتا ہے جیسے وہ رحمٰن کی رکشا کر رہی ہے۔ شاید دونوں ہی ایک دوسرے کی رکشا کر رہے ہوں۔

دوسری بار دیکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بشریٰ ادبی دنیا میں چوکڑی مارے بیٹھی ہے اس کی تحریر کی رنگینی اور روانی نے دھوم مچا رکھی ہے۔ اس کی تصنیفات تعداد میں یوں بڑھتی جا رہی ہیں جیسے برسات میں کھنبیاں اُگتی ہیں۔ یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی۔ یہ تخلیق کار بہت پیاری لگی۔ ادب تخلیق کرنا خاصا مشکل کام ہے لیکن صاحبِ کتاب بننا بے حد کٹھن مرحلہ ہے۔ چونکہ پبلشر نہیں ملتا مل بھی جائے تو ایک کتاب شائع کرنے کے بارہ پندرہ ہزار مانگتا ہے۔ میں نے رحمٰن سے پوچھا میں نے کہا یار اسے پبلشر کیسے مل گیا۔ بولا اس کا پبلشر میں ہوں ایسی خوبصورت کتابیں چھاپی ہیں کہ پبلشر کیا چھاپے گا۔ پھر پتہ چلا کہ بشریٰ کی تحریریں صرف پسند ہی نہیں کی جاتیں بکتی بھی ہیں۔



اس کی شہرت سمندر پار پہنچ چکی ہے۔ اتنی مانگ ہے کہ وطن دوست بنانا پڑا۔ اس پر جی جل کر رہ گیا۔ ہم اتنی دیر سے جھک مار رہے ہیں۔ تحریر کو پسندیدگی بھی حاصل ہو گئی لیکن اوّل تو کتاب چھپتی نہیں اگر چھپ جائے تو بکتی نہیں۔ پھر یہ سوچ کر دل پر پتھر رکھ لیا کہ کہاں آدم زاد کہاں پری زاد۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ محترمہ اخباروں کے کالموں پر چڑھ گئی۔ ادبی محفلوں میں فی البدیہہ تقریریں کرنے لگی۔

میں نے رحمٰن سے پوچھا میاں یہ کیا ہو رہا ہے۔

بولا ہمارے ایما سے ہو رہا ہے۔ دوستو مرد ایک جنتی قوم ہے۔ اس کی خوش فہمیاں اسے لے ڈوبیں۔

میں نے میاں سے کہا دیکھو میں تجھے ہمیشہ سے کہتا آیا ہوں کہ لکھ لیکن تو نے دھیان نہیں دیا۔ بولا کیسے لکھوں بولنے سے فرصت ملے تو لکھوں۔ میں نے کہا احمق ڈکٹا فون گلے میں لٹکا لے جو بولتا ہے وہی لکھ دے کہنے لگا بول بلا رے میں جو دھما کا ہے وہ لکھنے میں کہاں۔ میں نے کہا اُسے دیکھ وہ جو لکھ رہی ہے۔ کہنے لگا اُسے بولنے کے میدان سے نکالنے کا یہی ایک طریقہ تھا۔

اب دیکھتا ہوں کہ بشریٰ سیاست میں جا گھسی ہے۔ یہ کیسے ہوا۔ یہ تو ممکن نہ تھا۔ ادب اور سیاست تو آگ پانی ہیں۔ ادب میں دل کی بات کہہ دو تو بات بنتی ہے۔ سیاست میں خبردار دل کی بات ہونٹوں پر نہ آئے۔

سیاست تو اِک گورکھ دھندہ ہے چپ رہو تو مشتبہ لہٰذا لازم ہے کہ بولتے رہو۔ لیکن دل کی بات زبان پر نہ آئے۔

پھر خیال آیا کہ بشریٰ بڑی سیانی ہے۔ کسی کی چمچی بن کر اپنا راستہ نکال لے گی۔

ارے وہ تو فلور پر کھڑی ہو کر پٹاخ پٹاخ باتیں کرنے لگی۔ دوسروں کو ڈانٹنے لگی۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دلیلیں جھاڑنے لگی۔

میں نے رحمٰن سے کہا اب بولو۔ بولا ابھی تو ہم نے ہاؤس میں ہراول دستہ بھیجا ہے۔

بشریٰ سے میں نے کہا بی بی یہ کس رنگ میں رنگی گئی ہو۔ بولی شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک۔ اس ہر رنگ میں جلنے والی شمع سے اب مجھے ڈر آنے لگا ہے۔

☆



۱۹۸۰ء

# پاکیزہ

میں نقاد نہیں ہوں۔ شعر کے جمالیاتی محاسن سمجھتا نہیں۔ محسوس کرتا ہوں۔ حظ اٹھاتا ہوں۔ وہ شعر جو سوچتے ہیں ان کا رعب ضرور کھاتا ہوں۔ لیکن بھیگتا نہیں۔ کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔

ذہنی دھماکہ طوفان کی طرح جھنجھوڑتا ہے۔ مدھم لہریں بہا کر لے جاتی ہیں۔

میں اکثر سوچا کرتا یہ ادا جعفری کون ہے۔ شعروں میں اتنے کومل سُر کیسے لگاتی ہے۔ کومل ہی کومل۔ مدھم ہی مدھم تیور کا نام نہیں۔ ہلکے پھلکے برائے نام الفاظ۔ اشارے ہی اشارے، الفاظ سے نہیں اشاروں سے بات کرتی ہے۔ پھر اتنی شگفتگی، اتنی سادگی، اتنی معصومیت۔ ایسے لگتا ہے جیسے سارنگی کی طرح تاروں سے بنی ہو۔ جبھی جگہ جگہ مینڈھ لگاتی ہے۔ پلا مار کر دیا بجھاتی ہے۔ زیرلبی میں بات کرتی ہے۔

پھر مجھے پتہ چلا کہ ادا کراچی کی رہنے والی ہے۔ نہیں نہیں میں نے کہا وہ کراچی کی نہیں ہو سکتی۔ کراچی کی ہوتی تو لفظوں کے جال بنتی۔ کتر کتر باتوں کے ڈھیر لگاتی۔ گونگی نہ ہوتی۔ اشاروں کے سہارے نہ لیتی۔

پھر ایک روز کسی ادبی جریدے میں مَیں نے ادا کی تصویر دیکھ لی۔ دیکھا کہ ایک معزز معتبر خاتون بیٹھی ہے۔۔۔ نہیں نہیں یہ ادا جعفری نہیں جو ساز ڈھونڈتی رہی۔ یہ خاتون ڈھونڈ کی ماری ہوئی نہیں۔ یہ تو "پالینے" کی ماری ہوئی ہے۔ رکھ رکھاؤ کی ماری ہوئی ہے۔ سنجیدگی ہے۔ ٹھہراؤ ہے۔ بہاؤ نہیں۔۔۔ اور پھر یہ تو خاتون ہے۔ وہ تو لڑکی تھی۔ لڑکی ہی لڑکی۔ رواں مگر مدھم۔ رنگین مگر لطیف۔

پھر اتفاق سے جعفری سے ملاقات ہوئی۔ شہاب اور میں کہیں سے آرہے تھے۔ راستے میں شہاب رُک گئے بولے اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو جعفری صاحب سے ملتے جائیں۔

میں نے کہا ضرور ملیے مگر یہ کون صاحب ہیں۔

بولے فنانس ماسٹر ہے۔ قابل آدمی ہے۔ بڑا افسر ہے۔ اچھا انسان ہے۔

فنانس قابلیت سے مَیں دبتا ہوں۔ رعب کھاتا ہوں لیکن قرب کی آرزو پیدا نہیں ہوتی۔ میری دانست میں فنانس کاٹھ ہوتا ہے جس میں بھیگ نہیں ہوتی۔ آج تک صرف دو ایک دانے دیکھنے میں آئے ہیں۔ جن میں عجز تھا۔ بھیگ تھی اور بس میرے ذاتی حساب کے مطابق فنانس ماسٹر میں چار ایک خصوصیات ہوتی ہیں۔

ایک تو علم ٹھوس ہوتا ہے۔ کچھ زیادہ ہی ٹھوس۔ اس میں لچک نہیں ہوتی۔ دوسرے اصول و قانون کچھ زیادہ ہی حاوی ہوتے ہیں۔ جن کے کھونٹے پر بشر لٹکا رہتا ہے۔ یوں جیسے کیکر کے درخت پر بیل چڑھی ہو۔ تیسرے ان میں فیصلہ کرنے کی قوت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ بشری تذبذب سے یکسر محروم۔ وہ یوں کھٹاک کھٹاک فیصلے کیے جاتے ہیں جیسے مشین چل رہی ہو۔ لمبی باتیں چھوڑیے، مجھے دو اور دو چار گننے والے لوگ پسند نہیں۔

جعفری کو دیکھ کر میں خاصا پریشان ہوا۔ اس لیے کہ فنانس کے باوجود وہ خوش مزاج تھا۔ قہقہہ لگاتا تھا اور اس میں عجز بھی تھا۔ یہ کیسا فنانس ماسٹر ہے جس میں خوش مزاجی ہے، عجز ہے، خیال آیا کہ شاید شوگر کوٹڈ ہو۔

پھر کسی نے آ کر قاعدہ قانون اور پروسیجر کی بات چھیڑی تو جعفری باہر نکل آئے بڑے طمطراق سے نکلے سورج سوا نیزے پر آ کھڑا ہوا۔

واپسی پر شہاب نے بتایا کہ جعفری، ادا کے میاں ہیں۔ میں چونکا۔ نہیں نہیں شہاب جی کومل شاعرہ پر فنانس مسلط نہ کیجیے۔ یہ ظلم ہے۔ شہاب نے حسب عادت جعفری کی خوبیاں گنوانی شروع کر دیں۔ جوں جوں وہ جعفری کی خوبیاں بیان کرتے چلے گئے توں توں میرے دل میں ادا کے لیے ہمدردیاں پیدا ہوتی گئیں۔ اتنی ہمدردی پیدا ہوئی کہ جی چاہتا تھا کہ رو دوں۔



پھر ایک دن ادا سے ملاقات ہو گئی۔

شہاب مجھ سے کہنے لگے اگر آپ مصروف نہ ہوں تو چلیے ایک ادبی محفل میں شرکت کریں۔

کہاں؟ میں نے پوچھا۔

بولے ادا جعفری کے گھر۔

ادا جعفری؟ میں اُچھلا۔

ایک معتبر، معزز کلچرڈ خاتون میرے روبرو بیٹھی تھی۔

میں سوچ میں گم تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھ پر اوس طاری ہو گئی۔ میرے سارے اندازے، مفروضے غلط ثابت ہو رہے تھے۔ نفسیات کے بارے میں میرا سارا مان ٹوٹ گیا تھا۔ معزز خاتون اور ادا کے کلام میں کوئی ربط نظر نہیں آ رہا تھا۔

میں نے پوچھا۔ آپ ادا جعفری ہیں۔

اس نے بولے بغیر سر اثبات میں ہلا دیا۔

میں نے کہا وہی جو ساز ڈھونڈتی رہی۔

وہ مسکرائی اور پھر سر اثبات میں ہلا دیا۔

میں قریب تر ہو گیا۔ زیرلبی میں نے کہا۔ آر یو شیور میڈم۔

سرخی کی ایک لہر ادا کے چہرے پر ادھر سے ادھر تک دوڑ گئی۔ اس میں غصہ بھی تھا، مان بھی تھا۔ اور باقی لاج ہی لاج۔ لاج ہی لاج۔ پھر جو میں نے اس کی آنکھ کی طرف دیکھا تو رنگ پچکاری سے شرابور ہو گیا۔ ہاں وہی ہے۔

وہ لڑکی یوں باہر نکل آئی جیسے نقاب تلے سے دلہن نکلتی ہے۔ وہی مدھم مدھم، کومل کومل، وہی شگفتگی، وہی لطافت، وہی تاریں ہی تاریں، سرتیاں، سمرتیاں وہی اشارے بھری مینڈھ، وہی زیرلبی۔

ارے یہ تو وہی لڑکی ہے جسے معزز خاتون نے سات پردوں میں ملفوف کر رکھا ہے۔ جسے اس بیوروکریٹ بنگلے نے جھوٹا روپ دے رکھا ہے۔ لیکن تمام کوائف ملفوف کرنے کے

سو لڑکی کا کچھ بگاڑ نہیں سکے۔ سات پردوں کے باوجود وہ بڑی آن بان سے جی رہی ہے۔

اس روز اس لڑکی سے میں بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ بہت کچھ جاننا چاہتا تھا۔ لیکن وہ معزز خاتون میرے راستے میں حائل تھی۔ بار بار لڑکی کے گرد چادر تانگ دیتی اور وہ فنانس ماسٹر جو حقیقت پسندی اور "پریکٹی کیلیٹی" کا قائل تھا اُس خوابوں سے بھرپور دوشیزہ کے گرد چاردیواری کھڑی کر دیتا۔

اس کے باوجود میں کچھ نہ کچھ پوچھ لیتا پالیتا۔ دقت یہ تھی کہ وہ لڑکی گونگی تھی۔ حلق میں آواز نہ تھی۔ صرف آنکھوں میں رنگ پچکاری چلتی چہرے پر حیا کی سرخی لہریں لیتی۔ اور پھر نگاہیں جھک جاتیں اور بس۔

ادا جعفری وہ معزز اور متمدن خاتون نہیں جو نورالحسن جعفری کے گھر میں آپ کو ملے گی۔ نہایت شائستگی سے آپ کے مزاج پوچھے گی۔ بڑے رکھ رکھاؤ سے آپ کی تواضع کرے گی۔ کسی متنازعہ امر میں ہنکارہ نہیں بھرے گی۔ سر نہ اثبات میں ہلائے گی نہ نفی میں۔ بین بین مسکراہٹ سے بات ٹال جائے گی۔ نہیں یہ وہ ادا جعفری نہیں جو ساز ڈھونڈتی رہی یہ تو چلنت تال کی میوزک سے گھری ہوئی خاتون ہے جہاں رکھ رکھاؤ کا ساز ہی ساز ہے۔ جہاں بیوروکریٹک دانش کی بیک گراؤنڈ میوزک کی آواز ہی آواز ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ یہ ماحول اس لڑکی کا کچھ بگاڑ نہیں سکا اور وہ اب بھی اس خاتون کے پہلو میں بیٹھی ساز ڈھونڈ رہی ہے اور مسلسل اپنے وجود کا راز۔ غزالاں تم تو واقف ہو۔ کی زیرلبی سے افشاء کیے جا رہی ہے۔

اس لڑکی کی کہانی دورُخی ہے اوپر سے سیدھی سیدھی۔ کوئی بل نہیں۔ نہ مد نہ جزر اندر سے وکر ٹیڑھی ٹیڑھی مد پھر جزر پھر مد۔ اوپر ٹھہراؤ ہی ٹھہراؤ، اندر "ڈب چھلکیاں" ڈوب تیر ڈوب۔ اوپر زمینداری حویلیوں کے پھول ہی پھول اندر تضادات کے کانٹے ہی کانٹے۔ لہولہان کانٹے۔

یہ لڑکی ۲۲۔ اگست ۱۹۲۶ء کو بدایوں میں ایک بڑے زمیندار کی حویلی میں پیدا ہوئی نام عزیز جہاں رکھا گیا۔ باپ مولوی بدرالاسلام خاندانی وڈیرا تھا۔ ساتھ ہی پکا مسلمان بھی،



گھر میں نوابی ٹھاٹھ اور اسلامی رنگ یوں ملے جلے تھے جیسے مالٹے میں کھٹاس اور مٹھاس ملے جلے ہوتے ہیں۔

باہر خاندانی رکھ رکھاؤ اور روایت کے سوا کوئی پابندی نہ تھی۔ اندر بند بند بندھا ہوا تھا۔
باہر آرام دہ زندگی تھی اندر بے چینی ہی بے چینی۔ باہر حکومت تھی دبدبہ تھا۔ اندر خوف منہ پھاڑے بیٹھا تھا۔ بے نام خوف۔ بے مقصد جھجک۔ باہر چہل پہل تھی۔ اندر لق و دق تنہائی۔
باہر آوازوں کا میلا لگا ہوا تھا۔ اندر خلا سی چپ۔

اس لڑکی کی نفسیت کے تین جزو اعظم تھے۔ گونگی، تنہا، سہمی ہوئی۔

جس طرح تار اور لرزش مل جائیں تو سر پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح گونگا پن اور تنہائی مل جائیں تو شعر برسنے لگتے ہیں۔

ادا کی بدقسمتی یہ تھی کہ قدرت کی طرف سے شعر و سخن کی صلاحیتیں عطا نہیں ہوئی تھیں بلکہ اسے گھڑی گھڑائی بنی بنائی شاعرہ بنا کر پیدا کیا گیا تھا۔ فن قدرت کی ایک ایسی دین ہے جو بیک وقت رحمت بھی ہے اور عذاب بھی۔ فن کی جھاڑی پر جب تک پھول پتیاں نہیں پھوٹتیں۔ مسلسل عذاب رہتا ہے، جب پھول لگتا ہے تو دو آتشہ ہو جاتا ہے۔

ادا کا بچپن بڑا کربناک تھا۔ بظاہر سبھی کچھ حاصل تھا۔ بباطن بے چینی اور ویرانی تھی۔ خوشگوار ماحول اور اکتاہٹ تھی۔ کوئی کھیل اچھا نہ لگتا تھا۔ کوئی تفریح جاذب نظر نہ تھی۔ بچپن مسلسل رو رو کر کاٹا۔ یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کیوں روتی ہوں۔ کیوں اداس ہوں۔ کیوں اکتائی ہوئی ہوں۔

بچپن ہی سے والد سے محبت لگا بیٹھی۔ اسے دیوتا بنا لیا۔ بن بتائے چپ چاپ آرتی پھولوں سے سجا کر فادر فکسیشن، شاید اس لیے ضروری تھا کہ ادا کی نفسیت کی تین خصوصیات کو ایک رُخ دے کر شعر و سخن کی آمد کو ہموار کیا جائے۔

جب وہ تین سال کی تھی تو باپ وفات پا گئے۔ ادا پر یہ راز کھولا نہ گیا۔ اس سے کہہ دیا گیا کہ والد بیمار ہیں اور علاج معالجے کے لیے باہر گئے ہوئے ہیں۔ سالہا سال ادا والد کا انتظار کرتی رہی۔ روتی رہی۔ دعائیں مانگتی رہی کہ ابا لوٹیں اور میں انہیں ابا کہہ کر بلانے کی

خوشی حاصل کر سکوں۔ ان دنوں اسے سب سے بڑا دکھ یہ تھا کہ کوئی ہو جسے ابا کہہ کر بلایا جا سکے۔ پھر والدہ کو ترس آ گیا۔ لڑکی کو باپ کی قبر پر لے گئیں۔ اسے سمجھایا کہ والد وفات پا چکے ہیں واپس نہیں آئیں گے۔ کبھی نہیں۔ دکھ ہوا لیکن انتظار کی گھڑیاں گننے سے مخلصی حاصل ہوئی۔ قید سے رہائی مل گئی۔

اگر نفسیت میں ایسے عناصر موجود ہوں جو گردوپیش سے رابطہ پیدا ہونے نہ دیں تو ایک ان جانی سمت سے تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ آپ اسے ماورا کہہ لیں انوویشن یا روحانی دنیا کہہ دیں۔ کچھ کہہ لیں۔ بہر طور ادا کے دل میں انوویشن کی حس بیدار ہو چکی تھی۔ یہ خصوصیت آج بھی موجود ہے۔ آپ اس کی آنکھوں کی طرف دیکھیں ان میں ایک پھوار سی اڑتی رہتی ہے۔ لب بند ہوں اور آنکھوں میں پھوار اڑے تو تیسری سمت سے رابطہ کا بھید کھل جاتا ہے۔

والد کی وفات کے بعد بھی ادا اپنے نانا کی حویلی میں پرورش پاتی رہی۔ اس کے خاندان میں روایت تھی کہ شادی کے بعد لڑکی کی رخصتی نہیں کی جاتی تھی۔ دولہا گھر جوائی کی حیثیت سے رہتا تھا۔

خاندان کی روایت کے مطابق لڑکی کو مکتب میں نہیں بھیجا جاتا تھا تھوڑی بہت تعلیم گھر پر ہی دلوا دی جاتی۔ والدہ نے ادا کی توجہ کتابوں کی طرف مبذول کر دی۔ لیکن حصول تعلیم سے بہت پہلے اندر کے چھپے کی بوٹی نے سر اٹھایا اور جان لباں تے آئی ھو۔ ۹ سال کی عمر میں پہلی نظم ''پکار'' یوں باہر نکلی جیسے بچے کا پہلا دانت باہر نکلتا ہے۔ ۱۲ سال کی عمر میں ادا چھپنے لگی۔ چھپنے کی خواہش نہ تھی۔ پبلسٹی سے جب بھی خائف تھی آج بھی ہے۔

ظاہر ہے کہ ادا کے پاس اس عمر میں کچھ بھی نہ تھا۔ نہ مطالعہ، نہ تجربہ۔ کھاتے پیتے نوابی گھر میں مطالعہ کی نہ حاجت تھی، نہ اہمیت۔ گونگے اور اکیلے پن نے بیرونی دنیا سے رابطہ قائم نہ ہونے دیا۔ لہٰذا مشاہدہ اور تجربہ کی گنجائش ہی نہ رہی۔ ادا کے پاس لے دے کر صرف ایک ریسیور تھا۔ پتہ نہیں بولنے والے سرے پر کون تھا۔ کوئی تھا۔ جس کا پیغام موصول کرنے پر ادا مجبور تھی جس طرح انڈا دینے کے وقت مرغی کونے تلاش کرتی ہے اور بالآخر صندوق کے نیچے جا بیٹھتی ہے۔ اسی طرح ادا کونے تلاش کرنے پر مجبور ہوتی۔ اس نے سٹور روم میں صندوقوں کے اوپر ایک کونہ بنا رکھا تھا۔ وہاں بیٹھ کر لکھتی۔ اس پیغام میں کوئی ترتیب نہ ہوتی تھی۔ لیکن ساتھ احساس ضرور ہوتا کہ یہ مصرعہ پہلا نہیں آخری ہے۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا مطالعہ کا جنون بڑھتا گیا۔ والدہ نے سکول بھی بھیجا لیکن جلد ہی اٹھا لیا۔ پھر ایک ٹیوٹر رکھ دیا۔ پرائیویٹ طور پر میٹرک کیا۔ ایف اے کا کورس بھی گھر پر ہی پڑھا۔

منجھلی بہن کے میاں جمال احمد رضوی سے بہت متاثر ہوئی۔ رضوی نے کتابوں کے چناؤ اور حصول میں بہت مدد کی۔

کتابوں کے سوا زندگی میں اور کوئی مشغلہ نہ تھا۔ گھر کے کام کاج سے قطعی دلچسپی نہ تھی۔ نہ پکیرا نہ سوئی سلائی۔ کھانا پکانا شادی کے بعد میاں کے گھر میں سیکھا۔

جب کتابیں ہی اوڑھنا بچھونا ہوں تو امکان غالب ہوتا ہے کہ زندگی کتابی بن کر رہ جائے۔ علم کی عظمت سے انکار نہیں لیکن اگر زندگی سے بے تعلق ہو تو وہ عفریت بن جاتا ہے۔ بنا دیتا ہے ادا کے زندگی سے بے تعلق ہونے کے باوجود مسلسل مطالعہ اسے کتابی نہ بنا سکا۔ علم عفریت نہ بنا سکا۔ ریسیور کے دوسرے سرے سے تازہ ہوا آتی رہی بانسری میں پھونک بھرتی رہی۔ تاروں میں لرزش رواں دواں رہی نغمہ پیدا ہوتا رہا۔ ادا لکھتی رہی موضوع صرف ایک تھا، شعر و سخن یا تو شعر کہتی اور یا تو شاعری پر تنقیدی مضامین لکھتی۔

۲۱ سال تک ادا کی زندگی سپاٹ رہی۔ خارجی طور پر سوائے ایک واقعہ کے کچھ بھی وقوع پذیر نہ ہوا۔ اس واقعہ کو کسی نے اہمیت نہ دی ویسے بظاہر وہ اہمیت کا حامل بھی نہ تھا۔

ان دنوں ادا چھوٹی سی بچی تھی۔ والد بقید حیات تھے۔ حویلی کے برآمدے میں کچھ مجذوب آ کر ٹھہر گئے۔ پتہ نہیں وہ کہاں سے آئے تھے۔ کسی کو انہیں وہاں سے اٹھانے کی ہمت نہ پڑی۔

انہیں کھانے پینے کی چنداں حاجت نہ تھی۔ کسی نے دیا تو کھا لیا نہ دیا تو نہیں کھایا۔ دیا بھی تو نہ کھایا۔ بس ہر وقت اللہ ہو کا ورد کیا کرتے۔ عجب مستی اور سرشاری سے اللہ کا نام لیتے۔ ادا نے ان کا نام اللہ ہو رکھ دیا۔ انہوں نے بھی ادا کا نام اللہ ہو رکھ دیا۔ پاس بٹھا

لیتے۔ تربوز کے بیج منہ سے نکال نکال کر ادا کو کھلاتے۔

ایک بار مجذوب جوش میں آ کر اٹھے اور چل پڑے۔ ادا بھی پیچھے پیچھے چل پڑی۔ اتفاقاً ابا جان نے دیکھ لیا اور بچی کو اٹھا لائے۔ ادا کا واپس آنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ اللہ ہو سے اس قدر مسحور ہو چکی تھی۔

بہر حال ۱۲ سال تک ادا کی زندگی سپاٹ رہی۔ اللہ کے سوا کوئی واقعہ ظہور پذیر نہ ہوا۔ نہ مد نہ جزر۔ مجھے یقین ہے کہ جوانی بھی اسے اپنی طرف متوجہ نہ کر سکی۔ داخلی طور پر صرف تاروں کی لرزش تھی۔ وہ تاریں جو قدرت کی طرف سے اسے عطا ہوئی تھیں جن تاروں کو کوئی ان جانا ہاتھ چھیڑے رکھتا تھا۔

ازلی طور پر ادا میں محبت کے جذبے کی فراوانی تھی۔ شدت کی محبت نہیں۔ مدھم محبت سے یوں سرشار تھی جیسے گنا رس سے بھرا ہوتا ہے۔ پہلے محبت والد پر مرکوز ہو گئی ان کے انتقال کے بعد اس کا رُخ بچوں کی جانب مُڑ گیا۔ اسے بچے بہت پیارے لگتے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید شادی اس کے لیے کبھی قابل قبول نہ ہوتی۔ اکیلی تنہا۔ ڈری ہوئی۔ سہمی سہمی بے زبان گونگی شخصیت کے لیے شادی کا خیال ہی سوہانِ روح ہو جاتا ہے۔

۱۹۴۷ء میں اس کی شادی طے ہو گئی اور وہ ادا بدایونی سے ادا جعفری بن گئی۔

اس شادی کی کامیابی کے امکانات بہت کم تھے، نہیں کم نہیں، سرے سے تھے ہی نہیں۔

اس ازدواجی بہلی میں جو پہیے لگے تھے وہ ہم آہنگ نہیں تھے۔ ایک گول تھا دوسرا چوکور۔ میاں مکمل طور پر ایکسٹروورٹ تھے۔ بیوی کلیۃً انٹروورٹ۔ میاں خارجی علوم سے آراستہ تھے بیوی کے پاس تاروں کی رم جھم کے سوا کچھ نہ تھا۔ میاں حقیقت پسند تھے۔ بیوی خوابوں کی دنیا کی باسی تھی۔ میاں خاندانی رکھ رکھاؤ کے دلدادہ تھے۔ بیوی خاندانی رکھ رکھاؤ سے بیزار تھی۔ میاں بیوروکریٹ تھے۔ بیوی کے لیے یہ امر ایک رکاوٹ تھی۔

حیرت ہے کہ یہ شادی کیسے کامیاب ہو گئی۔

اس شادی کی کامیابی کے لیے ادا کے پاس صرف ایک چیز تھی۔ مدھم محبت کی مسلسل لرزش۔ جعفری کی نسبی اور ذاتی شرافت نے اس شادی کو کندھا دیئے رکھا۔



اس کامیابی پر دونوں ہی نشانِ امتیاز کے مستحق ہیں۔

اس ظاہری کامیابی کے باوجود ادا میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ وہی ادا رہی۔ اکیلی، تنہا، گونگی، اُدھر سے ان جانی چھیڑ ادھر تاریں ہی تاریں۔ میاں اس نظر سے اوجھل راز کو نہ سمجھے۔ انہوں نے ادا کی شخصیت کے اس پہلو کو نہ سمجھا نہ قبول کیا۔ بچے بڑے ہوئے تو وہ بھی بے گانہ رہے۔

ادا نے مجبوراً اس رستے بستے گھر میں الگ سے ایک خفیہ گوشہ بنا لیا جہاں بیٹھ کر وہ انجانے شام مراری کی بانسری سنتی۔ سر دھنتی اور گھر والے حیران ہوتے کہ شدھ کس نے بسرائی۔ یہ من بستی کہاں سے آئی۔

شادی کے بعد ادا نے ایک کام ضرور کیا۔ اس ڈر کے مارے کہ کہیں چوری نہ کھل جائے خود کو چھپانے کے لیے خود کے گرد احتیاط کا دبیز جال بن کر وہ خاتون تخلیق کر لی جو آج جعفری کے گھر میں بیگم جعفری بنی بیٹھی ہے۔

اب بھی ادا کے لکھنے کے کوائف وہی پرانے ہیں۔ پہلے سٹور روم میں ٹرنکوں کے اوپر ایک کونے میں بیٹھ کر لکھتی تھی۔ اب وہ کونہ الگ نہیں۔ لیکن الگ ہے۔ ڈیڑھ اینٹ دکھائی نہیں دیتی لیکن مسجد جوں کی توں قائم ہے۔

وقت آنے پر ریسیور میں جھنجھناہٹ شروع ہو جاتی ہے۔ ایک بے نام اضطراب گھیر لیتا ہے۔ پھر رات کی گہری خاموشی میں ۷۰۰ بولتا ہے۔ جاگ اٹھتی ہے۔ لکھنے لگتی ہے۔ سوچتی نہیں پرکھتی نہیں۔ لکھے جاتی ہے پھر وقفہ آ جاتا ہے، پھر سو جاتی ہے۔ پھر جاگتی ہے، پھر لکھتی ہے، یونہی سوتی ہے جاگتی ہے لکھتی ہے۔

جب صبح ہوتی ہے تو پڑھتی ہے۔ ترتیب دیتی ہے۔ صاف کرتی ہے۔ پھر سرشاری کی کیفیت چھا جاتی ہے۔

یہ الہامی کیفیت جذبات کی شدت میں پیدا نہیں ہوتی۔ خارجی دنیا کی چکی کھٹا کھٹ چل رہی ہو تو رابطے کے امکانات دھندلے پڑ جاتے ہیں۔ شوراشوری ہلچل میں ریسیور کام نہیں کرتا۔ لاتعلقی ہو گہرا سکون ہو تو رابطہ پیدا ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔

شادی کے بعد ۱۹۴۸ء میں ادا کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔ لیکن اس کی زندگی نے وفا نہ کی۔ ادا کو اتنا صدمہ ہوا کہ رواں رواں ہو کر رہ گئی۔ دو سال کمیونیکیشن کا سلسلہ بند رہا۔ دو سال کے بعد بچی پیدا ہوئی۔ ممتا جاگی۔ یوں جیسے بوتل سے جن نکلتا ہے۔ دو سال ماں نے شعر کہنے نہ دیا۔ کوشش بہت کی لیکن بیکار۔ رابطہ بحال نہ ہوا۔

پھر جعفری کے بھائی ضیاء الدین عباسی کی شہادت کی خبر آئی تو نہ جانے کیا ہوا۔ دفعتاً زنگ آلود تاروں میں لرز پیدا ہوئی۔ رابطہ بندھا۔ ”میرے شہید“ کی تخلیق ہوئی اس ۷۰۰ کا بھید نہیں کھلتا کون جانے کن حالات میں چپ سادھ لے۔

جب وہ زیر لبی جاری کرتا ہے اور تخلیق عمل میں آتی ہے تو ایک عجیب سی سرشاری سرمستی چھا جاتی ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ادا کو اپنا کلام سنانے سے دلچسپی نہیں۔ حالانکہ عام طور پر شاعر کے لیے سنانا ایک مجبوری ہے ایسی مجبوری جو زچ کر کے رکھ دیتی ہے۔ لیکن ادا اس مجبوری سے آزاد ہے۔ بے نیاز ہے۔ اسے تخلیق کی سرشاری سے تعلق ہے۔ سنانا لازم نہیں۔ کوئی داد دے نہ دے۔ اس کے لیے چنداں فرق نہیں پڑتا۔ الٹا پبلٹی سے وہ بہت خائف ہے۔

بچپن سے ہی وہ اکثر خواب دیکھا کرتی تھی۔ دیکھتی کہ وہ اللہ کے حضور سر نوائے باادب کھڑی ہے۔ دفعتاً اللہ میاں کی گرج دار آواز آتی۔ لڑکی تو کس سے ملنا چاہے گی۔ گھبرا جاتی۔ کہتی اللہ حضور مجھے غالب سے ملوا دیجیے۔ حافظ سے ملوا دیجیے۔ بچپن میں پیروی کی لگن تھی پھر آہستہ آہستہ انفرادیت کی آرزو جاگی۔

فیض کے اسلوب سے متاثر ہوئی۔ مسلک سے نہیں۔

سچی بات یہ ہے کہ ادا کی مرضی کو کون پوچھتا تھا۔ اس نے کب چاہا تھا کہ میں تار ہی تار بن جاؤں جسے کوئی انجانا ہاتھ چھیڑتا رہے۔ اس نے کب چاہا تھا کہ کسی کی مرلی کی دھن پر رقص کرے۔ اس نے کب چاہا تھا کہ اس کے روح میں کوئی چمپے کی بوٹی رکھ دے جو زندگی بھر اندر مشک مچائے رکھے اور جان پھلسن پر آئی رہے۔

☆

عزیز ملک

۱۹۶۸ء

# رند

عزیز ملک کی شخصیت بڑی ہی سپاٹ ہے۔ نہ مد نہ جزر، نہ جوار نہ بھاٹا، خالی پھیلاؤ ہی پھیلاؤ۔ سمندر سا پھیلاؤ۔ نہ حرکت نہ سمت۔ دقت یہ ہے کہ حرکت نہ ہو تو پھیلاؤ دِکھتا نہیں۔

عزیز ملک کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ دیکھتا ہے دِکھتا نہیں۔

عزیز ملک کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ وہ دِکھتا نہیں صرف دیکھتا ہے۔

اسے ہزار بار سمجھایا ہے کہ بھائی دیکھنے کا زمانہ لد گیا، اب دِکھنے کا دور ہے۔ اپنا پھٹیچر پن چھوڑو اور دِکھو لیکن وہ نہیں سمجھتا۔ اگر وہ ناسمجھ ہوتا تو مجھے صبر آ جاتا۔ شکایت یہ ہے کہ وہ سب سمجھتا ہے اور اس کے باوجود نہیں سمجھتا۔

وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ کبھی دیکھنے کا دور ہوتا ہے کبھی دِکھنے کا۔ کبھی سننے کا دور آتا ہے کبھی بولنے کا۔ آج بولنے کا دور ہے۔ لیکن عزیز ملک آج بھی اس قدر ہمہ تن گوش ہے کہ بولنے کا ہوش نہیں۔

اب آپ ہی بتائیے ایسے انسان کا کوئی کیا کرے۔

میں نے عزیز ملک کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ وہ ایک عالم ہے۔

طنز سے نچڑتا ہوا ناقد ہے۔ صاحب حال فقیر ہے۔ سالہا سال بزرگوں کی حاضری سے فیض یافتہ سالک ہے۔ لیکن افتاد طبع کی وجہ سے مجذوب ہے۔ صاحب طرز ادیب ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک عطا کردہ قلم ہے جو وقت اور عمر کی دست برد سے بے نیاز ہے۔ لیکن اس کا یقین ڈانواں ڈول ہے اور وہ ڈوب جھلکے کھاتا رہتا ہے۔

عزیز ملک جو دیکھنے میں بڑا معزز اور محترم ہے درپردہ ایک طرح دار اور رنگ رنگیلا رند بھی ہے۔ عالمِ دین ہونے کے علاوہ اسے پنڈت کوکاناتھ کے کام شاستر پر بھی مکمل عبور حاصل ہے۔ عملی نہیں۔ صرف علمی۔

پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ مگر ایسا ہوتا ہے کہ کچھ لوگ بہت کچھ ہونے کے باوجود کچھ نہیں ہوتے اور کچھ لوگ کچھ بھی نہیں ہونے کے باوجود بہت کچھ ہوتے ہیں۔

عزیز ملک کے کردار میں دو باتیں بڑی اہم ہیں۔ وہ بلا کا خوددار ہے۔ اور حد درجہ زُود رنج ہے۔ قدرت بڑی تماش بین ہے۔ عزیز ملک کا تماشہ دیکھنے کے لیے قدرت نے اس کی طبعی خودداری اور زود رنجی کے سونے پر ایک سہاگہ چھڑک دیا۔ عزیز ملک کی زندگی کو ہینڈ ٹو ماؤتھ بنا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عزیز ملک کسی کے قریب نہیں جاتا۔ کسی کو قریب آنے نہیں دیتا۔

عزیز ملک کو دنیا کے خلاف سخت شکایت ہے کہ اس کی قدر نہیں کی۔ اسے سرِ راہ چلتے ہوئے دیکھئے نگاہ نیچی۔ گردن لٹکی ہوئی۔ بند بند۔ گردوپیش سے بے تعلق۔ کمر خمیدہ۔ یوں نکل جائے گا جیسے کٹی ہوئی پتنگ ہو۔ اس کے انداز میں دبا ہوا غصہ ہے۔ شکایت ہے۔ بے شک دنیا نے اس کی قدر نہیں کی جس کا وہ مستحق تھا۔

عزیز ملک کی یہ خامی ہے کہ وہ یہ نہیں دیکھتا کہ اسے کیا کچھ ملا۔ یہ دیکھتا ہے کہ کیا نہیں ملا۔ عزیز ملک کو ذہن اور کردار کی صلاحیتیں ملیں۔ علم اور ادب کے ساتھ ساتھ عمل کی توفیق عطا ہوئی۔ ایمان کے ساتھ ساتھ دیکھنے والی آنکھ ملی۔ بڑے ادیبوں اور علماء کا قرب نصیب ہوا۔ بزرگوں اور اولیاء نے پاس بٹھایا۔ طریقت اور شریعت دونوں مزے چکھنے کو ملے۔ قلم کو قوت عطا ہوئی۔ تقریر میں اثر ملا۔ اتنا کچھ ملا۔ لیکن عزیز ملک یہ نہ بھول سکا کہ کیا نہ ملا۔

عزیز ملک کی کیفیت ایک روٹھے ہوئے بچے کی مصداق ہے جسے پورا حصہ نہ ملا ہو اور جو ملا اسے احتجاجاً یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ پورا نہیں دیتے تو یہ بھی لے لو۔

بے شک حالات نے عزیز ملک سے انصاف نہ کیا لیکن عزیز ملک نے خود پر اس سے بھی بڑا ظلم ڈھایا۔ سر کی پگڑی جو اللہ نے عطا کی تھی، جو دکھتی تھی اسے نہ دیکھا۔ کلکتہ دفتر کی کلرکی جو دکھتی نہیں تھی، اسے دیکھتا رہا۔ ادبی صلاحیت جسے ادبی حلقوں نے جانا تھا مانا تھا اسے نہ دیکھا۔ چھپنے کی خواہش جو ضمنی تھی اسے حسرت بنا کر سینے سے لگائے رکھا۔



عزیز ملک سے میں ۱۹۵۱ء میں متعارف ہوا۔ ان دنوں حلقہ اربابِ ذوق میں عزیز ملک کی صاحبِ طرز حیثیت سے بڑی دھوم تھی۔ میں اس کی طرزِ نثر نگاری سے بہت متاثر ہوا۔

پھر یوسف ظفر کے توسط سے اس کے قریب جانے کا موقعہ ملا تو یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ وہ صرف ادب لکھتا ہی نہیں بلکہ ادب بولتا بھی ہے۔

عزیز ملک کی عام روزمرہ زندگی کی گفتگو ادبی رنگ میں رنگی ہوتی ہے۔ اس میں مزاح کا رنگ بھی ہوتا ہے لیکن وہ طنز کا بادشاہ ہے۔ طنز کی دھار ایسی چلاتا ہے کہ کاٹ کر رکھ دیتا ہے لیکن عزیز ملک محفل میں بند بند رہتا ہے۔ صرف اکیلے میں کھلتا ہے۔

اکیلے ادیب کا المیہ بھی عجیب ہے۔ کہنے کو ترستا ہے۔ سنانے سے ڈرتا ہے، اکیلا یا تو دیوانہ ہوتا ہے اور یا تخلیقی۔ عزیز ملک دونوں ہے دیوانہ بھی تخلیقی بھی۔

میری زندگی میں عزیز ملک کی حیثیت سکندر اعظم کی سی ہے وہ آیا، مجھ سے پوچھے بنا۔ بتائے بنا۔ میری ذہنی مملکت کو تخت و تاراج کر کے واپس چلا گیا۔ جب وہ گیا تو میری ذہنی دنیا یوں چُور چُور تھی جیسے ہاتھی چینی کی دکان میں پھر گیا ہو۔

جب میں عزیز ملک سے ملا تھا، ان دنوں میں ایک آزاد منش تھا۔ پڑھا لکھا دانشور تھا، عقل کا قائل تھا دلیل کا پابند تھا۔ مغربی مشاہیر کا دلدادہ تھا۔ مذہب پر شرمندہ تھا۔ نہ میں خدا کو مانتا تھا نہ اسلام کو نہ پاکستان کو۔ سیکولرازم پر یقین رکھتا تھا۔ یہ زاویہ نظر میں نے دس بارہ برس کے مطالعے سے حاصل کیا تھا۔ پورے پچاس برس میں نے اینٹ اینٹ رکھ کر ایک عالی شان ذہنی ایوان تعمیر کیا تھا۔ عزیز ملک نے آ کر اسے موہنجو داڑو میں بدل دیا۔ لیکن الکھ نگری، علی پور کے ایلی کی دوسری جلد سے متعلق ہے۔

عزیز ملک نے تین چیزیں ورثے میں پائی ہیں۔ اسلام، طب اور ادب۔ اسلام اور طب والد صاحب کی دین ہیں، ادب کسی دادا پردادا کی۔

بدقسمتی سے بچپن ہی میں کسمپرسی کے ماحول نے حفظ ماتقدم کے تحت اسے مطالعہ میں

پناہ لینے کی چاٹ ڈال دی اور پیشتر اس کے کہ اسے احساس ہوتا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ گر ڈگر پر چل نکلا ہے۔ کہ اسے خمیازہ بھگتنا پڑے گا، وہ اسلام، طب اور ادب پر وسیع مطالعہ کر چکا تھا۔

بچپن میں عزیز ملک کو لاڈ پیار نہ ملا۔ بے فکری کی کیفیت میسر نہ آئی، سخت گیر باپ، ڈری سہمی ہوئی ماں۔ خشک زہر سے بھرا ہوا گھر۔ انا سے لت پت علم اور نیکی کے تکبر سے پھولا ہوا باپ۔ کڑکڑا ضبط، تلخی، تنگی، ترشی، اداسی، محرومی، کسمپرسی۔

ابھی نوجوانی میں قدم دھرا ہی تھا کہ زبردستی ازدواج کی زنجیریں پہنا دی گئیں۔ شریکِ حیات میں تمام خوبیاں موجود تھیں۔ شریکِ حیات بننے کی صلاحیت سے محروم تھی۔

اِدھر عزیز ملک نے جلالی طبیعت ورثہ میں پائی تھی۔

اُدھر محترمہ ضد کی پکی ملی۔ تباہ کن تصادم عمل میں آیا۔ دونوں میں سے کسی نے ہار نہ مانی۔ کسی نے سرِ تسلیم خم نہ کیا نتیجہ یہ ہوا کہ تصادم کی کیفیت ساری زندگی پر چھائے رہی۔ پھر اولاد جوان ہوئی تو وہ ماں کی طرف دار بن گئی۔ عزیز ملک بھرے گھر میں اکیلا رہ گیا۔ ایک اجنبی ایک بیگانہ۔

ملازمت کی تلاش میں بھی خوش نصیبی حاصل نہ ہوئی۔ کلکتہ دفتر میں معمولی سی کلرکی مل گئی۔ عزیز ملک نے دیکھا کہ اس کے لیے چاروں طرف دروازے بند تھے، مایوسی نے اس کی گردن لٹکا دی۔ کلرکی کو وہ کلنک کا ٹیکہ سمجھتا تھا۔ کیوں نہ سمجھتا۔ اس کے علم اور قابلیت کے سامنے کلکتہ دفتر کی کلرکی توہین کے مترادف تھی۔ عزیز ملک کی خواہش تھی کہ علمی ادبی کیریر ملے لیکن کلکتہ دفتر کی آسامی دو اور دو چار گننے تک محدود تھی۔

عزیز ملک کی محرومی میں ایک اور کیل ٹھک گیا۔ شاید پیہم احساسِ محرومی دینے سے قدرت کا یہ منشا تھا کہ درد اٹھتا رہے۔ ٹیسیں جاری رہیں۔ ناسور بہتا رہے۔ دکھ قائم رہے تاکہ تار لرزاں رہیں۔ نغمہ پیدا ہوتا رہے۔

عزیز ملک کی شخصیت جس قدر پھٹیچر ہے، ادب میں وہ اتنا ہی شوخ اور شوقین مزاج ہے۔ ہر صنفِ ادب میں عزیز ملک کا اسلوبِ بیان منفرد ہوتا ہے۔ تحریر میں وہ راہ چلتوں کو



چٹکیاں بھرتا ہے۔ مسخریاں کرتا ہے۔ فقرے کستا ہے۔ ساتھ ساتھ قاری کو آنکھ مار کر کہتا ہے کیوں کیسی رہی۔ وہ سرزمین ادب میں بے تکلف گھومتا ہے۔ موھڈے مارتا جاتا ہے جیسے کوئی مٹیار تنی ہو۔

عزیز ملک کی بدنصیبی یہ ہے کہ اتنا کچھ ہوتے ہوئے بھی اسے یقین نہیں آتا کہ سب کچھ ہے۔ اس میں خود اعتمادی کا فقدان ہے۔ عجز اور تفاخر کے درمیان وہ گھڑی کے پنڈولم کی طرح گھوم رہا ہے۔ ایک ساعت ایسی آتی ہے کہ جب وہ سمجھتا ہے کہ میں تو کچھ بھی نہیں۔ ایک ساعت میں وہ احساسِ تفاخر سے تن جاتا ہے۔ کوئی ہے جو میرے سامنے سر اٹھا سکے۔ اس کشمکش نے عزیز ملک کو تماشہ بنا رکھا ہے۔

عزیز ملک اب بھی اس بات کا محتاج ہے کہ کوئی اسے یاد دلائے کہ پگڑی اس کے سر پر جوں کی توں قائم ہے۔ یاد دلانے پر چند گھنٹے یا چند دن تک اسے تسلی رہتی ہے۔ پھر از سرِ نو شک پڑنے لگتا ہے۔

ایک روز حفیظ جالندھری کی موجودگی میں میں نے عزیز ملک کو پگڑی یاد دلائی۔ حفیظ جالندھری عزیز ملک کا پرانا دوست تھا۔ اس نے میری طرف گھور کر دیکھا۔ پھر مجھے ایک طرف لے گیا کہنے لگا۔ اسے پگڑی کا یقین نہ دلا۔ اگر اسے یقین آ گیا تو اس کے سر پر اتنا بوجھ پڑ جائے گا جسے یہ سہار نہیں سکے گا۔ ہمارے لیے مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ اور اس کی اپنی زندگی حرام ہو جائے گی۔ اسے تذبذب میں ہی رہنے دے۔

شاید وہ رمز شناس سچ کہتا ہو۔ حفیظ میں دو خصوصیات نمایاں تھیں۔ شعر سوچے بغیر کہتا تھا۔ بات سوچ کر کرتا تھا۔

عزیز ملک کی زندگی دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک جانب دین ہے۔ دوسری جانب ادب۔ جوانی ہی میں اسے باباؤں اور صوفیوں کی صحبت میں بیٹھنے کی لت پڑ گئی تھی۔ دیر تک وہ تلاش میں سرگرداں رہا۔ اسے خانقاہی، پیری مریدی سے نفرت تھی۔ لیکن بزرگوں اور درویشوں سے ملنے کا اشتیاق تھا۔

ان دنوں راولپنڈی میں ایک بڑے بزرگ سائیں اللہ بخش کی محفل لگتی تھی۔ اس محفل

کا رنگ رسمی پیری مریدی سے پاک تھا۔

۳۰ سال عزیز ملک سائیں اللہ بخش کے ڈیرے پر روزانہ حاضری دیتا رہا۔ آج بھی وہ ایک بابا کی خدمت میں باقاعدہ حاضری دیتا ہے۔

وہ بزرگوں، صوفیوں اور فقیروں کے طور طریقوں سے پورے طور پر واقف ہے۔ اس کا دینی مطالعہ بہت وسیع ہے۔ دین کے موضوعات پر اس نے بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں۔

دین میں وہ سراسر سپردگی ہے۔ ادب میں رنگین احتجاج۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ دونوں رویے ساتھ ساتھ کیسے چل رہے ہیں۔

ان دونوں پہلوؤں میں اس نے کامیابی حاصل کی ہے۔ اسلام اور تصوف پر وہ اتھارٹی ہے۔ ادب میں اسے صاحب طرز نثر نگار کی شہرت حاصل ہے۔ لیکن وہ ابھی تک اپنے شانوں پر خیالی محرومیوں کا بوجھ اٹھائے پھرتا ہے۔ ابھی تک وہ ننگے سر کھڑا ہے۔ جس روز عزیز ملک نے ان موہوم بیڑیوں سے آزادی حاصل کر لی۔ اس روز اس کی تخلیقات میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو جائے گا۔

-☆-

ذوالفقار احمد تابش

۱۹۸۲ء

# معمار

بزرگوں کے تذکرے پڑھتے ہوئے اکثر مجھے خیال آتا کہ توجہ کیا چیز ہے۔ جو ہر بُن مو سے خون کے قطرے جاری کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔ جس کے زیرِ اثر معمول یوں تڑپتا ہے جیسے حلال کیا ہوا بٹیر ہو۔

انہی دنوں میں نے انڈونیشیا کے بین الاقوامی سلسلے سبود کی بات سنی۔ پتہ چلا کہ جو شخص سلسلہ سبود میں داخل ہونا چاہے اس کی باقاعدہ طور پر ''اوپننگ'' ہوتی ہے جس کے کوائف توجہ سے ملتے جلتے ہیں۔

ایک روز میں نے بر سبیل تذکرہ اشفاق احمد سے پوچھا میں نے کہا یہ جو توجہ ہوتی ہے یہ کیا چیز ہے؟

کہنے لگا تذکروں میں بار بار ذکر آتا ہے۔ کہیں بھی وضاحت نہیں ملتی۔

میں نے کہا یار۔ انڈونیشیا کا سلسلہ سبود، جو ہے اس کے متعلق کچھ پتہ ہے تمہیں؟

بولا تابش سے جا کر پوچھ لو۔

میں نے کہا۔ تابش کون ہے؟

وہ پاکستان کا سلسلۂ سبود کا نمائندہ ہے۔

یوں میں پہلی بار ذوالفقار تابش سے ملا۔

اسے مل کر میں خاصا مایوس ہوا۔

ایک بند بند آدمی، مقفل، محتاط، اکیلا، گونگا، گٹھا ہوا جسم، بھاری، پست قد، روحانی ''اورا'' سے محروم۔ گھنی بھنوؤں میں جنسی شدت۔ جسم پر سیاہ کالے موٹے بال۔

میں نے کہا میں سلسلہ سبود کے متعلق جاننا چاہتا ہوں۔

کہنے لگا سبود ایک عالمی بھائی چارہ ہے جس میں عقیدے کی کوئی قید نہیں۔ چاہے مسلمان ہو یا عیسائی۔ لیکن عقیدے کا ہونا لازم ہے۔ وحدانیت اور مساوات پر ایمان ضروری ہے۔ انڈونیشیا کے باپا محمد صبح اس سلسلے کے بانی ہیں۔

میں نے کہا آپ سبود کے نمائندہ ہیں؟

کہنے لگا میں نمائندہ نہیں ہیلپر ہوں۔

ہیلپر کیا ہوتا ہے؟

بولا اگر کوئی شخص سبود میں داخل ہونا چاہے تو ہیلپر کا فرض ہے کہ اس کی مدد کرے اس کی اوپننگ کرے ''لاتی ہن'' میں اس کی مدد کرے۔

لاتی ہن کیا چیز ہے؟ میں نے پوچھا۔

بولا۔ لاتی ہن ایک روحانی مشق ہے۔ سرشاری کی ایک کیفیت ہے۔ ایک دھنکی سمجھ لیجیے جو رواں رواں کر کے رکھ دیتی ہے۔ روح کی کثافت دور کر دیتی ہے۔

میں نے پوچھا آپ نے کتنے لوگ سبود میں شامل کیے۔

تابش مسکرایا۔ بولا ہمیں سبود کا پرچار کرنے کی اجازت نہیں۔ لوگوں کو شمولیت پر مائل کرنے کی بھی اجازت نہیں۔ اگر کوئی از خود شامل ہونے پر مصر ہو تو ہم دیکھتے ہیں اس کی خواہش فروعی تو نہیں۔

ان تفصیلات سے میں بہت متاثر ہوا۔

آپ ہیلپر کیوں ہیں؟ میں نے پوچھا۔ گائیڈ کیوں نہیں؟

تابش نے جواب دیا جناب سبود پیر خانہ نہیں۔ بھائی چارہ ہے۔ ہیلپر کا لفظ زیادہ موزوں ہے۔

اس ملاقات سے میں سبود سے زیادہ متاثر ہوا۔ تابش سے نہیں۔

اس واقعہ کے چند ایک ماہ بعد اشفاق احمد اور میں گلبرگ کی مین مارکیٹ میں گھوم رہے تھے کہ اشفاق احمد نے چوک میں گاڑی روک لی۔



بولا۔ وہ سامنے کوٹھی دیکھ رہے ہو۔

ہاں۔

اس پر جو پلستر لگا ہے وہ ایک بچے نے کیا ہے۔

بچے نے۔

ہاں اس بچے کی کہانی بڑی دلچسپ ہے وہ بولا۔

جن دنوں گلبرگ کی مین مارکیٹ زیر تعمیر تھی یہاں مزدوروں اور معماروں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ ان میں ایک بچہ مزدور بھی تھا۔ جو اینٹیں ڈھوتا تھا۔ اینٹیں ڈھوتے ڈھوتے وہ چنائی اور رنگائی کا کام بھی کرنے لگا اور بالآخر اس نے پلستر کرنے میں بڑی مہارت حاصل کر لی۔ ٹھیکیدار اس بچے سے خوش تھا اس لیے کہ اس کا کام ماہرین سے لگا کھاتا تھا لیکن دیہاڑی کم دینی پڑتی تھی۔ چونکہ بچہ تھا۔ باپ سوتیلا تھا۔ خود معمار تھا وہ بھی بچے سے خوش تھا چونکہ روز چار روپے کما کر لاتا۔ اور باپ کی ہتھیلی پر رکھ دیتا۔

ماں بھی اس سے خوش تھی چونکہ بیٹے کی کمائی باپ کے مزاج کو ہرا بھرا رکھتی تھی۔ کسی کو بھی اس بچے کی ذات سے دلچسپی نہ تھی۔ ٹھیکیدار کے لیے کم خرچ بالا نشین پلستر تھا۔ ماں کے لیے سہاگ کی لذت تھا۔ باپ کے لیے آمدنی کا ذریعہ تھا۔

منہ اندھیرے اسے جگا دیا جاتا۔ سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے میلوں پیدل چل کر گلبرگ پہنچتا، ٹھنڈے یخ پانی سے چھت کو بھگوتا۔ خود بھی بھیگ جاتا۔ چھت پر پلستر کرتے ہوئے خوف دامن گیر رہتا کہ سیمنٹ گر کر منہ پر نہ آ پڑے اور وہ پاڑ سے نیچے گر نہ جائے۔

یہ بچہ کون تھا میں نے پوچھا۔

یہ بچہ ذوالفقار تھا جو ابھی تابش نہیں بنا تھا۔ اشفاق نے جواب دیا۔

اشفاق کا یہ قصہ سن کر میں پھر سے تابش سے ملنے گیا یوں جیسے لوگ یاترا کرنے جاتے ہیں۔

ویسے تابش تو وہی تابش تھا جسے میں پہلے مل چکا تھا۔ بند بند مقفل رکھ رکھاؤ کا مارا ہوا۔

لیکن اب کی بار وہ مجھے مختلف لگا۔ تھکا ہارا ہوا، پژمردہ آدمی دکھ میں گندھا ہوا۔ اندر سے

گلا سڑا ہوا۔ باہر سے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ اندر سے پلپلا۔ باہر سخت چھلکا۔

اس واقعہ کے چند ایک ماہ بعد میری پرانی الرجی پھر چمکی تو راولپنڈی کے ڈاکٹر نے مجھے لاہور کے ایک ڈاکٹر کے پاس بھیج دیا جو الرجی کا ماہر تھا۔

میری الرجی کے کوائف عجیب سے تھے۔

ہفتہ میں ایک بار دورہ پڑتا۔

سارا خون دوڑ کر سر کو چڑھ جاتا۔

ہوا سے پیٹ پھول جاتا۔

گھر والے مجھے گاڑی میں ڈال کر ہسپتال لے جاتے۔ ہسپتال میں اینٹی الرجی ٹیکہ لگتا۔ کارڈیوگرام ہوتا۔ الٹی آنے کی دوا دی جاتی۔ چار ایک گھنٹے ہاؤ ہاؤ کرتا رہتا، الٹی آتی تو ٹھنڈا برف ہو جاتا۔

لاہور پہنچ کر میں نے اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کو ایک جگہ بٹھایا اور انہیں اپنی بپتا سنائی۔

میں نے کہا دیکھو یار، مجھے مرنے پر قطعی طور پر اعتراض نہیں۔ میں مرنے کے لیے تیار ہوں۔ جب بلاوا آئے بسم اللہ۔ لیکن دقت یہ ہے کہ میں شریفانہ طور پر گھر پر اپنے بستر میں مرنا چاہتا ہوں۔ لہٰذا اللہ کے واسطے کوئی ایسا مشورہ دو کہ ہسپتال بازی سے جان چھوٹے۔

اشفاق احمد نے کہا ظاہر ہے کہ ایلوپیتھی کا طریق علاج تمہارے لیے مفید نہیں ثابت ہوا۔ بہتر ہوگا کہ تم تابش سے مشورہ کر لو۔

تابش۔۔۔ میں چلایا۔۔۔ پھر تابش۔۔۔

بانو کہنے لگی۔ تابش سند یافتہ ہومیو پیتھ ہے پریکٹس بھی کرتا ہے۔ اس کا علاج کراؤ یا نہ کراؤ لیکن وہ تمہیں اچھا مشورہ ضرور دے سکتا ہے۔

حد ہوگئی۔۔۔ یا اللہ یہ ذوالفقار تابش کیا کیا کچھ ہے۔ پہلے سلسلہ، سبود کا ہیلپر، پھر معمار اور اب ہومیو پیتھ۔

ذوالفقار تابش نے مہینوں لاہور، وزیر آباد کے درمیان چلتی گاڑیوں میں بھیک مانگی



ہے۔

گوجرانوالہ میں خوانچہ لگا کر گڑ کی گجک بیچی ہے۔

مغل پورہ میں کھڈی پر بیٹھ کر کام کیا ہے۔

جنات کو قابو میں لانے کے لیے عملیات کیے ہیں۔

تعویذ اور گنڈوں کا پاکھنڈ رچایا ہے۔

پریس میں ٹائم کیپری کی ہے۔

ہفتہ وار نصرت میں پروف ریڈنگ کی ہے۔

تعلیم و تربیت کی ایڈیٹری کی ہے۔

آرٹسٹ کی حیثیت سے کتابوں کے ٹائٹل بنائے ہیں۔

اس وقت وہ کتابی دنیا کا ماہر سمجھا جاتا ہے اور نیشنل بک کونسل کا ایک ذمہ دار افسر ہے۔

وہ نثر نگار ہے شاعر ہے۔

کہیے آپ کی سمجھ میں آئی بات۔

میری سمجھ میں تو نہیں آئی۔

پچھلے سال جب ہم بابا فرید کو سلام کرنے پاک پتن جا رہے تھے تو راستے میں ساہیوال ٹھہرے۔ وہاں تابش اور میں ٹہلنے کے لیے بازار کی طرف نکل گئے۔

پتہ نہیں کیوں اس روز غیر از معمولی باتیں ہو رہی تھیں۔ میں سننے کے موڈ میں تھا۔ تابش کہنے کے۔ لہٰذا اتفاقاً بات چل نکلی اور تابش نے اپنی طویل کہانی مجھے سنا دی۔ جسے سن کر میرے ذہن کا فیوز اڑ گیا۔

ذوالفقار کی کہانی بڑی مختصر ہے۔ تکلیف دہ ہے۔

وہ ۱۹۳۹ء میں خانقاہ ڈوگراں میں پیدا ہوا۔ ذوالفقار ماں باپ کے مسلسل جھگڑے کی پیداوار ہے۔ ماں عورت ہی عورت تھی۔ باپ سادھو ہی سادھو تھا۔ ان کے بطن سے جو لڑکا پیدا ہوا وہ بیک وقت گرم بھی تھا ٹھنڈا بھی۔ باپ نے اس کا دامن بے نیازی سے بھر دیا۔ اس کی خواہش تھی کہ بچہ ایسا ہو جیسا وہ خود تھا۔ ماں نے احتجاجاً اس کے پلو میں خواہش اور

بغاوت کا انگارہ باندھ دیا اس لیے کہ کہیں باپ جیسا نہ بن جائے۔ اوپر راکھ اندر انگارہ۔

یوں پیدائش ہی سے ماں باپ کا جھگڑا تابش کی ذات میں منتقل ہو گیا۔

اب ماں باپ ذوالفقار کے اندر بیٹھ کر ایک دوسرے سے جھگڑا کر رہے ہیں۔

جب بھی تابش مظلوم تھا، اب بھی تابش مظلوم ہے۔

پھر سوتیلا باپ منظر پر آ گیا۔

ذوالفقار تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا۔ باپ اسے کام پر لگائے رکھنے کا خواہاں تھا۔ تاکہ آمدنی کی صورت قائم رہے۔ ماں خاوند پر بکی ہوئی تھی۔

ذوالفقار کی ساری زندگی اس کش مکش کی بھینٹ چڑھ گئی۔

ذوالفقار کی شخصیت میں سپردگی کے ٹھنڈے نیلے آسمان پر بغاوت کے انگارے چمکتے تھے۔ اس کی سرشت میں سجدے بھی تھے، اور وسوسے بھی۔ اس میں وسوسوں کو سینچنے کی صلاحیت تھی۔ دفعتاً ایک چوزہ نکلتا ہے اسے اڑان پر اکساتا اور وہ گھر سے بھاگ کھڑا ہوتا۔ پروں میں ابھی اڑان کی طاقت نہ تھی لہٰذا اڑتا گرتا۔ چوٹ کھا کر تڑپتا اس اڑن گرن نے اس کی زندگی کو ناہموار بنا دیا۔ دکھی بنا دیا۔

ذوالفقار کا ماضی دیکھو یقین نہیں آتا کہ وہ اس ماضی کی پیداوار ہے۔

اس کا حال دیکھو تو یقین نہیں آتا کہ وہ اسے اس ماضی سے دور کا بھی تعلق ہے۔

ایک بات یقینی ہے کہ یہ اڑن گرن کا تواتر ذوالفقار کا کچھ بگاڑ نہیں سکا۔

آج بھی وہ اس کا اہل ہے کہ گھر والوں کو چھوڑ چھاڑ کر۔ نوکری پر لات مار کر چلا جائے۔ اور گوجرانوالہ میں جا کر گڑ کی گچک بیچنا شروع کر دے یا اسلام آباد میں پلستر کا کام کرنے لگے۔

آج بھی اس کے دل کے ایمان بھرے نیلگوں آسمان پر بغاوت کے دُم دار ستارے لٹک رہے ہیں۔ اس کی سنجیدگی دیکھو تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ عقل کا مارا ہوا ہے۔ وارفتگی دیکھو تو یقین نہیں آتا کہ وہ توازن کا حامل ہو سکتا ہے۔

سپردگی کی طرف دیکھو تو مٹی۔ احتجاج کی طرف دیکھو تو انگارہ۔ دقت یہ ہے کہ اس



نے وارفتگی اور انگارے پر راکھ کے دبیز پردے چڑھا رکھے ہیں۔

اوپر سے کچھ، اندر سے کچھ اور۔ وہ ایک نہیں رہا۔ دو ہو چکا ہے۔

ذوالفقار کی شخصیت ایک گورکھ دھندا ہے۔ مثلاً اس کی طرف ایک نظر ڈالو تو پتہ چلتا ہے کہ اس میں جنسی شدت لہریں لے رہی ہے۔ قد جسم کی بناوٹ ماتھے کی تیوری بھنوؤں کے گچھے۔ بالوں کی کثرت۔ توانائی سب شاہد ہیں کہ دو آتشہ ہے لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس کی زندگی میں جنسی کھلاڑی کا نشان نہیں ملتا۔

زندگی میں اس نے صرف ایک عشق کیا ہے۔

محبوبہ کا وہ وصف جس نے ذوالفقار کو گھائل کیا اس کے بال اور پاؤں تھے۔ یہ نہیں کہ بال لمبے تھے، یا ملائم تھے یا گھنے تھے یا سنہرے تھے۔ اُونہوں۔

بالوں کی جس خصوصیت نے اسے ذبح کر کے رکھ دیا یہ تھی کہ وہ بال ہر وقت بکھرے رہتے تھے اور پاؤں ننگے اور آوارہ۔ محترمہ سیماب پا تھیں۔

ذوالفقار سارا سارا دن گلی میں کھڑا پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہتا۔ چلی جاتی تو منتظر رہتا کہ کب آئے۔ آ جاتی تو دعائیں مانگتا کہ چلی نہ جائے۔

محبوبہ سے کبھی بات نہ کی تھی۔ حوصلہ نہ پڑتا تھا۔ وہ برہمن تھی یہ شودر تھا۔ اس کا امیر کبیر گھرانہ تھا۔ تابش کے گھر میں بسا اوقات چولہا نہ جلتا تھا۔ یہ نوازش کم تھی کیا کہ وہ دیکھنے سے روکتی نہ تھی بلکہ خود دکھاتی تھی۔

بات کرنے کے بہت موقع آئے، لیکن ذوالفقار کے نطق نے وفا نہ کی۔ پھر محبوبہ کا بھائی ذوالفقار کا دوست بن گیا۔ گھر میں آنا جانا ہو گیا۔ محبوبہ کا کام ذوالفقار سے کرانا شروع کر دیا۔ وہ لمحے ذوالفقار کے لیے بہت رنگین تھے جب وہ محبوبہ کی کاپی پر ڈرائنگ کرتا اور کرسی کے پیچھے کھڑی ہو کر وہ حیرت سے دیکھتی اور اس کے بال اڑ اڑ کر ذوالفقار کے منہ سے چھو چھو جاتے۔

پھر جوانی کی اولین بیداری نے محبوبہ کے جسم پر دستک دی وہ جاگ اٹھی۔ دیکھا کہ بال بکھرے ہوئے ہیں، پاؤں ننگے ہیں۔ اس نے بالوں کو سنوارا، پاؤں کو جوتوں میں

آراستہ کیا۔ نہ وہ بکھرے بال رہے نہ ننگے پاؤں۔ صرف ذوالفقار رہ گیا۔ حیران، متلاشی، دکھی۔

پہلے تو وہ عالمِ حیرت میں کھڑا رہا پھر چل پڑا چلتا گیا۔ گھر کا راستہ یاد نہ رہا تھا لہٰذا نہ کوئی سمت تھی نہ منزل۔

ان دنوں ذوالفقار چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا۔

حیرت کی بات ہے کہ اس ایک عشق کے سوا ذوالفقار کی زندگی میں کوئی جنسی گرداب نہیں اٹھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ لاتی ہن نے اسے جذب کر لیا ہے۔ لاتی ہن کے کوائف یہ ہیں۔

سلسلہ سبود میں لاتی ہن ایک کیفیت ہے۔

سبود ایک عالمی روحانی بھائی چارہ ہے جس میں مسلمان ہونے کی کوئی قید نہیں۔

مذہبی عبادات اور اخلاق کی پابندی لازم ہے۔ وحدانیت پر ایمان ضروری ہے۔

انڈونیشیا کے محمد صبح اس سلسلے کے بانی ہیں۔

یوں سمجھ لیجئے کہ لاتی ہن ایک روحانی دھنکی ہے جو فرد کی ذات کی کثافت دور کرنے کے لیے روح کو دھنکتی ہے۔ پھویا پھویا کر کے رکھ دیتی ہے۔

پاک صاف حالت میں آپ کھڑے ہو جاتے ہیں۔

پھر اللہ کی طرف دھیان لگاتے ہیں جو ایک ہے ہر جگہ موجود ہے اور قادرِ مطلق ہے۔

پھر آپ خود کو اس کے حضور میں پیش کر دیتے ہیں۔ معاً جیسے کسی عظیم بجلی گھر سے کنکشن ہو جاتا ہے۔ ایک کرنٹ آپ کے بند بند میں لہراتی ہے۔ ایک تڑپ ایک بے خودی ایک مستی۔ سرشاری، یوں جیسے کوئی ذبح کر رہا ہو۔ لیکن اس عمل میں ایک عجیب سی لذت بھی موجود ہوتی ہے۔ اس کیفیت کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔

روحانیت میں ذوالفقار کی دلچسپی بہت پرانی ہے۔ بچپن میں اس پر تین خبط طاری ہوئے۔ پہلا خوش خطی کا۔ دوسرا موسیقی کا۔ تیسرا ناول بازی کا۔ طبیعت کی افتاد ایسی ہے کہ ہر شوق جنون بن جاتا ہے۔ ناول بازی کا جنون طاری ہوا تو الف لیلیٰ، داستان امیر حمزہ اور



فسانۂ آزاد سب ختم کر دیئے پھر ایم۔ اسلم اور نسیم حجازی کے پیچھے پڑ گیا۔ یہاں سے جلد ہی دل بھر گیا تو منٹو، کرشن اور بیدی کو پڑھ ڈالا۔ پھر آگے ہی آگے۔ آگے ہی آگے۔

گھر میں غربت کے انبار لگے ہوئے تھے اور میاں موسیقی اور مطالعہ کے شوق میں سرشار تھے۔ پانچویں میں پڑھتا تھا کہ ایک دن ردی کے ڈھیر سے ایک کتاب مل گئی۔ یہ کتاب عملیات کی تھی پھر اس پر جناتی طاقتوں کو تسخیر کرنے کا شوق طاری ہو گیا۔ یوں وظائف اور عملیات کا دور شروع ہوا۔ طاقتیں تو قابو میں نہ آئیں لیکن مشہوری بڑی ہوئی۔ محلے کی عورتیں فال نکلوانے، ہاتھ دکھانے اور تعویذ گنڈا کرانے کے لیے ذوالفقار کے پاس آنے لگیں۔ پھر ایک دن یک لخت دل بھر گیا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ دیا۔ لاہور آیا تو شاہ جمال اور داتا کی حاضری دینے لگا۔ اب تڑپ اور طلب پیدا ہو چکی تھی۔ مرشد کی تلاش شروع ہوئی اور وقت گزرتا رہا۔

بالآخر ایک دوست کے توسط سے سبود میں داخل ہو گیا۔ اور آج وہ پاکستان میں سبود کا نمائندہ ہے۔

معلوم ہوتا ہے ذوالفقار میں ایک ریسیور لگا ہوا ہے۔ سری لنکا کے دورے کے دوران اس نے ایک خواب دیکھا۔ یہ خواب اس کے ایک دوست سے متعلق تھا۔ جسے حکومت میں اقتدار حاصل تھا۔ چونکہ خواب کی نوعیت پیش خبری کی تھی۔ اس لیے وطن واپس آ کر اس نے سرتوڑ کوشش کی کہ دوست کو اپنا خواب سنائے۔ خبردار کرے۔

تین مہینے کی مسلسل کوشش کے بعد اسے ملنے میں کامیاب ہو گیا۔

دوست تابش کے خواب کی تفصیل غور سے سنتا رہا پھر اٹھ کر اندر گیا ایک نیلا لفافہ اٹھائے واپس آیا بولا گھر جا کر یہ خط پڑھ لینا۔

گھر جا کر تابش نے لفافہ کھولا۔ ملفوف ایک غیر ملکی دوست خاتون کا خط تھا۔ جس میں اس نے اپنے خواب کی تفصیلات لکھی ہوئی تھیں۔ یہ تفصیلات تابش کے خواب سے ہو بہو ملتی تھیں۔ دونوں خواب دوست کے مستقبل کے متعلق تھے۔

تابش کے اندر ضرورت سے زیادہ تاریں لگی ہوئی ہیں اسی وجہ سے اس میں روحانی

ردعمل بڑی شدت سے پیدا ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی ایک آٹومیٹک بریک لگی ہوئی ہے جو تاروں کی لرزشوں کو ٹھپ کر دیتی ہے۔ بیچارہ نہ ادھر کا رہتا ہے نہ ادھر کا۔ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔

پچھلے سال ہم تابش کے ساتھ بابا فرید کو سلام کرنے گئے وہاں میں نے تابش کو عجب کیفیت میں دیکھا۔ پوچھا کیا بات ہے۔ بولا بابا نے چھیڑ دیا ہے۔ مہینوں چھڑا رہا۔

اب کہتا ہے چلو یار پھر بابا کے دوار چلیں۔ میں نے پوچھا کیا تکلیف ہے۔ کہتا ہے بابا نے پھر بلایا ہے۔

اگر اسے صرف بابا ہی بلاتے تو بھی بات تھی۔ دقت یہ ہے کہ اس کے دل میں عقیدت مندی کے ساتھ ساتھ وسوسوں کی مخمل پوٹاس کے ڈھیر بھی لگے ہوئے ہیں۔ کیا پتہ کب اس کے دل کا باغی اس ڈھیر کو آگ دکھا دے اور پھر بابے وابے چھوڑ کر وہ ہیرا منڈی میں کسی بیٹھک کے سامنے جا بیٹھے اور اڑتے بال اور ننگے پاؤں کا نظارہ کرنے میں کھو جائے۔ یوں کہ اپنی سدھ بدھ نہ رہے۔

مجھے ایسے لگتا ہے جیسے سدھ بدھ کھو دینا تابش کا مقدر ہے چاہے بابا کے دوار پر کھوئے یا اڑتے بالوں اور ننگے پاؤں کی دہلیز پر۔

جب وہ ہومیو پیتھ بن کر میرے روبرو بڑی سنجیدگی اور وقار سے بیٹھا ہوتا ہے تو مجھے ایسے لگتا ہے جیسے کوئی بہروپیا ڈرامہ کھیل رہا ہو۔ ابھی ابھی بہروپ اتر جائے گا اور ملنگ اندر سے نکل کر کہے گا جا ہم نے تجھے شفا بخشی۔

ہومیو پیتھی سے بھی اس کی دلچسپی اسی وجہ سے ہوئی۔ اسے خارش کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔ خارش بڑے نامناسب مقامات پر ہوتی تھی۔ زچ ہو کر رہ گیا۔

اتفاق سے ہومیو پیتھی کی ایک کتاب مطالعہ کے لیے ہاتھ آ گئی۔ ارے وہ چونکا یہ کیسا سسٹم ہے کہ دوا کی مقدار جتنی کم ہوا تنی ہی وہ طاقت ور ہو جاتی ہے۔ یہ تو قلندرانہ بات ہوئی کہ دوا کی کثافت دھو ڈالو اتنی لطیف بنا دو کہ سیدھی روح پر اثر انداز ہو۔

وہ ہومیو پیتھک اصول سے اس قدر تھرل ہوا کہ کھجانا یاد نہ رہا۔



تابش موسیقی کا دیوانہ ہے شدھ سنگیت اس پر بہت اثر رکھتا ہے ویسے اس کے بشرے کی طرف دیکھو تو شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ نہ سُر کا نہ لے کا۔

اگر گزشتہ سال اسے بالوں کا ٹوکرا پالنے کا خیال نہ آتا تو اسے شاعر نہ مانتا۔ شاید کوئی بھی نہ مانتا۔

شاعری صرف شعر کہنے سے نہیں۔ رُخ رویے اور حلیے سے زیادہ تعلق ہے۔

میں نہ تو شاعر ہوں نہ نقاد، لیکن تابش کا کلام پڑھ کر مجھے ایسا لگا جیسے اللہ رکھی نے میکسی پہن رکھی ہو۔ کلام کو دیکھتا ہوں تو کلام سمجھ میں آتا ہے تابش سمجھ میں آتا ہے۔ دونوں کا میل جول سمجھ میں نہیں آتا۔ سچی بات یہ ہے کہ میری دانست میں دانش ورانہ باتیں کرنا تابش کو بجتا نہیں۔ چونکہ لفظوں کی عیاشی اس کی شخصیت سے ہم آہنگ نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی شاعری ابھی سوچوں میں بھٹک رہی ہے۔

ایک دن آئے گا جب سوچوں کا چھلکا ٹوٹے گا۔ اندر کا مجذوب باہر نکلے گا۔ پھر "بے میں ویکھا تیرے والے بلے بلے بلے۔"

-☆-

۱۹۸۱ء

# میلہ گھومنی

پروین میرے پرانے دوست احمد بشیر کی چھوٹی بہن ہے۔

پہلی بار میں اس سے ان دنوں ملا جب وہ پینو تھی۔ اندھیرے اجالے ابھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئے تھے۔ جسم چیونٹیوں کے گھروندے کی طرح عالمِ لرزش میں تھا۔ اعضا منہ زور ہو رہے تھے۔ بانہیں لٹکے جا رہی تھیں۔ ہاتھ اتنے بڑے۔ ٹانگیں یہاں سے وہاں تک۔ چہرہ اوندھی گڑوی۔ گروتھ اس قدر بے ہنگم نہ توازن نہ ہم آہنگی۔

پندرہ سال کے بعد جب وہ مجھے ملی تو اُجالے ہی اُجالے تھے۔ ہم آہنگی توازن، گلیمر۔ احمد بشیر نے کہا پینو سے ملو۔ میں نے کہا۔ یہ پینو ہے۔ نہیں میں نہیں مانتا۔

اس پر پروین ہنسی۔ بولی۔ چلو میں بھی گنتی شمار میں آئی۔

پھر اس نے باتوں کی پھلجھڑیاں چلا دیں۔ اس کی باتیں سن کر مجھے اشفاق حسین یاد آ گیا۔ اشفاق حسین پروین کا ماموں ہے۔

۱۹۴۲ء میں مَیں پہلی بار اشفاق حسین سے گورداسپور میں ملا تھا۔ ان دنوں مجھ پر طبلہ سیکھنے کا جنون طاری تھا۔ شوق پورا کرنا تو الگ بات تھی۔ کسی سے اس کا تذکرہ بھی نہ کر سکتا تھا۔ ان دنوں میں سکول ماسٹر تھا۔ اساتذہ کرام پہلے ہی مجھے مشکوک سمجھتے تھے چونکہ رسمی نہ تھا۔

اس زمانے میں گانا بجانا اس قدر عام نہ تھا۔ ابھی ریڈیو کا محکمہ تشکیل نہ ہوا تھا۔ ہز ماسٹرز وائس کے ریکارڈ چل تو نکلے تھے لیکن ناچ گانے کے مرکز چوبارے ہی تھے۔ اُردو فلم رائج نہیں ہوا تھا۔



پھر ایسا اتفاق ہوا کہ بات بن گئی۔

گورداسپور میں مجھے اس گلی میں مکان ملا جہاں اشفاق حسین رہتا تھا۔

اشفاق کے تین مشاغل تھے۔ طبلہ بجاتا تھا، ستار چھیڑے رکھتا تھا اور محفل لگا کر باتوں کی پھلجھڑیاں چلاتا تھا۔

اس کے ہاں گیا تو میں سر تال کے لیے تھا۔ لیکن باتوں کے سنہرے جال میں پھنس گیا۔ ایسی باتیں میں نے پہلے کبھی نہ سنی تھیں۔ ان میں رنگینی تھی، سچائی تھی، مزاح تھا، ادب تھا۔

وہ باتیں بظاہر عجز سے بھری ہوئی تھیں خود پر ہنستی تھیں، اپنا مذاق اڑاتی تھیں، لیکن درپردہ خود پسندی کی مظہر تھیں۔

پروین کی باتوں میں یہ سب کچھ ہے اور کچھ اور بھی شاید نسائی رنگ۔ توجہ طلبی کی شوخی۔ جو کچھ بھی وہ لکھتی ہے۔ لکھتی نہیں۔ ان باتوں کو کاغذ پر نقل کر دیتی ہے۔ البتہ کاغذ پر آ کر بات میں وہ لطافت نہیں رہتی بوجھل ہو جاتی ہے۔ میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ غیر رسمی محفل میں بیٹھ کر پروین کی باتیں نہ سننا ورنہ مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔

صرف پروین ہی کو نہیں سارے خاندان کو باتوں کی بیماری لگی ہوئی ہے۔

پروین ایمن آباد کی رہنے والی ہے۔ اک چھوٹا سا قدیم قصبہ۔ جہاں شیخوں کی کئی ایک گوتیں آباد ہیں۔ متھے وہورے، کاشل، نارو، گھپے، آنند۔

تقسیم سے کچھ برس پہلے وہ ایمن آباد میں شیخ غلام حسین کاتل کے گھر پیدا ہوئی۔

ایمن آباد کے شیخ نومسلم ہیں۔ ایمان میں کٹر۔ اللہ اور رسول کے سوا کسی کو نہیں مانتے۔ نہ پیر نہ فقیر نہ ولی نہ بزرگ۔ صراط مستقیم کو مانتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ طویل ہو۔ شارٹ کٹ کو نہیں مانتے۔

ہندوانہ رنگینی اب بھی جوں کی توں قائم ہے۔ باتوں کی رنگ پچکاری چلتی ہے۔ کھل کے ہولی کھیلتے ہیں۔ ماتھوں پر سجدوں کے نشانات کے ساتھ ساتھ سیندھور کے قشقے لگے ہوئے ہیں۔

ایمن آباد کے شیخ سب کاروباری ہیں۔ دو اور دو چار گنتے ہیں۔ دینے کی بات نہیں سنتے لینے کی بات کرو تو چونکتے ہیں۔ شیخ گڑھے میں گر جائے آپ اسے نکالنا چاہیں تو یہ نہ کہیے۔ شیخ جی دیجیے ہاتھ۔ بلکہ یہ کہیے شیخ جی لیجیے ہاتھ۔ اپنی اس خصوصیت پر کھی کر کے ہنستے ہیں۔

تقسیم کے انقلاب نے ایمن آباد کے شیخوں کو رنگ دیا ہے۔ آج کل وہ سب کراچی میں بندر روڈ پر آٹوموبائل کاروبار میں کروڑ پتی بنے بیٹھے ہیں۔

پروین کے پڑنانا تک تو دو اور دو چار کی خصوصیت قائم رہی پھر پتہ نہیں نانا نے کیا کر دیا۔ نانا کی اولاد دو اور دو چار کے چکر سے باغی ہو گئی۔ انہیں کاروبار سے نفرت ہو گئی۔ اللہ جانے اس ویری ایشن کی وجہ کیا تھی۔

پروین کا باپ ایم اے تھا۔ سکول ماسٹر تھا۔ رکھ رکھاؤ کا شدت سے قائل تھا۔ ٹھنڈا تھا، رسمی تھا، صراط مستقیمی تھا، خوب صورت تھا، اتنا خوبصورت کہ محلے کی نوجوان لڑکیاں کھڑکیوں میں لٹک لٹک اسے جھانکتیں، تاکتیں، مسکراہٹیں پھینکتیں، دیدہ و دل فراش راہ کرتیں۔ اتنا صراط مستقیمی کہ اسے خبر ہی نہ ہوئی۔

پروین کی والدہ رنگ رنگیلی تھی۔ جذباتی تھی، چاؤ چونچلے سے خاوند پر حکومت کرنا جانتی تھی۔

بچوں میں ماں اور باپ کی کھچڑی پک گئی۔ بڑا احمد بشیر بیک وقت ذہنی بھی تھا، جذباتی بھی، گرم بھی، ٹھنڈا بھی، قائم بھی، ادلتا بدلتا بھی، منجھلا اختر انگارہ تھا، رنگ دار تھا، رومانی تھا، سو ہاٹ تھا، بلبلے ہی بلبلے۔

پروین رنگ ہی رنگ اور تاریں ہی تاریں تھی جیسے روغنی سارنگی ہو۔ آج بھی وہ تاریں ہی تاریں ہے۔ مضراب کے بغیر بیٹھے بیٹھے آپ ہی آپ بجتی رہتی ہے۔

ویسے تو عقل کا آنا جانا لگا رہتا ہے لیکن آ جائے تو لگتا ہے جیسے کوئی بیگانہ آ گیا ہو۔

پروین کا بچپن پچ پچ اور مُچ مُچ کا ایک تسلسل تھا۔ گھر والے اسے چوم چوم کر تھکتے نہ تھے۔ سارے محبت سے یوں پچ پچ کرتے تھے جیسے برسات میں بچوں کی میٹھی گولیاں پچ



پچ کرتی ہیں۔ گھر میں اس کی حیثیت کچھ ایسی تھی جیسے بچوں کے ہاتھ واکی ٹاکی لگ گئی ہو۔ ماں باپ بھائی بہن سب نے اسے جی بھر کر بگاڑا۔ محبت کی اتنی ٹونٹیاں کھل گئیں کہ وہ چاول کی پنیری کی طرح جل تھل ہی رہی۔

احمد بشیر کہتا تھا میرے کمرے میں سوئے، اختر ضد کرتا کہ میری گود میں لپٹے۔ آپا اور ماں میں کمپی ٹیشن تھا۔ آپا منہ دھوتی کاجل لگاتی بال بناتی ماں حسرت سے دیکھتی کہ کب میری باری آئے۔

باپ استاد تھا۔ پیرنٹ اتھاریٹی کا مارا ہوا۔ وہ موقعہ کی تلاش میں رہتا کہ جب پینو اکیلی ہو۔ کوئی دیکھتا نہ ہو تو پیار کر لے۔ ڈر تھا کہ بھرم نہ کھل جائے۔

پھر جب وہ بچی سے لڑکی بن گئی تو دونوں بھائیوں نے اُسے یار بنا لیا۔ یار ادھر آ، یار یہ کام کر دے، ''یار کہاں ہے تو'' اسے ماہی مُنڈا بنا کر اپنے ساتھ ساتھ گھمانے پھرانے لگے۔

دراصل دونوں بھائی باپ سے انتقام لے رہے تھے۔ جو جو کچھ انہیں خود بچپن میں نصیب نہ ہوا تھا، وہ پینو پر نچھاور کرتے تھے۔ درپردہ باپ سے کہہ رہے تھے ابے او رسم و رواج کے دیوانے دیکھ یوں پالا کرتے ہیں بچوں کو۔

اس زمانے میں پیرنٹ اتھاریٹی کے خلاف بغاوت اُبھر رہی تھی۔ مغربی تعلیم رنگ لا رہی تھی۔

پھر وہ واقعہ ہوا جس نے پروین کی روح میں پہلا کیل ٹھونک دیا۔۔۔ وہ ششدر رہ گئی یہ کیا ہوا کیوں ہوا۔۔۔ تڑپی چیخی چلائی اور آخر ہسپتال جا گری اور ڈاکٹر نے اسے آکسیجن لگا دی۔

ہوا یہ کہ اس کی آپا کی بڑے دھوم دھڑکے سے شادی ہو گئی۔ پروین کے لیے وہ آپا کم تھی۔ اماں زیادہ تھی۔ ڈولی میں بیٹھی ماں سے کہہ رہی تھی۔ پینو کو اکیلے سونے نہ دینا اسے اکیلی سونے کی عادت نہیں۔ سرہانے دودھ کا گلاس رکھ دیا کرنا، آدھی رات کو اسے پیاس لگتی ہے۔

پندرہ دن کے بعد جب آپا میکے آئی تو پینو حیران رہ گئی۔ آپا سے دلہن کی خوشبو نہیں آ رہی تھی۔ نوکرانی کی بو آ رہی تھی۔ پھر اس نے سن لیا کہ دولہا کو پہلے ہی بھاوجہ نے گود لے رکھا تھا۔ شادی تو ایک ڈھونگ تھا کہ بھید نہ کھلے۔ پروین کے دل میں شادی اور جنس کے خلاف شدید نفرت پیدا ہو گئی۔

پروین کا گھر دیوانوں کا گھر تھا۔ احمد بشیر خیال کے ابوالہول بناتا رہتا تھا۔ اختر جذبات کے کلہاڑے چلاتا، بڑا کتابوں سے گھرا رہتا۔ قابل اعتراض کتابیں منجھلا ستار چھیڑے رکھتا۔ ماں ادبی رسائل سرہانے تلے چھپائے رکھتی۔ باپ کو پتہ تھا کہ گھر میں گوریلے انڈر گراؤنڈ بیٹھے ہیں، لیکن وہ مجبور تھا۔ دیوانوں میں وہ اکیلا فرزانہ تھا۔

وہ پڑھا لکھا فرد تھا۔ جدیدیت کے تقاضوں کو سمجھتا تھا۔ جانتا تھا کہ ہوا ابن کر باپ کی مسند پر بیٹھا ہے۔ کوئی نہیں ڈرتا۔ الٹا بغاوت پل رہی ہے۔ لیکن وہ پیر عمل اتھارٹی کی بیساکھیوں کے بغیر چل نہ سکتا تھا۔ اسے زندگی بسر کرنے کا اور کوئی طریقہ نہ آتا تھا۔

پھر پروین کی رُوح میں دوسرا کیل ٹھکا۔ اُس کا سب سے چھوٹا بھائی پولیو کا شکار ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہمیشہ کے لیے اپاہج بن گیا۔ چونکہ جذبات کی پوٹلی تھی۔ اس لیے اس حادثہ سے ریزہ ریزہ ہو کر رہ گئی۔

پھر پروین خود پہلی مرتبہ گھر کے فیوڈل لارڈ کے احکامات کی زد میں آ گئی۔ باپ کو کاروبار آزمانے کا جنون طاری ہوا۔ نوکری چھوڑ کر وہ ایمن آباد آ گیا۔ وہاں لڑکیوں کا سکول نہ تھا۔ اس لیے پروین کی تعلیم رُک گئی۔ وہ بہت چیخی چلائی باپ نے کہا پیاری یہاں دال کو بھگار لگانا سیکھو۔ آٹا گوندھنا سیکھو۔ آلو چھیلنا سیکھو۔ لڑکی کی زندگی میں یہ چیزیں زیادہ اہم ہیں اور اگر پڑھنا چاہتی ہو تو بے شک گھر بیٹھ کر پڑھو۔ شیخ صاحب کو علم نہ تھا کہ لڑکیاں سہیلیوں کے سہارے پڑھتی ہیں اور ایک دوسری سے سبقت لے جانے کے جذبے سے لائق ہو جاتی ہیں۔

دو سال پروین ایمن آباد میں پیاز چیرتی اور روتی رہی۔

پھر وہ لاہور آ گئے۔ مدرسۃ البنات نے کہا پہلے ادیب عالم کرو۔ پھر آٹھویں میں



داخلہ دیں گے۔ ادیب عالم کی کلاس مدرسے میں ہی تھی۔ اگر وہ داخلہ کے لیے پہاڑ کھودنے کو کہتے تو بھی وہ دریغ نہ کرتی۔

مدرسۃ البنات ایک لالہ زار تھا۔ چاروں طرف رنگ ہی رنگ روپ ہی روپ۔ تعلیم حاصل کرنے کے سارے کوائف موجود تھے۔

اس وقت پروین زندگی کے اس دور میں تھی جب اندر عنفوان شباب کے پٹاخے چھوٹتے ہیں۔ بارودی چھچھوندریں زوں زوں گھومتی ہیں۔ ہنڈول چلتے ہیں۔ ڈھولکیں بجتی ہیں۔ اندر عنفوان شباب کا میلہ باہر سے مدرسے کا۔

پھر کسی دل پھینک لڑکی نے کاغذ پر پروین کی آنکھیں بنائیں۔ نیچے ایک چھپن چھری فقرہ لکھا اور رقعہ پروین کے ہاتھ میں تھما دیا۔ بیچاری پٹ گئی رقعہ دیکھتی۔ آئینہ دیکھتی پھر رقعہ دیکھتی پھر آئینہ۔۔۔ آخر آئینے کے ساتھ لگ کر رہ گئی۔

ایک لڑکی روز بلاناغہ دور سے اسے انگوٹھا دکھاتی پھر زبان لٹکا دیتی۔ یہ حرکت پروین کو بڑی اچھی لگتی۔ گھنٹوں انتظار کرتی کہ کب آئے انگوٹھا دکھائے زبان باہر نکالے۔

پھر رقعوں کا ایک تانتا لگ گیا۔ ایسے ایسے جملے کہ چھڑ جاتی پاؤں تلے سے پہیے لگ جاتے۔ بازوؤں پر پَر۔ دل دھک دھک کرتا۔ آنکھیں ڈولتیں۔ مسکراتیں، گدگداتیں۔

پھر ایک اور قیامت ٹوٹی۔ دسویں میں نمبر کم آئے۔ کالج میں داخلہ نہ ملا۔ دو سال گھر بیٹھنا پڑا۔ پڑھ پڑھ اور رو رو کر بے حال ہو گئی۔ یوں ایف اے کیا۔ پھر بی اے میں داخلہ مل گیا۔

دو سال گھر بیٹھ کر گاؤں کے گھی چاول کھا کھا کر اتنی تندرست ہو گئی کہ پہلے روز ہی کالج میں کسی نے طعنہ دیا۔ بولی ہٹ آگے سے موٹی جٹی۔ ہیروشیما پر ایٹم بم آ گرا۔ اپنے جسم سے نفرت ہو گئی۔ فیصلہ کر دیا اسے دار پر چڑھا دوں گی۔ دیگ میں ڈال کر گلا دوں گی حتی کہ بوٹیاں شوربا بن جائیں۔

کھانا پینا یک قلم چھوڑ دیا۔ چند دنوں میں گال پچک گئے۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے۔ فلمی ایکٹرسوں کے ماپ لکھ کر دیوار پر لٹکا دیے۔ صبح و شام خود کو ماپتی، تولتی، موازنہ

کرتی۔ اس پر جسم نے انتقام لیا۔ ہسپتال کے ٹی بی وارڈ میں چھ مہینے پڑی رہی۔ ہسپتال میں بہت خوش تھی۔ چونکہ جسم کے ماپ ہاؤس آف ویکس کی ہیروئن کے عین مطابق ہو چکے تھے۔

واپس کالج پہنچی تو پھر سے بہار آ گئی۔ دھڑادھڑ ڈراموں میں حصہ لینے لگی۔ سٹیج پر وہ رنگ پچکاری چلائی کہ سارا کالج پروانہ بن گیا۔ خود شمع ہونے کا احساس اُبھرا اور سائبان بن کر چھا گیا۔

ادھر گھر میں دونوں بھائی پروین پر جان دیتے تھے۔ اختر نے تو اس کے گرد رومان کا ایک ہالہ بنا رکھا تھا۔ کہتا جو تو سامنے نہ بیٹھے تو میری ستار بجتی نہیں۔ وہ اسے انگلی لگائے گھومتا پھرتا۔ چلو یار انارکلی میں گول گپے کھائیں۔ چلو یار آج گدھا گاڑی کی سیر کریں۔ چلو یار رضائی میں بیٹھ کر ایمن کا الاپ کریں۔

بظاہر تو یہ یار بازی بڑی خوش کن تھی۔ لیکن ان جانے میں اندر گھن لگتا جا رہا تھا۔ منجھلا بھائی اختر، پروین کا آئیڈیل بنتا جا رہا تھا۔

دل ہی دل میں پروین سوچتی ایسا جیون ساتھی ملے جو مدھم بولے آنکھیں کبوتری سی ہوں۔ رومانی شعر کہے۔ تخلص بہت ہی پیارا ہو۔ سامنے بٹھا کر ستار بجائے۔ ساتھ نہ کھاؤں تو کھانا بدمزہ لگے۔ بازاروں میں انگلی لگائے پھرے۔ سامنے بٹھا کر ٹکر ٹکر تکتا رہے۔۔۔۔

اُونہوں۔۔۔ ہاتھ نہ لگائے۔

انہی دنوں ایک اور مصیبت ٹوٹی۔۔۔ پروین کے لیے رشتے آنے لگے۔ ابا مصر تھے کہ بات بن جائے۔ لڑکا نیک ہو۔ کماؤ ہو اور اچھے خاندان کا ہو۔ اس کے علاوہ جیسا بھی ہو کیسا بھی ہو۔ لیکن پروین کو شادی سے چڑ تھی۔

جب بھی کوئی رشتہ آتا عورتیں دیکھنے کے لیے آتیں تو اختر اور پروین سر جوڑ کر ترکیبیں لڑاتے کہ کس طرح آئی بلا کو ٹالا جائے۔ کبھی پروین ماں سے آنکھ بچا کر دیکھنے والیوں کو بھینگی آنکھ سے دیکھتی، کبھی توتلی زبان سے بات کر دیتی۔ کبھی منہ سے رال ٹپکنے دیتی۔ کبھی ناک سے چوہے نکالتی۔ بلا کو ٹالنے کے بڑے بڑے جتن کیے۔ لنگڑانا بھی آزما



دیکھا۔ شیخ غلام حسین حیران تھے۔ لڑکی میں ہر گن موجود تھا۔ خوبصورت تھی، پڑھی لکھی تھی، مہذب تھی، سوشل تھی، لائق تھی، اس کے باوجود جو رشتہ لے کر آتا، دوبارہ قدم نہ دھرتا۔ بات کیا ہے۔ ان کے دل میں شکوک پیدا ہونے لگے۔

انہی دنوں پروین کو پڑھنے کی لت لگ گئی۔ لائبریریوں میں آنا جانا شروع کر دیا۔ بک سٹالوں پر پھیرے مارنے لگی۔ بی اے کا نتیجہ نکلا تو یونیورسٹی میں جانے کی تیاریاں کرنے لگی۔ باپ نے صاف صاف کہہ دیا یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم ہے۔ میں اس کا حامی نہیں۔ بس اب شادی کر وا اور آرام سے گھر سنبھالو۔ بہت ہو گئی تعلیم۔ پروین اَنوٹی گھنوٹی لے کر پڑ گئی۔ ماں ڈر گئی۔ آخر فیصلہ یہی ہوا کہ منگنی کر ڈالو اور بے شک یونیورسٹی جائن کر لے۔

پروین فٹاک سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ منظور۔

اس نے سوچا منگنی کے لیے پہلے لڑکا ڈھونڈیں گے۔ لڑکے والے دیکھنے آئیں گے۔ ٹھیک ہے سنبھال لوں گی۔

پروین یونیورسٹی میں داخل ہو گئی۔

باپ نے اسے بتائے بغیر ایک کپتان کے والدین سے بات پکی کر کے منگنی کر دی۔ منگنی ہو گئی تو پروین نے سوچا چلو جان چھٹی۔ اب میں اطمینان سے پڑھوں گی۔ جب حشر کا دن آئے گا اس روز دیکھا جائے گا۔

یونیورسٹی میں وہ گھومتی پھرتی جیسے مندر میں متبرک گائے، ادھر تقریر ختم کی ادھر بحث مباحثہ میں جا بیٹھی۔ یہاں پیپر پڑھا وہاں پروفیسر سے جا الجھی۔ لڑکے پھٹی پھٹی آنکھوں سے بٹر بٹر دیکھتے۔ لڑکیاں حسرت بھری نگاہیں ڈالتیں۔ ایک ہنگامہ یونیورسٹی تھی۔ ایک ہنگامہ خود پروین تھی۔

پھر ایک دن گھر میں اکیلی کوٹھے پر دھوپ میں بیٹھی تھی کہ دروازہ بجا منڈیر سے جھانک کر دیکھا۔ ایک لمبا تڑنگا آدمی دروازے میں لٹکا ہوا تھا۔ ارے یہ کون ہے؟

نوکرانی بولی بی بی یہ تیرا منگیتر ہے۔

کہنے لگے لٹکا رہنے دے اسے۔ پروین کا مقصد یہ تھا کہ منگیتر کو لٹکائے رکھے۔ جتنی دیر ہو سکے لٹکائے رکھے۔

چار ایک دن کے بعد سوشیالوجی ڈیپارٹمنٹ میں الیکشن تھا۔ ایک گروپ نے پروین سے پوچھے بغیر اس کا نام پروپوز کر دیا۔ اب عزت کا سوال تھا۔ پروین سٹیج پر آئی۔ تقریر شروع کی۔ وہ تقریر اتنی دھواں دار ہوگئی کہ حاضرین کے منہ کھلے تھے۔ نگاہوں سے دھواں نکل رہا تھا۔ کامیابی کے آثار واضح تھے۔ سنس آف اچیومنٹ بند بند سے چھلک رہا تھا۔

دفعتاً شیشے کی کھڑکی کی طرف نگاہ اٹھ گئی کھڑکی میں منگیتر لٹک رہا تھا۔

اگلے روز ایک رقعہ ملا ''اتنا کاجل مت لگایا کرو۔ الیکشن سے اپنا نام واپس لے لو'' ارے یہ مجھے مشورہ دینے والا کون ہے۔ نیچے لکھا تھا منگیتر۔ اگلے روز پروین نے انتقاماً ساری کی ساری کاجل دانی اپنی آنکھوں میں انڈیل لی اور الیکشن لڑنے چل پڑی ایسا ہے تو ایسا ہی سہی۔

دراصل منگیتر ایک مشہور عالم کھلاڑی تھا۔ لمبا تڑنگا، گورا چٹا، خوبصورت، سمارٹ۔ ۲۸ ملکوں میں گھوما پھرا تھا۔ میمیں اس کے گرد یوں پھیرے لیتی تھیں جیسے حلوائی کی دکان پر مکھیاں۔ دقت یہ تھی کہ اسے علم تھا کہ میں رس گلا ہوں۔ اس کی ساری زندگی لڑکیوں کے ہاتھوں میں پھنسنے میں گزری تھی۔ پھنسانے کی پرابلم کبھی پیدا ہی نہ ہوئی تھی۔ وہ حیران تھا کہ یہ منگیتر کیا چیز ہے جو میرے وارے نیارے جانے کے بجائے الٹا مجھے کھڑکیوں دروازوں میں لٹکا رہی ہے۔

ویسے بھی وہ فیوڈل طبیعت کا مالک تھا۔ چھوٹی سی جاگیر بھی تھی۔ گھر پیرنٹ اتھارٹی سے اٹا پڑا تھا۔ اسی ماحول میں پل کر جوان ہوا تھا جہاں خاوند مجازی خدا ہوتا ہے۔

پتہ نہیں کیسے، پروین کو دیکھ کر اس میں تسخیر کا جذبہ شدت سے جاگا۔ ٹیمنگ دی شرو پر ٹھن گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک عظیم لیکن پرووکنگ تصادم عمل میں آ گیا۔ اس نے پروین کے گردوپیش جگہ جگہ لٹکنا شروع کر دیا۔

مقصد پروین نہ تھی ضد تھی تسخیر تھی۔ فتح تھی، سنوب ٹو کانکر تھی۔



پروین کی ماں منگیتر کی باتیں سن کر ڈر گئی۔ منگیتر بولا میں خود ٹھیک کر لوں گا۔ صرف ایک بار بات کرنے کا موقع دے دیا جائے۔

اب پروین کی زبانی سنیئے۔

بیٹھک کے درمیان میں ایک چادر لٹکا دی گئی۔ ادھر وہ بیٹھ گیا ادھر میں۔ کمرے میں مچھر ہی مچھر تھے گرمی ہی گرمی پنکھا برائے نام چل رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ میری باتیں سننا چاہتا تھا۔ میں باتوں سے بھری بیٹھی تھی جیسے انار دانوں سے بھرا ہوتا ہے۔ بس اک ذرا چھیڑنے کی بات تھی۔

اس وقت رات کے نو بجے تھے۔ منگیتر نے بات شروع کی صبح کے سات بج گئے ابھی وہ بولے جا رہا تھا۔ میری باری ہی نہ آئی۔

اس ساری تقریر کا لب لباب یہ تھا کہ تو بہت قیمتی چیز ہے۔ میں تجھے پا کے رہوں گا اور پھر تجھے ہمیشہ سینے سے لگا کر رکھوں گا۔

پہلے تو میں اس کی باتوں پر ہنستی رہی۔ عجب احمق ہے۔ اپنی ہی کہے جا رہا ہے۔ اور وہ بھی اتنی بے تکی۔ لیکن پھر انجانے میں وہ باتیں میرے بند بند میں گھستی چلی گئیں۔ نسوں میں دھنکی بجانے لگیں عورت اپنی تعریفیں سن سن کر کب تک ریزسٹ کرے گی۔ بیچاری۔

اس رات کے بعد یونیورسٹی میں اس نے جگہ جگہ لٹکنا شروع کر دیا۔ دروازوں میں کھڑکیوں میں، بیل بوٹوں پر، درختوں پر۔

پھر نیا پینترا بدلا۔ تیس تیس صفحے کے خط۔ پہلے ہفتہ وار پھر روز روز۔ پھر دن میں دو دو بار یا اللہ یہ کیا مصیبت ہے۔ میں اس مصیبت پر ناک بھوں چڑھاتی تھی۔ ساتھ ہی خط کا انتظار کرتی تھی۔ یہ مصیبت مجھ پر بُری طرح مسلط ہوگئی۔ پھر اس میں مصیبت کا عنصر کم ہوتا گیا۔ تسلط بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ صرف تسلط ہی تسلط رہ گیا۔ یونیورسٹی دھندلاتی گئی۔ ایکٹویٹیز بے معنی لگنے لگیں۔ سہیلیاں فیڈ آؤٹ ہوتی گئیں۔ ناظرین کے کھلے منہ اور دھواں دھواں انداز احمقانہ لگنے لگے۔ میں نے تنگ آ کر شادی کے لیے ہاں کر دی۔

برات کی رات جب گاڑیاں گاؤں جا رہی تھیں تو عاطف نے بہانہ بنا کر گاڑی چناب

کے پل پر روک لی۔

برات گھر پہنچ گئی۔ انتظار کرتے کرتے سب سو گئے۔ ہم پل پر بیٹھے رہے۔ وہ مغلیہ ٹھاٹھ سے بولا۔ مانگ کیا مانگتی ہے جو مانگے گی دوں گا۔ کوئی ان ہونی چیز مانگ۔ میں نے کہا پندرہ دن مجھے ہاتھ نہ لگانا۔ یہ سن کر اس کا فلوس اڑ گیا۔

پھر جب ہم گھر پہنچے تو ساری رات وہ مجھے بٹھا کر باتیں کرتا رہا۔ ہر دو گھنٹے بعد وہ سی سی کرتا ہوا دیوانہ وار اُٹھ بیٹھتا اور پھر ٹھنڈے پانی کی بالٹی خود پر انڈیل کر میرے سامنے آ کر بیٹھ جاتا۔ میں حیران رہ گئی۔ یا اللہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ان دنوں فروری کے دن تھے۔ بلا کی سردی تھی۔ میں سوچتی یہ کیسا انسان ہے کہ لحاف میں بیٹھ کر کانپتا ہے اور ٹھنڈے پانی کی بالٹی جسم پر ڈال کر آرام سے بیٹھ جاتا ہے۔ مجھے شعور نہ تھا کہ یہ ساری گڑبڑ ہاتھ نہ لگانے کی ہے۔ مجھے علم نہ تھا کہ اس کی زندگی ہاتھ لگانے پر موقوف ہے۔

آٹھ روز تو یہ مغلیہ شہزادہ اپنے وچن پر قائم رہا۔ پھر شاید ٹھنڈی بالٹیوں نے بھی کام کرنا چھوڑ دیا۔ پھر وچن کی بوتل ٹوٹ گئی اور جن باہر نکل آیا۔

بُل ڈوزر چینی کی دکان کو روند کر نکل گیا۔ سب کچھ ٹوٹ پھوٹ گیا۔ نہ ماں باپ رہے نہ بھائی بہن نہ سہیلیاں۔ صرف جن ہی جن رہ گیا۔ سارا سارا دن میں اس کا انتظار کھینچتی۔ جب شام پڑتی تو خلوص دل سے دعا مانگتی یا اللہ رات نہ پڑے۔ پھر سے دن نکل آئے۔ وہ دعائیں مانگتا یا اللہ جلدی رات پڑے۔

یہ دن اور رات کی دیوار حائل ہی رہی اب بھی حائل ہے۔

پرانی کہانیوں میں لکھا ہوتا ہے کہ جن اپنی جان طوطے میں ڈال رکھتے ہیں۔

اس جن نے اپنی جان تین طوطوں میں ڈال رکھی تھی۔ ایک والدہ، دوسرے ہاکی اور تیسرے فوج۔

پروین کو یہ تین طوطے ساری عمر یوں منانے پڑے جیسے دیوتا ہوں۔ ماں سو فیصد رگی ساس تھی جو بیٹے کو راشن کر کے بہو کو دینے کی قائل تھی جس کے حکم کے بغیر پتا نہیں ہلتا جس کے کن کہے بغیر بہو کا گھر آباد نہیں ہوتا۔



ہاکی میاں کے لیے ایک جنون تھا۔ عشق سے کئی ڈگریاں اونچا۔

ہاکی ایک ایسا جادو کا لفظ تھا جسے سن کر ایک پراسرار سم سم کھل جاتا۔ پھر ہاکی کے لیے بار بار باہر جانا پڑتا تھا جہاں مکھیاں رس گلے پر بھنبھناتی تھیں اور واپسی پر پروین عاطف کے لباس کے الجھے ہوئے تار گنا کرتی تھی۔

فوج عاطف کے لیے ملازمت نہیں بلکہ فرض منصبی تھی۔ اوڑھنا بچھونا تھی۔ جب مشرقی پاکستان میں سب کور کمانڈروں نے احکام کے مطابق ہتھیار ڈال دیئے تھے تو بھی عاطف نے لڑنا نہ چھوڑا تھا۔ اس نے کہا میں سرنڈر نہیں کروں گا۔

جب وہ تین سال کی قید کے بعد گھر واپس آیا تو وہ ایک ٹوٹا ہوا گڈا تھا۔ ایک کٹر مولوی۔ جیسے نصوح کئی سال مرے رہنے کے بعد پھر سے زندہ ہو گیا ہو۔

پروین میں لکھنے کی صلاحیت شروع سے ہی موجود تھی بچپن میں گھر کے سبھی لوگوں نے اسے دل کھول کر بگاڑا۔ اس لیے اس کی توجہ خود پر مرکوز رہی۔ اس نے اپنی ذات میں کوئی کمی محسوس نہ کی۔ لہٰذا کسی جدوجہد کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔

کالج میں وہ سب کی آنکھ کا تارا تھی۔ اسے اظہار کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ تارے کا تو وجود ہی اظہار ہوتا ہے۔ جوان ہوئی تو لوگ اس کی باتیں سن سن کر سر دھنتے تھے۔ جس کے پاس باتوں کی پھلجھڑیاں ہوں وہ قلم دوات سے سر کیوں کھپائے۔ جوانی میں احمد بشیر اس کے سر پر مسلط تھا۔

احمد بشیر ایک جانا پہچانا جرنلسٹ تھا جو بہت کم لوگوں کو اپنے برابر سمجھتا تھا۔ اس نے پروین سے پیار تو بہت کیا لیکن ایسا پیار جو چھوٹوں سے کیا جاتا ہے۔ احمد بشیر کے سائے میں رہ کر کوئی اُبھر نہیں سکتا۔

احمد بشیر بظاہر ادب نواز ہے لیکن درپردہ وہ تاریخ اور سیاست کے سوا کچھ نہیں مانتا۔ اس لیے احمد بشیر نے پروین میں تخلیق کا شوق پیدا نہ کیا۔

پھر عاطف منظر پر آ گیا۔ عاطف کے فیوڈل لارڈ نے پروین کی خود اعتمادی کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ عاطف کی تمام تر قدریں پروین سے مختلف اور متضاد تھیں۔ اس مجازی خدا نے

کہا دیکھ لڑکی۔ تیرا کام یہ ہے کہ میری طرف دیکھ۔ میری بات سن۔ میرا انتظار کھینچ۔ میری دلچسپیوں سے لگاؤ رکھ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پروین یوں بکھر کر رہ گئی جیسے پلاسٹک کی گڑیا کے اندر کا تاگا ٹوٹ جائے تو اعضا بکھر جاتے ہیں۔

جب عاطف پی او ڈبلیو کی حیثیت سے تین سال پروین سے بچھڑا رہا تو زندگی میں پہلی مرتبہ پروین نے اپنے اندر ایک خلا محسوس کیا۔ اور اس میں اظہار کی خواہش پیدا ہوئی۔ ان دنوں اس نے پہلی کہانی تخلیق کی۔

پروین کی تحریروں میں بنیادی طور پر بلا کا احتجاج ہے لیکن اس کے اسلوب کا بانکپن تلخی پیدا ہونے نہیں دیتا۔

سفرناموں میں وہ پھلجھڑیاں چلاتی چلے جاتی ہے۔

افسانوں میں اس کی شخصیت کی شوخی اور شگفتگی دکھ کے اس گہرے احساس کو کیا فلاج کیے رکھتی ہے جو پروین کے انگ انگ میں رچا بسا ہے۔

ادب میں مقام حاصل کر لینے کے باوجود پروین میں خود اعتمادی کا فقدان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ابھی تک سنجیدگی سے تخلیق کو نہیں اپنایا۔

مجھے ایسا لگتا ہے کہ ایک دن جب اس کی تخلیق پر بھی بندش لگ جائے گی تو اس کے اندر کا احتجاج یوں باہر نکلے گا جیسے جن بوتل سے باہر نکلتا ہے۔

☆

پرتو روہیلہ

۱۹۸۸ء

# بیراگی

میں نے پہلی بار پرتو کے دوہے سنے تو میرے روبرو بیراگ اور تیاگ بھرا ایک سادھو آ کھڑا ہوا۔

جب پہلی بار مختار سے آمنا سامنا ہوا تو دیکھا کہ ایک خوش شکل مخملی تمدن سے بھرپور آدمی ہے۔ کتابی چہرہ ہے ہوکیرز سے اٹی ہوئی پیشانی ہے۔ وقار میں گندھا ہوا عجز ہے، قد کاٹھ اور چال ڈھال میں مردانگی کا کلف لگا ہوا ہے، جس پر نسائی کناری لشکارے مار رہی ہے۔ آنکھیں چھلکی چھلکی بھیگی بھیگی دکھی دکھی خواب آلود ایسا طرفہ تماشہ نظر آیا جیسے جھٹپٹے کا عالم ہو۔ دو وقت مل رہے ہوں۔ ایک جانب بے باک مردانگی دوسری جانب نسائی جھیپ۔ پرتو اور مختار کو ایک قالب میں دیکھ کر میں تو ٹپٹا گیا، حالانکہ انسانی شخصیت کی بوالعجبی سے خاصا واقف تھا، پھر بھی ٹپٹایا۔

اللہ کی صناعی کا بھی جواب نہیں۔ ہر شخصیت میں ایسے راستے تلاش کرو قسم کے گنجلک بناتے ہیں کہ عمر بھر بھٹکتے رہو۔ کہاں کی منزل گھر کا راستہ نہ ملے۔

۱۹۵۸ء میں مجھے ایک ایسے ہی پرتو مختار سے واسطہ پڑا تھا۔ ابن انشا ایک ایسی حلیم تھی، جس میں ساتوں اجناس گھلے ملے ہوئے تھے۔ پرتو میں تو صرف دو تین کی ہی آمیزش ہے۔

آپ نے سند باد جہازی کے سفرناموں میں پڑھا ہو گا کہ دفعتاً ملاح چلاتا ہے۔ زمین زمین جزیرہ۔ جہاز لنگر انداز ہو جاتا ہے۔ مسافر خوشی خوشی جہاز سے اترتے ہیں۔ جزیرے پر پھیل جاتے ہیں۔ ساز و سامان کھولا جاتا ہے۔ چولہے جلنے لگتے ہیں۔ پراٹھے پکنے لگتے ہیں۔ دفعتاً جہاز کے کپتان کی خوف زدہ آواز گونجتی ہے۔ مسافر دوڑو، بھاگو۔ فوراً جہاز پر

سوار ہو جاؤ۔ یہ جزیرہ نہیں مچھلی ہے۔ ابھی غوطہ کھائے گی، تو سب غڑاپ ہو جائیں گے۔

انسانی شخصیت اس جزیرے کی طرح ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ جزیرہ دکھتی تھی پر تھی مچھلی۔ یہ جزیرہ بھی ہے مچھلی بھی ہے۔ کیا پتہ کب جزیرہ بن جائے، کب مچھلی بن جائے۔ یہ ساکن بھی ہے متحرک بھی۔ سادہ بھی ہے پُرکار بھی۔ بلیک اینڈ وائٹ بھی ہے رنگدار بھی۔ معصوم بھی ہے ہشیار بھی۔ پرتو بھی ہے مختار بھی۔ مختار اکھڑ پٹھان بھی ہے۔ ساتھ ہی ملائم انسان بھی ہے۔ اوپر بے نیازی کا پہاڑ ایستادہ ہے۔ نیچے نیاز کا دھارا بہہ رہا ہے۔ رئیسانہ سج دھج بھی ہے مفلسانہ جھجک بھی ہے، شاہ بھی ہے درویش بھی ہے۔ عاشق بھی ہے محبوب بھی ہے۔

جہاں تک مجھے علم ہے پرتو کی کہانی سادہ اور صاف سی کہانی ہے۔ انیسویں صدی کے وسط میں مختار علی کے آباء سرحد میں اپنا وطن مردان چھوڑ کر وسطی ہند میں پہنچے اور وہاں علاقے کے حکمران بن گئے۔ پھر سالہا سال حکمرانہ اور خسروانہ زندگی میں سرشار رہے۔

اس زمانے کے حکمرانوں میں بھی اگرچہ دورنگی موجود تھی۔ مثبت اور منفی کا میل تھا۔ لیکن ایسا کہ دیا جلائے رکھتے تھے۔

پھر جب پاکستان کے قیام کے لیے مسلم لیگ نے جدوجہد شروع کی تو مختار علی کے والد میں اسلام کا جذبہ یوں اُبھرا جیسے جن بوتل سے نکلتا ہے۔

صاحبو اللہ نہ کرے کسی میں اللہ کی لگن کا جذبہ اُبھرے۔

بندے کی لگن کا جذبہ تو گردوپیش سے بیگانہ کر دیتا ہے اللہ کے عشق کا جذبہ خود سے بھی بیگانہ کر دیتا ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ مختار علی کے والد کو عیش و آرام چبھنے لگے۔ راج پاٹ کھلنے لگا۔ ایک اضطراب نے گھیر لیا۔ ایک آندھی ایسی چلی کہ مطلع غبار آلود ہو گیا۔ کرنے والا جو چاہے کر دیتا ہے۔ کبھی انگاروں کو پھولوں میں بدل دیتا ہے۔ کبھی پھولوں کو انگاروں میں۔

یوں مختار علی کے والد ہند میں اپنی حکمرانی چھوڑ کر قیام پاکستان کی تبلیغ کرنے کے لیے واپس مردان میں آ گئے۔ جس مردان میں وہ آئے تھے وہ آج کا مردان نہیں تھا بے آب د



گیاہ پہاڑوں پر دھول اڑتی تھی۔ زندگی مسلسل جدوجہد تھی۔ قبیلے دوست اور دشمن میں بٹے ہوئے تھے۔ زندگی دو محوروں کے گرد گھومتی تھی۔ روایت اور شجاعت۔

علاقے کی واحد مثبت خصوصیت یہ تھی کہ باہمی رقابتوں، شکر رنجیوں، دشمنیوں کے باوجود دلوں میں اللہ دھڑکتا تھا۔ مختار کے باپ کا جذبہ جہاد مشکلات کے باوجود کامیابی سے ہمکنار ہوا۔ مملکتِ خداداد وجود میں آ گئی۔ مختار بیچارہ خواہ مخواہ میں پٹ گیا۔

پیدا ہوا تو منہ میں سونے کا چمچہ تھا۔ بچپن شاہانہ ٹھاٹھ میں گزرا۔ ایک تو رئیس دوسرے بچہ۔ پہلے آیاؤں نے سنبھالا۔ پھر کھلائیاں آ گئیں۔ اتالیق گھر پر پڑھانے آتے تھے۔ رودینا سب سے بڑا حربہ تھا۔ مانگ اور حصول کے درمیان کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ پھر دفعتاً ہجرت عمل میں آئی۔ خواص کی مسند سے اٹھ کر عام دربار میں آ کھڑا ہوا۔

بزرگوں کا کہنا ہے کہ مسجد بھی کیا جگہ ہے، جو حضوری سے نکال کر عام دربار میں لے آتی ہے لیکن پرتو بزرگ نہ تھا۔ عام دربار میں کھڑا ہونے کی عادت نہ تھی۔ ٹپٹا گیا۔ اندر ریشمی مسندیں بچھی ہوئی تھیں۔ باہر سرحد کی ویرانی تھی۔ کون جانے پرتو پر کیا گزری۔ تعلیم حاصل کرنا عائد ہو گیا۔ کہاں رئیسانہ گردوپیش میں شغلاً تعلیم حاصل کرنا کہاں ''کراوڈ'' میں ضرورتاً ڈگری حاصل کرنا۔

ماں باپ بھی عجیب شے ہیں۔ بچے کے لیے جان تک قربان کرنے میں دریغ نہیں کریں گے۔ لیکن اپنا نقطہ نظر نہیں بدلیں گے۔ عظیم مفکر کارل مارکس کی طرح وہ بچے کے لیے روٹی کپڑا اور مکان کی بات ضرور سوچیں گے۔ بچے کی خوشی کی بات پر دھیان نہیں دیں گے۔ مختار کے والدین نے بھی ایسا ہی کیا۔ انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ مختار اندر سے کیا ہے۔ اندر سے مجبور تو نہیں۔ انہوں نے سوچا کہ مختار کو صحیح معنوں میں مستقبل کا مختار بنا دیں، اسی لیے انہوں نے پہلے بی اے آنرز کروا دیا۔ پھر قانون پڑھوایا اور آخر میں سول سروس امتحان دلوا کر سی ایس پی افسر بنوا دیا۔

سی ایس پی افسر کو اقتدار تو حاصل ہوتا ہے، لیکن اس میں جی حضوری کی پخ لگی ہوتی ہے۔ چاہے تو دولت بھی کما سکتا ہے، لیکن وہ ضمیر کی چبھن سے آلودہ ہوتی ہے۔ سی ایس پی

افسر کو سب کچھ حاصل ہو سکتا ہے مگر اطمینان قلب سے ہمیشہ محروم رہتا ہے۔

میں نے قدرت اللہ شہاب کے ساتھ کچھ وقت گزارا ہے۔ مجھے علم نہیں کہ اُن پر کیا بیتی تھی، لیکن مجھے ایسا لگتا تھا جیسے کوا مجبور امور کے پر لگائے بیٹھا ہے۔

مختار علی کی سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ خاندان میں وہ پہلا فرد تھا جسے نوکری کرنی پڑی۔ خون میں نوکری کرانے کا عنصر موجود تھا۔ نوکری کرنے کا نہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ مختار علی آج تک تذبذب کے عالم میں ہے کہ نوکری کیسے کرے۔ کیا کرے کیا نہ کرے۔ کس بات پر بول پڑے، کس بات کو پی جائے۔

پھر ایک اور قیامت ٹوٹی مختار کے اندر ایک شاعر نے انگڑائی لی۔ گمان غالب ہے کہ یہ شاعر روزِ اوّل سے ہی مختار علی کے اندر چھپا بیٹھا تھا۔ پتہ نہیں کب سے اس نے مختار کی حیات میں سلگنا شروع کیا، کب دھواں دینے لگا۔ مشکل یہ ہے کہ ہم بوٹے کو اس وقت دیکھتے ہیں، جب وہ زمین سے سر نکالتا ہے۔ زمین تلے بیج پھوٹتا نہیں دیکھتے۔

مختار علی کا کہنا ہے کہ ابنِ انشا کی چاند نگر کو دیکھ کر تحریک پیدا ہوئی۔ بات میرے پلے نہیں پڑتی۔ بے شک پرتو میں ابنِ انشا کا بہت کچھ ہے۔ جوگ ہے، بیراگ ہے، تیاگ ہے، لیکن چاند نگر میں تو ابنِ انشا خود موجود نہیں ہے۔ چاند نگر تو اس دور کی پیداوار ہے جب فکری فرزانے اسے اغوا کر کے سوچ نگر میں لے گئے تھے اور یوں اسے اپنے راستے سے بھٹکا دیا تھا۔

ابتدا میں تو پرتو چوری چوری لکھتا رہا۔ شرما شرما کر لکھتا رہا، صرف کہنے کا شوق تھا چھپنے کا نہیں۔

ہم میں سے بہت سے تخلیق کار اس حقیقت سے واقف نہیں کہ جب تک شخصیت میں نسائی آمیزش نہ ہو، تخلیق کاری ممکن نہیں ہوتی۔ کچھ اس حقیقت کو جانتے ہیں مانتے ہیں، پرتو پہلے تو جانتا نہیں تھا اب مانتا نہیں۔

ابتداء میں چوری چوری شرمائے شرمائے پرتو نے ہندی انگ میں بہت سی غزلیں لکھیں۔ ایسی غزلیں جو منفرد تھیں۔



ایک غزل دوسرے ہندی میں۔ ابتدا ہی دو آتشہ سے کی۔ نسائی رچاؤ نے بہار تو رچا دی۔ لیکن شائع کرنے میں حیا مانع رہی۔ پھر ایک دوست نے زبردستی انہیں کتاب کی صورت میں شائع کر دیا، یوں پرتو کا بھانڈا چوراہے میں پھوٹ گیا۔

پھر پرتو کے دوست جمیل جالبی نے جس کی آنکھ دیکھ دیکھ کر غنڈی ہو چکی ہے کہا میاں دوہے لکھو۔ یوں نسائی رچاؤ نے سادھو کا بھیس بدل لیا۔ جالبی کے مشورے نے لاج کی رکاوٹ دور کر دی۔ پرتو دوہوں میں کھل کھیلا، جھجک دور ہوئی۔ آوارہ کو راستہ مل گیا۔ سب طلب کا کھیل ہے، ایسی طلب جس کی منزل نہ ہو۔ طلب تو ایک راستہ ہی راستہ ہے۔ چلنا چلتے رہنا، چاہے پیا کے ملنے کی آس ہو، یا نہ ہو۔ پھر بھی چلتے رہنا۔

-☆-

۱۹۸۸ء

# صاحبِ دل

۱۹۶۸ء میں مجھے پہلا ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ تقریباً ایک مہینے کے بعد مجھے کراچی سے ایک خط موصول ہوا۔ لکھا تھا۔ خوشی کی بات ہے کہ آپ انجمن صاحب دل کے رکن بن گئے ہیں۔ میں انجمن کا صدر نشین ہوں چونکہ سینئر موسٹ ہوں۔ آج سے تقریباً دس سال پہلے مجھے دل کا دورہ پڑا تھا۔ اب آپ پر لازم ہے کہ میرے احکامات پر عمل کریں۔ اور میری ہدایات کے مطابق زندگی بسر کریں۔ نیچے حسام الدین راشدی بقلم خود تھا۔

یوں حسام الدین مجھ سے متعارف ہوا۔ وہ بھی برائے نام۔

جواب میں مَیں نے لکھا جناب والا آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ جب میں ہسپتال سے ڈسچارج ہوا تھا تو ہارٹ اسپیشلسٹ نے مجھ سے کہا تھا۔ مفتی صاحب اب آپ یہ نہ بھولئے گا کہ آپ دل کے مریض ہیں اور میں نے ڈاکٹر کو جواب دیا تھا کہ اگر آپ میرے خیر خواہ ہوتے تو یہ کہتے کہ مفتی صاحب بھول جایئے گا کہ آپ دل کے مریض ہیں۔

حسام الدین صاحب مجھے اپنی انجمن صاحب دل کا رکن ضرور بنایئے لیکن احتیاط کا سبق نہ پڑھایئے۔

اس پر حسام الدین نے لکھا۔ کوئی بات نہیں آپ کو جلد پتہ لگ جائے گا کہ جسم ایک خودسر ضدی حقیقت ہے۔ جب چاہے ذہن کو لائن حاضر کر دے۔ پھر آپ دست بستہ ہماری خدمت میں حاضر ہو کر کہیں گے کہ عالی جاہ راہنمائی کیجیے۔

چار چھ مہینے حسام الدین سے میری تحریری نوک جھوک چلتی رہی۔ ان دنوں حسام الدین میرے لیے صرف ایک نام تھا۔ پھر ایک دن میں نے کسی صاحب سے ذکر کیا تو وہ





بولے۔ ارے حسام الدین تو ایک محقق ہے ناقد ہے عالم ہے۔ میں نے کہا وہ کوئی اور حسام الدین ہوگا یہ حسام الدین جو مجھے خط لکھ رہا ہے یہ تو کوئی ''ہماتڑ ساتھ'' ہے۔ کبھی عالم بھی اہل دل ہو سکتا ہے۔ عالم ہو اور اپنی تحریر میں علم کی ٹیں نہ دکھائے یہ تو ایسا ہی ہوگا کہ حسینہ ہو اور مستور رہے۔

صاحبو آپس کی بات ہے اگر آپ علماء تک بات نہ پہنچائیں تو آپ سے کہہ دینے میں کیا حرج ہے کہ عالم ڈوبتا نہیں تیرتا رہتا ہے۔ بھیگتا نہیں سوکھا کاٹھ گلتا نہیں اپنی ان گلی کنی قائم رکھتا ہے۔ بائبل میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

Beware of the Varitv of Paity

ماہر نفسیات کہتے ہیں Washers are Mouslers ۔ بلھے شاہ فرماتے ہیں:
علموں بس کریں او یار۔ پھر اتفاق سے لاہور کے اردو بورڈ میں ایڈیٹر کی حیثیت سے میری تعیناتی ہوگئی۔ مجھے علم نہ تھا کہ حسام الدین بھی اردو بورڈ کا ایڈیٹر ہے۔ وہاں گیا تو دیکھا کہ اردو بورڈ کے ڈائریکٹر اشفاق احمد کے سامنے میرے جیسا ایک پھٹیچر آدمی بیٹھا ہے۔ میلا میلا، بجھا بجھا، زبان بند، سوچوں کا مارا ہوا۔

اشفاق احمد نے ہمارا تعارف کرایا۔ بولا آپ ہیں حسام الدین راشدی۔ ارے یہ ہے حسام الدین راشدی۔

اسے دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ نہ چہرے پر چمک نہ لباس میں فیشن نہ گردن پر کلف نہ گفتگو میں ٹیں۔

حسام الدین کو مجھ سے مل کر سخت مایوسی ہو رہی تھی کہ بد پرہیزی اور بے احتیاطی کے باوجود میں ابھی تک خاصہ صحت مند نظر آتا تھا۔ زندہ تھا۔

علیحدگی میں اس نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا آپ روز واک کرتے ہیں۔ جواب میں میں نے کہا نہیں تو۔

کوئی ہلکی ورزش۔۔۔۔ جی نہیں۔

دوا باقاعدگی سے کھاتے ہیں نا۔۔۔۔ چھ مہینے طب کی دوا کھائی تھی۔ اب کوئی دوا نہیں

کھا رہا۔

کس کس چیز سے پرہیز کرتے ہیں۔۔۔ کسی چیز سے نہیں۔ تمباکو والا پان بھی نہیں چھوڑا۔ اس پر حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ بولا۔ تو پھر آپ کو ہارٹ اٹیک نہیں ہوا تھا۔ کچھ اور ہوگا۔

میں نے کہا حسام الدین تُو ہارٹ اٹیک سے اس قدر خائف کیوں ہے۔ بھائی میرے ہارٹ اٹیک تو دور جدید کے لیے اللہ تعالیٰ کا ایک تحفہ ہے۔ رحمت ہے۔ نہ بستر پر پڑو۔ نہ کہنیاں رگڑو۔ نہ کسی سے خدمت کراؤ۔ ایک جھٹکا اور وہ گئے، اللہ اللہ خیر سلا۔

صرف حسام الدین ہی نہیں میں بھی عالم حیرت میں تھا۔ اس دوران میں مجھے پتہ چل گیا تھا کہ حسام الدین واقعی عالم ہے، محقق ہے، مورخ ہے، ناقد ہے۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ یہ کیسا عالم ہے جو نہ ہم کے، تم کے کرتا ہے نہ چونکہ چنانچہ، نہ کھنگورے مارتا ہے۔ نہ دلیلیں چھانٹتا ہے۔ مدھم مدھم چمک تو ہے لیکن لشکارے نہیں مارتا۔ ''ہم جانتے ہیں'' طرح کی مسکراہٹ پر اکتفا نہیں کرتا۔ بلکہ منہ پھاڑ کر قہقہے لگاتا ہے۔

اس کے بعد دو تین سال ہم اردو بورڈ کی میٹنگوں میں ملتے رہے۔ اکیلے بیٹھ کر چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے رہے جیسے عورتیں مل کر چھوٹی چھوٹی باتیں کیا کرتی ہیں۔ کوئی موضوع نہ ملتا تو ہم ڈائریکٹر اردو بورڈ کی بدخوئیاں کرتے رہتے۔

صاحبو افسر کی بدخوئیاں کرنے میں بڑی لذت ہوتی ہے بڑی تسکین ملتی ہے۔ مفت کی عیاشی ہے۔

حسام پوچھتا مفتی یہ بتا کہ اشفاق کو سرکاری پیسہ خرچتے ہوئے تکلیف کیوں ہوتی ہے۔ جائز خرچ ہو تو بھی سی سی کرتا ہے۔

یار یہ پوری بات کیوں نہیں کرتا۔ آدھی کہتا ہے آدھی دل میں رکھتا ہے۔ پلہ مار کر دیا کیوں بجھاتا ہے اور تجھے پتہ ہے یہ اردو بورڈ کیوں بنایا گیا ہے۔ اس لیے نہیں کہ اردو رائج کرے بلکہ اس لیے کہ اردو رائج کرنے میں تاخیر کا جواز پیدا کرے۔ میں پوچھتا یار لوگ کہتے ہیں تو عالم ہے، محقق ہے، وہ بڑی سنجیدگی سے جواب دیتا ہاں لوگ کہتے ہیں۔ میں



پوچھتا تُو کیا کہتا ہے۔

وہ جواب دیتا کبھی لوگوں کی باتوں پر یقین کر لیتا ہوں۔ کبھی شک پڑتا ہے۔ یقین نہیں آتا۔ یوں یقین اور بے یقینی کے درمیان لٹکا رہتا ہوں۔

پھر اتفاقاً مجھے کراچی جانا پڑا۔

جب اس نے سنا کہ میں کراچی آیا ہوا ہوں تو وہ دوڑا دوڑا آیا۔ سانس پھولا ہوا تھا۔ بولا۔ میں تیری دعوت کروں گا۔ میں نے کہا حسام الدین تو کیا شے ہے۔ اتنا بڑا مفکر اور محقق ہو کر میڈیا کر کی طرح روایتی جھاڑ جھنکار میں پھنسا ہوا ہے۔ بولا ہاں میں روایتی ہوں۔ ہم سندھی روایتی ہیں۔ کر لے ہمارا کیا کرنا ہے۔ تجھے روٹی کھلا کر رہوں گا۔

میں نے کہا پہلے مجھے اپنا گھر تو دکھا۔

گھر لے جا کر اس نے مجھے ایک بڑے کمرے میں بٹھا دیا۔ وہ کمرہ بھی اونچی چھت والا روایتی کمرہ تھا۔ دیواروں پر فرش سے چھت تک شیلفوں میں کتابیں ہی کتابیں لگی ہوئی تھیں۔ یہاں وہاں فرش پر کرسیوں پر۔ میں نے کہا اتنی ساری کتابیں۔

بولا اندر بھی ہیں۔

میں نے کہا یہ سب کتابیں تو نے پڑھی ہیں کیا؟

وہ خاموش رہا۔

کہا میرے پاس بھی کتابیں ہیں۔ ان میں سے کچھ میں نے پڑھی ہیں۔ بیشتر کتابوں کے صرف ورقے الٹے ہیں۔

وہ بولا پڑھنا میری بیماری ہے میں صرف پڑھتا ہی نہیں کتابوں پر حاشیے بھی لکھتا ہوں۔

میں نے کہا تیرے گھر والی یہ کیسے برداشت کر لیتی ہے۔

بولا نہیں کرتی۔ نہ کتابوں کو نہ مجھے۔

حسام الدین کی شخصیت کے اکھاڑے میں ایک میلہ لگا ہوا تھا۔ اس میلے میں ایک ہجوم تھا۔

طرح طرح کے لوگ، بچے، بوڑھا، جذباتی عقلی روایتی، ایمانی، بغاوتی، عوامی، خواصی، دانشوراور پتہ نہیں کیا کیا۔

صاحبو اللہ نے انسان بھی کیا چیز بنائی ہے۔ اس کی شخصیت میں انوکھے حیران کن تضادات کے اندھیرے اجالے صرف لگائے ہی نہیں بلکہ سجائے ہیں۔ یوں سجائے ہیں کہ ان میں ہم آہنگی پیدا کر دی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا بھی جواب نہیں جو تضادات سے ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ نیگیٹو پازیٹو کو ملا کر روشنی پیدا کرتا ہے اور انسانی شخصیت کو اپنے رنگ میں ڈھال کر ہر فرد کو وحدہ لاشریک بنا دیتا ہے۔ صاحبو آج تک اربوں انسان پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن ایک دوسرے سے نہیں ملتا۔ دوسرا تیسرے سے نہیں ملتا کیا تخلیق کاری ہے کیا حکمت ہے۔

مقام شکر ہے کہ ہم اللہ کی تخلیق کاری پر غور وفکر نہیں کرتے ورنہ حیرت طاری ہو جائے۔ پاگل ہو جائیں۔

حسام الدین بڑی پیاری اور جاذب شخصیت کا مالک تھا لیکن اس میں تلخیاں بھی تھیں۔

شخصیت کے بھیدی کہتے ہیں۔ تم فرد کی کجیاں نہ دیکھو تلخیاں نہ گنو، جزویات پر توجہ نہ دو۔ یہ دیکھو کہ مجموعی ذائقہ کیا ہے۔ خوشبو کیسی ہے۔ خدوخال کو نہ دیکھو یہ دیکھو کہ چھب کیسی ہے۔ لونگ کا لشکارہ کیسا ہے۔

حسام الدین کی شخصیت میں بڑی چھب تھی۔ خوشبو تھی ذائقہ تھا اس کی تلخیاں ایسے تھیں جیسے دسترخوان پر اچار ہو چٹنی ہو ساس ہو۔

ایک روز میں نے کہا حسام الدین، لوگ کہتے ہیں تم متعصب سندھی ہو۔

اس نے گھور کر میری طرف دیکھا بولا تم نہیں ہو متعصب پنجابی۔ میں نے کہا نہیں۔

بڑے احمق ہو وہ بولا۔ مثبت تعصب کے بغیر آدمی انسان نہیں بن سکتا۔ ماں باپ کے حق میں تعصب۔ خاندان کے حق میں تعصب۔ گاؤں کے حق میں تعصب۔ علاقے کے حق میں تعصب۔ وطن کے حق میں تعصب۔



جب حسام الدین کو ہاجسن کی بیماری ہوئی اور وہ بستر سے لگ گیا تو اس نے مجھے ایک خط لکھا۔ مفتی تو سچ کہتا تھا واقعی ہارٹ اٹیک آج کے دور کے لیے اللہ کا ایک گفٹ ہے۔ رحمت ہے۔

ایک روز میں نے حسام الدین سے کہا یار راشدی تم کیسے وڈیرے ہو۔ تو عالم اور محقق ہے، تیرا بھائی علی احمد دانشور اور صحافی ہے۔ وڈیرے کو علم و دانش سے کیا تعلق وہ تو حکمران ہوتے ہیں۔ میری یہ بات پتہ نہیں علی احمد راشدی تک کیسے جا پہنچی۔ علی احمد راشدی سے میں بے حد خائف تھا۔ جب وہ وزیر اطلاعات تھے تو میں نے ان سے پوچھا تھا۔

میں نے کہا یہ بتائیے کہ ہماری وزارت اطلاعات سربراہ ملک کی بیری کیوں ہوتی ہے۔

ان کے چہرے کے کانٹے کچھ اور نوکدار ہو گئے۔ کیا مطلب وہ گرجے۔

میں نے کہا جناب وزارت اخبار کے ہر صفحے پر سربراہ کی تصویر چھپواتی ہے اور ہر خبر پر ان کی سرخی لگواتی ہے۔

پھر، وہ گرجے۔

میں نے کہا جناب جسے بار بار دیکھا جائے، بار بار سنا جائے وہ دل سے اتر جاتا ہے۔

ان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ لیکن کانٹوں نے بڑھ کر اسے ڈھانپ لیا۔ بولے دلوں سے ہی اتارتی ہے نا۔ کرسی سے تو نہیں اتارتی۔

میں یہ جواب سن کر خوف سے بھاگا۔

ان کی بیگم ممتاز راشدی دوڑی دوڑی آئی۔ بولی آپ چل کیوں پڑے۔ بیٹھتے کیوں نہیں۔

میں نے کہا۔ کیا بیوٹی اینڈ دی بیسٹ کا منظر دیکھنے کے لیے بیٹھوں۔ وہ قہقہہ مار کر ہنسی۔ بولی میرے میاں دیکھنے کی چیز نہیں ہیں۔ محسوس کرنے کی چیز ہیں۔

اور یہ نوکیلے کانٹے، میں نے پوچھا۔

بولی یہ نوکیلے کانٹے گوند سے چپکائے ہوئے ہیں۔ اصلی نہیں۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ وڈیروں کے متعلق میری بات جب علی احمد راشدی تک پہنچی تو وہ بولے حسام الدین، مفتی کو سندھ گھماؤ۔ اسے وڈیرے کے مفہوم کا علم نہیں ہے۔

مجھے سندھی اور ملتانی لوگ بہت پسند ہیں۔ اس لیے کہ ان میں وہ تمام کمیاں کجیاں موجود ہیں جو مجھ میں ہیں۔

سندھیوں کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ ان میں شدت ہے، جذبہ ہے، سوڈے کی بوتل کی طرح بلبلے اٹھتے ہیں۔ وہ بات اندر نہیں رکھتے بلکہ اُگل دیتے ہیں۔

سندھیوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں شدت ہے۔ جذبہ ہے، وہ بات کہہ دیتے ہیں۔

ملتان میں تو مجھے نو سال رہنے کا موقع ملا تھا۔ سندھ میں کبھی نہیں گیا تھا۔ اس لیے میں نے راشدیوں کی دعوت قبول کر لی۔

سندھ میں گھوم پھر کر میں نے دیکھا کہ بے شک سندھ میں وڈیرے حکمران ہیں اور ان میں وہ تمام خامیاں موجود ہیں جو حکمرانوں میں ہوتی ہیں، لیکن ساتھ ہی ان کے دلوں میں ممتا کے دھارے چل رہے ہیں۔ ڈالڈے والی ممتا نہیں، گھر کے گھیو والی۔

☆



# ادب رانی

کچھ باتیں سمجھ کی پہنچ سے باہر ہوتی ہیں۔

پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے لیکن ایسا ہوتا ہے کہ ہر ملک کے ادبی حلقوں میں ایک ادب رانی ہوتی ہے۔ وہ تخت پر نہیں ادب کے چرنوں میں بیٹھی ہوتی ہے۔ اسے ادیب ہونے کا دعویٰ نہیں ہوتا۔ ادب لکھتی نہیں۔ دانشور اور نقاد کی طرح ادب پر بحث نہیں کرتی۔ اس میں ادبی حس کی تاریں لگی ہوتی ہیں۔ جس طرح سارنگی میں سرتیاں لگی ہوتی ہیں۔ انہیں بجایا نہیں جاتا آپ ہی آپ بجتی رہتی ہیں۔ اپنی سر پیدا نہیں کرتیں۔ دوسری تاروں کی سُر کو گونجتی رہتی ہیں۔

ادب رانی میں صرف ریسیور لگا ہوتا ہے مائیک نہیں۔ سارا جسم کان ہوتا ہے زبان ہوتی ہی نہیں۔ سرفراز پاکستانی ادبی حلقوں کی ادب رانی ہے۔

ٹھہریئے شاید آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ادب رانی بننا اعزاز ہے مسرت کا مقام ہے۔ اُونہوں یہ بات نہیں۔ اللہ نہ کرے کوئی ادب رانی بنے۔ آپ ادب کی تاریخ پڑھ کر دیکھ لیجیے ہر ادب رانی جاذب نظر ہوتی ہے۔ ایک ادبی حس دوسرے جاذبیت سونے پر سہاگہ۔ بس اس کی یہی بدقسمتی ہوتی ہے۔ پتہ نہیں کیوں جاذب نظر ہوتی ہے اللہ کے بھید کس نے پائے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ قدرت ادب کے دیئے میں تیل ٹپکاتی رہتی ہے اس لیے کہ بتی سوکھ نہ جائے۔ روشنی مدھم نہ پڑ جائے۔

سرفراز کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ اچھی لگتی ہے۔ صاحبو۔ عورت کی صرف دو بدقسمتیاں ہوتی ہیں ایک یہ کہ وہ اچھی لگتی ہے، دوسری یہ کہ وہ اچھی نہیں لگتی۔ اب بولو کوئی کیا کرے کیا

نہ کرے۔

جو اچھی لگتی ہے وہ نگاہوں پر چڑھ جاتی ہے جو نگاہوں پر چڑھ جاتی ہے وہ دلوں سے اُتر جاتی ہے۔ جو اچھی لگتی ہے اس کے گرد بھیڑ لگ جاتی ہے۔ ایک کہتا ہے میں تجھے اپنی ڈب میں لپیٹ لوں۔ دوسرا کہتا ہے میں تیرا ملیدہ کر کے جسم پر مل لوں۔ تیسرا کہتا ہے میں تجھے برقعے میں لپیٹ دوں تا کہ دوسرے نہ دیکھ سکیں۔

سرفراز کی مشکل یہ ہے کہ وہ صرف باہر سے ہی اچھی نہیں اندر سے بھی اچھی ہے۔ کچھ زیادہ ہی اچھی ہے۔ اس کی شخصیت سے مٹھاس کی پھوار اڑتی رہتی ہے۔ جس خاتون سے مٹھاس کی پھوار اڑتی ہے اس کے متعلق ہم خوش فہمیاں پال لیتے ہیں۔ اور جب خوش فہمیاں پوری نہیں ہوتیں تو نقاب سے اُبھرے ہوئے تار گنتے ہیں۔ انتقاماً آواز بلند گنواتے ہیں۔

سرفراز کی شخصیت کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس کے اندر ممتا کے دھارے چل رہے ہیں۔ جو دوسروں کی تلخیوں کو خس وخاشاک کی طرح بہا کر لے جاتے ہیں۔

صاحبو میں نے زندگی، تین خواتین کی گھنی چھاؤں میں بسر کی ہے۔

بانو قدسیہ، پروین عاطف اور سرفراز، باقی جتنی بھی تھیں کڑی دھوپ تھیں۔

یہ امریکہ ہمارے لیے ابن انشا نے دریافت کی تھی۔

دکھا کر بولا کیسی لگی۔

میں نے کہا اچھی لگتی ہے۔

بولا ککّے زین ہے۔

میں نے کہا میں نہیں مانتا۔

بولا کیوں نہیں مانتا۔

میں نے کہا ککّے زینوں کو جانتا ہوں ہمارے محلے کے پہلو میں ککّے زینوں کا محلہ ہے۔

بولا ککّے زین اچھی نہیں لگتی کیا۔

دیکھنے میں اچھی لگتی تھیں لیکن جب بولتی تھیں تو میں کانوں میں انگلیاں دے لیا کرتا



تھا۔ پر یہ تو میٹھا بولتی ہے۔

بولا صرف میٹھا بولتی ہی نہیں میٹھا دیکھتی ہے۔ میٹھا کھلاتی ہے۔ لیکن مفتی اس کے قریب نہ جانا۔

کیوں میں نے پوچھا۔

بولا مشکل میں پڑ جائے گا۔

کیسی مشکل، میں نے پوچھا۔

واپس آنا مشکل ہو جائے گا۔ گھر کا راستہ نہیں ملے گا۔

ابن انشا بڑا شاعر ہی نہ تھا بڑا عاشق بھی تھا وہ جانتا تھا کہ عشق سفر ہی سفر ہے، منزل نہیں۔ وہ منزل کی طرف جانے والی تمام کشتیوں کو جلا دیتا تھا۔ کہیں قرب ممکن نہ ہو جائے۔

میں نے انشا کی بات کو نظر انداز کر دیا۔ میں نے بازار سے خوشبودار تیل خریدا۔ فیئر اینڈ لولی کریم خریدی، لکس صابن سے منہ دھویا۔ بڑے اہتمام سے بال بنائے اور سرفراز کے گھر جا پہنچا۔ اس محترمہ نے میرا سارا اہتمام نظر انداز کر دیا اور اپنی معصومیت اور مٹھاس کی ڈھال ایسے چلائی کہ مجھے نہتا کر کے نتھ کے بٹھا دیا۔ ایسا بٹھایا کہ آج تک نتھ کر بیٹھا ہوں اگر یہ مجھے نہتا نہ کرتی تو میں کب سے واپس گھر آ گیا ہوتا۔ پھر یہ محترمہ مجھے اپنے میاں اقبال کے پاس لے گئی۔ وہ اُن دنوں ہسپتال میں پڑا تھا۔ اسے دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ وہ بھی نہتا ہے اور نتھ کر بیٹھا ہوا ہے۔ اس دن سے آج تک ہم دونوں میں دوستی کا گہرا رشتہ استوار ہے۔ میں نے اقبال سے پوچھا کہ تجھے کیا بیماری ہے اقبال نے کہا ابھی ڈائیگنوز نہیں ہوا۔ وہ کہتے ہیں بیماری سمجھ میں نہیں آتی۔ میں نے کہا مجھے سمجھ میں آتی ہے۔ کیا اس نے پوچھا۔ میں نے کہا تیری بیماری تیرے سامنے بیٹھی ہوئی ہے۔

پھر سرفراز کا نام ہم نے بداموں والی رکھ دیا چونکہ وہ مہمانوں کو بادام کھلایا کرتی تھی۔

ہر پندرہ بیس دن کے بعد ہم سب اس کے ہاں بادام کھانے جایا کرتے تھے۔ ابن انشا، عکسی میں اشفاق احمد، احمد بشیر اور قدرت اللہ شہاب۔

انہی دنوں مجھے پتہ چلا کہ سرفراز کی بیٹیاں اور بیٹے پڑھائی میں فرسٹ کلاس فرسٹ

رہتے ہیں۔ انہیں اعزاز ملتے ہیں گولڈ میڈلسٹ ہیں۔ حیرت سے میرے ذہن کا فیوز اڑ گیا۔ یا اللہ یہ کیا بھید ہے۔ کمیٹی کی لالٹین کے نیچے بیٹھ کر پڑھنے والوں کو تو فسٹ کلاس فسٹ آتے ہم نے اکثر دیکھا ہے لیکن راجہ بازار کے ٹریفک چوک پر بیٹھ کر پڑھنے والوں کو فسٹ آتے کبھی نہ دیکھا نہ سنا۔

رانی کی بات تو ہوگئی آیئے اب راجہ کی بات کریں جن دنوں فیض کالج میں نیا نیا پروفیسر لگا تھا ان دنوں آپ نے فیض کو نہیں دیکھا۔ میں نے دیکھا تھا اس کی آنکھوں سے بیر بہوٹیوں کی پھوار اڑتی تھی وہ چھیڑنے والی آنکھیں نہیں تھیں الٹا وہ آنکھیں ازخود چھڑی ہوئی تھیں۔ بُری طرح چھڑی ہوئی تھیں۔ میں نے فیض سے کہا جناب والا اگر آپ گاگلز پہن کر باہر نکلا کریں تو کیا حرج ہے۔ پبلک سیکیورٹی کا سوال ہے۔ اس پر فیض مسکرایا میرے منہ پر شربت صندل کے چھینٹے پڑے۔

اکثر سوالات کا جواب فیض صندل کے چھینٹوں سے دیا کرتا تھا۔ قدرت اللہ شہاب نے ایک روز بر سبیل تذکرہ فیض سے کہا۔ فیض صاحب جب آپ نے کالج میں لیکچرار کی آسامی کے لیے عرضی دی تھی میں نے بھی دی تھی۔ انٹرویو کے لیے صرف دو امیدواروں کو بلایا گیا تھا ایک آپ تھے دوسرا میں تھا۔ پرنسپل ڈاکٹر تاثیر نے پہلے آپ کو انٹرویو کے لیے بلایا میں باہر بنچ پر بیٹھا انتظار کرتا رہا تھا۔ پانچ منٹ گزر گئے، دس منٹ گزر گئے، آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ میں نے سوچا یا اللہ یہ کیسا انٹرویو ہے۔

ڈیڑھ گھنٹے کے بعد دروازہ کھلا۔ ڈاکٹر تاثیر اور آپ کمرے سے باہر نکلے۔ ڈاکٹر تاثیر نے آپ کو کلاوے میں لیا ہوا تھا اور آپ اس کے کندھوں سے چمٹے ہوئے تھے۔ دونوں کے منہ سے شربت صندل کی خوشبو آ رہی تھی۔ شہاب بولا میں نے ڈاکٹر تاثیر سے کہا جناب والا میرا انٹرویو کب ہوگا۔ ڈاکٹر تاثیر نے کہا 'دی انٹرویو از اوور ینگ مین یو مے گو۔''

قدرت اللہ بولا فیض صاحب اگر اس روز مجھے سلیکٹ کر لیا جاتا تو میں عمر بھر پروفیسر رہتا اور آپ خار کھا کر، آئی سی ایس کے مقابلے میں بیٹھ کر ڈپٹی کمشنر بن جاتے۔ یوں قسمتوں کے دھارے ہی بدل جاتے۔ فیض کی آنکھوں سے شربت صندل کے چھینٹے



اڑے۔

صاحبو فیض کی شخصیت بناتے وقت گھپلا ہو گیا تھا۔ شراب سیخ پہ ڈالی کباب شیشے میں، سا گھپلا۔ بڑا شاعر مے خوار صوفی اور کمیونسٹ کی کھچڑی پک گئی۔ طبیعت کے لحاظ سے وہ مٹھاس ہی مٹھاس تھا۔ شربت صندل کے چھینٹے شیرے کا مرتبان۔

اب لیجیے کتاب کی بات۔ یہ کتاب ایک مختصر کہانی ہے کہ ایک شہد کی مکھی اڑتی اڑتی آئی اور شیرے کے مرتبان میں پھنس گئی۔ سرفراز کے پر کٹ گئے اڑان گئی۔ فیض کو ممتا سے بھرا ہوا مرتبان مل گیا اور ہمیں مفت میں اس کے نقاب میں اُبھرے ہوئے تاروں کو گننے کی عشرت حاصل ہوگئی۔ بس اتنی سی بات تھی۔ اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا۔

-☆-

۱۹۸۹ء

# مجھن

یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں نے روشن سبطین کو جانا۔ ساری شرارت روشن کے افسانوں کے مجموعے ''ساحل سمندر اور جزیرے'' کی ہے۔

روشن نے کتاب کی ایک جلد مجھے بھیجی۔ میں نے حسب دستور اسے ایک طرف رکھ دیا۔

آپ سے کہہ دوں تو کیا حرج ہے کہ میں نے مدت سے پڑھنا چھوڑ رکھا ہے۔ کہتے ہیں بڑھاپے میں انسان لالچی ہو جاتا ہے۔ سچ کہتے ہیں۔ جب بھی میں پڑھنے لگتا ہوں تو اندر سے آواز آتی ہے۔ اُونہوں، پڑھنے میں کیوں وقت ضائع کرتا ہے، مہلت کم ہے کچھ لکھ لے۔ شاید اب کی بار ''تیر'' بن جائے۔ تالی بجے۔

پتہ نہیں اس روز کیا حالات تھے۔ سردیوں کے دن تھے، رات کا وقت تھا۔ گھن گرج تھی۔ میں لحاف بند تھا۔ لکھنا ممکن نہ تھا۔ اتفاق سے روشن سبطین کی کتاب ہاتھ لگ گئی۔ پڑھنے سے پہلے میں کتاب چکھا کرتا ہوں۔ چکھی تو چونکا۔ ارے یہ کون بی بی ہے جو مونچھ پر ہاتھ رکھ کر لکھتی ہے۔ اتنا اعتماد، اتنا جذبہ، اتنی دھونس، ہم ہم ہم۔ یہ تو چھینٹے اڑاتی ہے۔

میں نے پیش لفظ دیکھا ''مجھے اعتراف ہے۔''

ارے۔ دھونس کے ساتھ ساتھ اعتراف بھی۔ لکھا تھا:

میں صدیوں کی لگی ہوئی گرہیں کھولنا چاہتی ہوں۔

گنجلک دھاگوں کی گتھیاں سلجھانا چاہتی ہوں۔

نمودِ صبح کا پیغام دینا چاہتی ہوں۔



راکھ کے ڈھیروں سے چنگاریاں تلاش کر کے ان سے کہانیاں بُننا چاہتی ہوں۔

مجھے اپنی، راکھ میں دبی ہوئی چنگاری ''آپا'' یاد آ گئی۔ اپنا پہلا مجموعہ ''ان کہی'' یاد آ گیا۔ جب میں نے مونچھ مروڑ کر کہا تھا۔ لوگو میں تمہارے دلوں میں چھپی ہوئی ''ان کہیاں''، ''ان جانیاں'' کہہ دوں گا۔

پھر مجھے اپنے نئے پبلشر کی بات یاد آئی۔ ابھی کچھ دنوں کی بات ہے جب میں نے نئے پبلشر کو کہانیوں کا آخری مجموعہ دیا تو وہ کہنے لگا۔ جناب کتاب کا یہ کیسا نام رکھا ہے آپ نے ''کہی نہ جائے''۔ میں نے کہا ہاں جناب اس مجموعے کا یہی نام ہے۔ آپ نے وہ مصرع نہیں سنا کیا:

دل کی بات جو گھٹتے گھٹتے منہ تک آئے۔ کہی نہ جائے

مجھ میں ظرف نہ تھا۔ کہاں سے چلا تھا۔ کہاں پہنچا۔ روشن سبطین میں بڑا ظرف ہے بڑی جان ہے۔ اس میں تو پہنچنے کی ہمت ہے۔ راہ چلنے کا حوصلہ ہے۔ لیکن جب پہلی بار میں نے روشن کو دیکھا تو حیران رہ گیا۔ چہرے پر نااُمیدی اور بے حسی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ مونچھ تھی ہی نہیں۔ وہ روشن نہیں۔ بجھن تھی۔ میرا ذہن ڈگ مگ ڈول گیا۔

پھر خیال آیا شاید ایسا ہو کہ جنہیں بجھا دیا جاتا ہے ان کا شعلہ اندر منتقل ہو جاتا ہے۔ جس شعلے پر ڈھیروں راکھ ڈال دی جائے وہ ہمیشہ کے لیے چنگاری بن کر سلگتا ہے۔ ظاہر ہے کہ روشن راکھ ہے اور اس کی تحریر چنگاری ہے۔ جبھی تو پیش لفظ میں وہ خود کہتی ہے راکھ کے ڈھیروں سے چنگاریاں نکال کر ان سے کہانیاں بُنوں گی۔

پھر خیال آیا۔ یہ کیا بات ہے کہ کراچی والوں نے روشن سبطین کی اس تخلیق کار کا کہیں ذکر ہی نہیں کیا۔

دراصل کراچی میں دو قسم کے ادیب ہیں۔ ایک وہ جو بڑے ہیں۔ بہت بڑے، اور چپ ہیں۔ دوسرے وہ جو سمجھتے ہیں کہ بڑے ہیں اور بولتے ہیں۔ سمجھنے اور بولنے والوں کی اکثریت ہے۔ وہ صرف اپنی بات کرتے ہیں۔ کراچی کی بدقسمتی ہے کہ وہاں ادبی حلقوں میں حوصلہ افزائی کا لفظ متروک ہو چکا ہے۔

روشن سبطین کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ اس میں صلاحیت ہے۔ جان ہے، جذبہ ہے، تڑپ ہے۔ یعنی وہ وہ کچھ ہے جو مرد میں ہو تو سبحان اللہ۔ عورت میں ہو تو نعوذ باللہ، پتہ نہیں ادا، قدسیہ، پروین شاکر، فنا، عاطف، یاسمین، سائرہ اور ایسی کچھ اور۔ کس طرح میدانِ ادب میں مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ حیرت ہے۔ کشور ناہید تو خیر اک کیا فلاجذ مرد ہے۔ نسائی جسم تو اک بہروپ ہے۔ وہ تو ٹو ان ون ہے۔ دونوں مزے، باہر سے عورت اندر سے مرد۔

روشن کی کہانی اک عام سی کہانی ہے جسے منشی پریم چند نے لکھنا شروع کیا تھا اور آج تک ہماری جان نہیں چھوڑ رہی۔ اس کہانی کے ڈھائی کردار ہیں۔ لاڈ پیار سے جی بھر کر بگاڑنے والے ماں باپ، ایک اکاؤنٹس زدہ مرد "ہم" قسم کی لڑکی۔ ہم یہ کریں گے ہم وہ کریں گے۔ ہم کیا نہ کریں گے۔ کیوں نہ کریں۔ اور ایک آسیب زدہ گھر جس پر "لوگ کیا کہیں گے" کا خوفناک تمبو تنا ہوا ہے۔

یہ کہانی دراصل کایا پلٹ قسم کی کہانی ہے۔

کایا پلٹ میں تو جب جوانی آتی ہے تو سنڈی تتلی بن جاتی ہے۔ اس کہانی میں جب جوانی آتی ہے تو تتلی کو سنڈی بنا دیا جاتا ہے اور اسے ساری عمر رینگ رینگ کر بسر کرنی پڑتی ہے۔

روشن کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ بچپن میں اسے اڑان کی شہ دی گئی۔ تتلی کی طرح وہ پھول پھول پر بیٹھی۔ تقریریں مقابلے کھیلیں مصوری، جب وہ جوان ہوئی تو دفعتاً ماں باپ کو یاد آیا کہ وہ تو لڑکی ہے۔ پھر انہوں نے بات بات پر روشن کو یاد دلانا شروع کر دیا کہ تُو تو لڑکی ہے۔ اس پر روشن چیخی چلائی کہ لڑکی ہوں تو پھر کیا ہوا۔

پھر وہی ہوا جو ہوتا آیا ہے۔ ہو رہا ہے۔ اس کے پر کاٹ دیئے گئے۔ حکم دیا کہ رینگ، رینگ رینگ کر زندگی کرنے کی خو کر لے۔ روشن آج تک رینگ رہی ہے لیکن رینگنے کی خو نہیں کر سکی۔ وہ آج تک نہیں سمجھ سکی کہ وہ لڑکی ہے۔ اور لڑکی ہونے کا مطلب کیا ہے۔ زندگی میں اڑان میسر نہ ہوئی تو اس نے ادب کو اپنا لیا۔ اب وہ اپنے قاری سے پوچھ رہی ہے کہ میں لڑکی ہوں تو پھر کیا ہوا۔ بولو۔ جواب دو۔ اور قاری سمجھ رہا ہے کہ وہ کہانی سنا رہی ہے۔ کتنی دلچسپ کہانی ہے۔

ٹھنڈی آنکھ سے دیکھنے اور مدھم لفظوں میں بات کہہ جانے والا جو خود اس خوف کے مارے کہ لوگ کیا کہیں گے اپنی جوانی کیا فلاج کیے بیٹھا ہے۔ وہ کرار حسین کتاب کے تعارف میں، روشن کے بارے میں لکھتا ہے:

"روشن سبطین جیسی نظر اور دل رکھنے والی ایک عورت ان گتھیوں کو پیش بھی کر رہی ہے اور ان کو سلجھانے کی کوشش بھی۔

--- یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ روشن سبطین کو کہانی کہنا آتا ہے۔

روشن سبطین میں آمد کا جوش اتنا ہے کہ وہ نہ صرف لفظوں میں بلکہ نقوش میں بھی چھلک پڑا ہے۔"

جب اتنا بڑا شخص زیرِ لبی میں بات کرنے پر مجبور ہے تو میری کیا حیثیت ہے کہ کچھ کہوں۔

پھر وہ شہزاد منظر ہے۔ معلومات کا بھرا ہوا تھیلا۔ بے لاگ حقیقت پسند۔ روشن کی کہانیوں کے بارے میں لکھتا ہے:

"یہ افسانے پڑھ کر آپ مایوس نہیں ہوں گے۔ ان افسانوں میں وہ ہر بات موجود ہے جو اچھے افسانے میں ہونی چاہیے۔"

اگر اتنا بڑا نقاد بھی روشن کی چیخ و پکار کو دلچسپ افسانہ قرار دے تو میں کیا بولوں۔ میں تو "بولوں کہ نہ بولوں" پوچھنے کی بھی حیثیت نہیں رکھتا۔

پھر وہ ہوا جو اس کہانی میں ہوتا آیا ہے۔

ماں باپ نے اس بوجھ سے سبکدوش ہونے کے لیے اپنا فرض پورا کر دیا۔ اور بن سوچے سمجھے بن جانے بوجھے ایک معمر اکاؤنٹنٹ سے اس کی شادی کر دی۔ یوں ایک فائن آرٹسٹ ایک دو اور دو چار سے وابستہ ہو گئی۔ وہاں جا کر پہلی مرتبہ روشن کو پتہ چلا کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ اور اسے زندگی بھر قدم قدم پر اس زریں اصول کو پلے باندھے رکھنا ہے۔

آپ سے کہہ دوں تو کیا حرج ہے کہ میں آج تک دو اور دو چار کا پابند نہیں ہو سکا۔ لینے ہوں تو دو اور دو پانچ گنتا ہوں۔ دینے ہوں تو تین۔ میں ہی کیا، زندگی میں کوئی بھی دو اور دو چار کا پابند نہیں ہو سکا۔ ہم سب جذباتی مخلوق ہیں۔ عقل کا تو صرف آنا جانا ہے۔

شادی کے بعد روشن کا رینگنا بالکل ہی رینگنا بن گیا۔ پھر بچہ ہوا تو ممتا کا ایک طوفان امڈ آیا۔ زندگی میں ایک نیا دروازہ کھل گیا۔ توجہ کو ایک نیا زاویہ مل گیا۔ اپنا رینگنا پس پشت پڑ گیا۔ اپنی محرومی سے دھیان بٹ گیا۔ لیکن یہ طوفان صرف روشن تک محدود رہا۔ گھر میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔ سوکھے کا سوکھا رہا۔ چونکہ پہلی اولاد لڑکی تھی۔

پھر باری باری چار بیٹے ہوئے جن میں پیدائشی طور پر توارثی خامیاں تھیں۔ پہلے کی سانس کی نالی چھوٹی تھی، دوسرے کا سینہ کھلا تھا، تیسرے کو ٹھنڈا پھوڑا تھا، یوں روشن کی راتوں کی نیند گئی۔ صبح کا چین گیا۔ برسوں ماں کے علاوہ بیمار بچوں کی نرس بننا پڑا۔

تعجب ہے کہ روشن ان مصائب سے بچ کیسے نکلی۔ حیرت ہے قدم قدم پر بجھن کے باوجود اس کی تحریر آج بھی روشن ہے۔ جسے پڑھ کر آپ چونکتے ہیں۔ ارے یہ کون بی بی ہے جو مونچھ پر ہاتھ رکھ کر لکھتی ہے۔ اتنا اعتماد، اتنا جذبہ، اتنی دھونس، ہم ہم کے چھینٹے اڑاتی ہے۔

صاحبو اللہ کے بھیدوں اور انسانی شخصیت کے گنجلکوں کو کون سمجھ سکا ہے۔

-☆-

سجاد حیدر

۱۹۸۲ء

# گھگھو گھوڑا

سجاد حیدر اپنے ایک ڈرامے گھگھو گھوڑے میں کہتا ہے کہ دنیا میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں ایک وہ جو گھگھو ہیں اور دوسرے وہ جو گھوڑے ہیں۔

اس حوالے سے سجاد کی شخصیت گمبھیر گھگھو کی ہے۔ میری اپنی شخصیت بھی اسی نوع کی ہے اس لیے طبعی طور پر مجھے سجاد کا قرب حاصل ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک تو میں گمبھیر نہیں خالی گھگھو ہوں اور دوسرے یہ کہ اگرچہ گھگھو ہوں لیکن خود کو گھگھو نہیں سمجھتا۔ اس خوش فہمی میں مونچھ مروڑے پھرتا ہوں کہ گھوڑا ہوں۔

میرے اندازے کے مطابق دنیا میں گھگھو بہت زیادہ ہیں اور گھوڑے کم کم۔ دقت یہ ہے کہ بیشتر گھگھو میری طرح خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ گھوڑے ہیں۔ اس لیے وہ دولتیاں جھاڑتے پھرتے ہیں۔ قلا بازیاں لگاتے ہیں۔ کھاتے ہیں۔ لوگوں کو یقین دلانے کے لیے کہ گھوڑے ہیں اپنی زندگی حرام کیے بیٹھے ہیں۔ ان کی مثال اس کوے کی ہے جو مور کے پر باندھ کر محوِ رقص ہے۔ سمجھتا ہے کہ دیکھنے والے اسے مور سمجھ رہے ہیں حالانکہ اس کی کالی وردی اور کائیں کائیں چھپائے نہیں چھپتی۔

سجاد کا امتیاز اس بات میں ہے کہ وہ جانتا ہے کہ وہ گھگھو ہے، مانتا ہے کہ وہ گھگھو ہے، گھوڑا بننے کی آرزو نہیں رکھتا بلکہ گھوڑوں پر خندہ زن ہے۔

حرکت بے شک قابل تحسین صلاحیت سہی، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حرکت بذاتِ خود اہم نہیں۔ اس کا رخ اہم ہے اور اسے شر سے محفوظ رکھنا بے حد مشکل

لاہور کے نور بابا سے ایک دن ہم نے پوچھا بابا شراب کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ بابا بولے پتر شراب ایک سواری ہے دیکھنا یہ ہے کہ سواری کا رُخ کدھر ہے۔

صاحبو اس سے یہ نہ سمجھ لیجیے گا کہ گمبھیر گھگھو ہونے کی وجہ سے سجاد دولتیاں نہیں جھاڑتا۔ اس کے برعکس اس نے ساری عمر دولتیاں جھاڑنے میں بسر کی ہے۔ وہ حرکت سے معرا نہیں۔ دراصل اس نے یہ چالاکی کر رکھی ہے کہ حرکت کا جنریٹر باہر سے اتار کر اندر لگا رکھا ہے۔ اس کی حرکت ٹڈیوں کی سی نہیں جو دل بنا کر اڑتی ہیں اور بادل کی طرح چھا جاتی ہیں بلکہ چیونٹیوں سی ہے۔ اوپر سے دیکھو تو مٹی کا ساکن تودا۔ نیچے حرکت ہی حرکت۔

سجاد سے پہلی مرتبہ میں ۱۹۴۵ء میں ملا۔

گورا چٹا جاذب نظر چہرہ۔ خوبصورت خدوخال۔ چھریرا بدن۔ لجائی ہوئی رسیلی آنکھ۔ لبھانے والی مسکراہٹ اور سہہ جانے والی خاموشی۔ بس صرف ایک پھولدار دوپٹے کی کسر تھی۔

اسے دیکھ کر میں نے محسوس کیا جیسے بچھڑا ساتھی مل گیا ہو۔ ذہنی لحاظ سے ناک نقشہ بالکل مجھ سا تھا۔ جسمانی لحاظ سے پھول کانٹے کا فرق تھا۔

طبعی طور پر وہ ایک کامی تھا۔ کام پر جی لگتا تھا۔ دوڑ بھاگ میں خوش رہتا تھا۔ چستی سے بھرا ہوا تھا اگرچہ دکھتا نہ تھا جیسے زیتون تیل سے بھرا ہوتا ہے۔ مگر دکھتا نہیں۔ وہ پوز تھا ریپوز نہ تھا۔ اوپر سے پھیلی ہوئی ریت نیچے کوئک سینڈ۔

ان دنوں ہم دونوں آل انڈیا ریڈیو لاہور میں ملازم تھے۔ مدرسے میں بارہ سال پڑھانے کے بعد میں ریڈیو میں آ گیا تھا۔ یہ قیامت لاہور کے ڈائریکٹر مسٹر چپ نے ڈھائی تھی۔

ایک روز اتفاق سے میں چپ کے کمرے میں جا پہنچا مجھے دیکھ کر وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا بولا میں آپ کا مداح ہوں بس اس کی اتنی سی بات مجھے برباد کر گئی۔ نشے میں آ کر میں نے محکمہ تعلیم کی بارہ سالہ ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور ریڈیو لاہور میں سٹاف آرٹسٹ ہو گیا۔



میرا خیال تھا کہ ریڈیو کے بھی لوگ میرے مداح ہوں گے اور مجھے دیکھ کر سیٹوں سے اٹھ کھڑے ہوں گے۔

وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ میں دیوتاؤں کی نگری میں آ گیا ہوں۔ سبھی قابل تھے پڑھے لکھے تھے۔ تخلیق کار تھے۔ دانشور تھے جو نہیں تھے وہ بھی سمجھتے تھے کہ ہیں۔ پرکھنا مشکل تھا کہ کون ہے کون سمجھتا ہے کہ ہے۔

دیوتاؤں کی بستی میں جا کر میں اور بھی کبڑا ہو گیا۔ پیدائشی بالشتیا تھا۔ بالکل ہی پچک کر رہ گیا۔ ہم کار گنتی شمار میں نہ لاتے تھے۔

وہاں سجاد میرے لیے یوں بن گیا جیسے طوفان زدہ کشتی کے لیے کنارہ ہو۔ دو گھگھو مل گئے۔

معافی چاہتا ہوں آپ کہیں گے اپنی بات زیادہ کرتا ہے۔ صاحب کردار کی کم کم۔ جناب والا اگر آپ کو دیکھنے والی آنکھ کا علم نہ ہو۔ کیمرے کے لینز کا پتہ نہ ہو تو تصویر کا پتہ کیسے چلے گا۔ ویسے یہ بھی سچ ہے کہ خود کو اچھالنے میں بڑی لذت ہے۔

دیر تک میں سجاد کو ریڈیو کا ایک کامی سمجھتا رہا۔ اپنے سے بڑا کامی۔ میں خالی لکھتا تھا۔ وہ لکھتا بھی تھا بولتا بھی تھا اور دوڑتا بھاگتا بھی تھا۔ مجھے علم نہ تھا کہ سجاد ریڈیو کا ملازم نہیں بلکہ پنجاب گورنمنٹ کا ایک افسر ہے جسے پنجاب پبلک سروس کمیشن نے سلیکٹ کیا ہے۔ اس زمانے میں ریڈیو کا دیہاتی پروگرام چلانا پنجاب گورنمنٹ کی ذمہ داری تھی۔

اس صورت میں اس کی ڈیوٹی یہ تھی کہ پروگرام پلان کرے اسے آرگنائز کرے اور سپروائز کرے۔ یعنی مجھے علم نہ تھا کہ عہدے کا وہ گھڑسوار ہے میں اسے اپنے جیسا پیدل ہی سمجھتا رہا۔ اگر مجھے شک پڑ جاتا کہ وہ کرسیہ ہے زمینیہ نہیں تو ہمارے درمیان قرب پیدا نہ ہوتا۔

بہر طور سجاد وہاں افسر تھا اور میں سٹاف آرٹسٹ۔ ریڈیو کے کامی کو سرکاری زبان میں سٹاف آرٹسٹ کہتے ہیں۔ خالی کہتے تھے سمجھتے نہیں تھے۔ نہ اسے سٹاف میں سے سمجھا جاتا تھا۔ نہ آرٹسٹوں میں۔ یہ بڑے بخاری صاحب کی ذہانت کا اعجاز تھا کہ انھوں نے فنکاروں

کو ایک خوبصورت نام پر ٹرخا دیا تھا۔

میری دانست میں زندگی میں تین قسم کی بدقسمتیاں ہوتی ہیں۔ ایک تو نگی بدقسمتی دوسری وہ جو ہوتی تو بدقسمتی ہے لیکن آپ کو احساس نہیں ہوتا کہ بدقسمتی ہے۔ تیسری وہ جو ہوتی تو بدقسمتی ہے لیکن آپ سمجھتے ہیں کہ خوش قسمتی ہے۔

ریڈیو کی ملازمت تیسری قسم کی بدقسمتی تھی۔ بہرحال سجاد کی شخصیت کے متعلق ایک بات یقینی ہے کہ وہ کرسی نہیں زمینیہ ہے۔ وہ کرسی پر بیٹھنے کی لذت سے ازلی طور پر محروم ہے۔ کرسی پر بیٹھے ہوئے بھی سمجھتا ہے کہ زمین پر بیٹھا ہوں۔ کفرانِ نعمت کی اس سے بہتر مثال کیا ہوگی۔

وزیرآباد اور گجرات کے درمیان جہلم کے گجراتی کنارے پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے "دھُہلا" چوبیس دسمبر ۱۹۱۹ء کو سجاد اس گاؤں میں پیدا ہوا۔

والد چودھری نور حسین تھے۔ اچھی خاصی زمینداری تھی۔ لیکن نور حسین طبعاً کفرانِ نعمت پر مائل تھا۔ زمیندارے پر بیٹھ کر چودھری بازی کرنے کی بجائے علی گڑھ کالج میں درس حاصل کرنے جا پہنچا۔ پھر علی گڑھ نے اپنا رنگ چڑھا دیا۔ زمینداری سے منکر ہو گیا۔ نام سے چودھری کا سرنامہ حذف کر دیا۔ برا بھی چھوڑ کر آذری اختیار کر لی۔ نام پر آذری کی کلی ٹانک کر نور حسین آذری بن گیا۔ اس شدومد سے بنا کہ سارا خاندان ہی آذری بن گیا۔ یعنی آذری ان کا خاندانی نام ہو گیا۔

والد نے علی گڑھ سے انگلش ایم۔ اے کیا۔ پھر وہیں لیکچرار ہو گئے۔ تین سال کے بعد فرنٹیئر پروونشل ایجوکیشنل سروس میں شامل ہو گئے اور ساری زندگی صوبہ سرحد کی مختلف درسگاہوں میں گزار دی۔

صاحبو غور طلب بات یہ ہے کہ گجرات کی سرزمین ہو جہلم کا کنارہ ہو۔ سر پر کشمیر کی سرسبز پہاڑیاں کلاہ باندھے کھڑی ہوں۔ دریا کے ساحل پر ایک گورا چٹا خوبرو بچہ پل کر جوان ہو۔۔۔ لیکن اس کی زندگی میں کوئی سوہنی نہ ہو۔ کردار میں مہینوال نہ ہو۔ طبیعت میں کوئی کچا گھڑا نہ ہو۔ ذہن میں دریا میں تاری لگانے کی آرزو نہ ہو۔



یقین نہیں آتا تو سجاد کو دیکھ لو۔ نہ گجرات کی مٹی اس کا کچھ بگاڑ سکی۔ نہ جہلم کی لہریں ہلچل پیدا کر سکیں۔ نہ سوہنی کا چتن اس پر اثر انداز ہو سکا۔

جہلم کا دریا آج تک شرم سے پانی پانی ہے کہ وہ سنگ مرمر کے اس دیوتا کو کشتی کا پایا نہ بنا سکا۔

ممکن ہے سجاد کے پاس اس کا جواب ہو۔ دقت یہ ہے کہ کچھ باتیں کہی نہیں جا سکتیں۔ کچھ باتیں پوچھی نہیں جا سکتیں۔ کچھ باتیں لکھی نہیں جا سکتیں۔

بہرحال اندازے تو لگائے جا سکتے ہیں۔

وہ کون سے عوامل تھے جنہوں نے سجاد کو ابوالہول بنا دیا۔

بچپن میں سجاد نے کبھی شرارت نہیں کی۔ کوئی ہڑبونگ نہیں مچایا۔

ساتھی نہیں بنائے۔ مل کر کھیل نہیں کھیلے۔ نہ کبھی خود تماشہ بنا نہ تماش بین۔

کسی سے آنکھ نہیں لڑائی۔

لیٹرین میں چھپ کر تو لیٹر نہیں لکھے۔ کھیتوں کے ہمدرد اندھیرے میں کسی کا راستہ نہیں روکا۔

مختصر یہ کہ جہلم کے چتن پر رہتے ہوئے وہ ننگ آ جا چتن جہلم سے محروم رہا۔

ظاہر ہے کہ اس محرومیت کی وجہ گھر تھا۔

گھر نے جہلم کے اثرات رد کر دیا۔

گھر میں والد صاحب براجمان تھے۔

لیکن والد صاحب تو ہر گھر میں براجمان ہوتے ہیں۔

دقت یہ تھی کہ سجاد کے والد۔ والد ہونے کے علاوہ استاد بھی تھے۔

دوستو اللہ نہ کرے کسی کے والد استاد ہوں۔ میرے اپنے والد بھی استاد تھے۔ ہر پروفیشن فرد کی زندگی پر خصوصی اثر رکھتا ہے۔ اکاؤنٹنٹس چیزے ہو جاتے ہیں۔ بیوی سے بھی حسابی ہو جاتی ہے۔ آڈیٹر کی انگلی غلطی پر رکتی ہے۔ وہ کھوجی بن جاتے ہیں۔

حرکت سے متعلقہ پروفیشنز مثلاً گارڈ ڈرائیور پائلٹ تانگابان میں سو واٹ تو بل

ووات قسم کی بے نیازی ابھرتی ہے۔ اخلاقی یا مذہبی بندھن ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ ڈاکٹروں میں صحت کا خبط بیماری بن کر ابھرتا ہے۔ توجہ مریض کی نسبت مرض پر مذکور ہو جاتی ہے۔ چاروں طرف جراثیم ہی جراثیم نظر آنے لگتے ہیں۔

استادی کا پیشہ زیادہ مہلک اثرات کا حامل ہوتا ہے۔ انگریزی ادب ٹیچر کا کمپلیکس کے مظاہر کی وضاحت سے بھرا ہوا ہے میں تمہیں پڑھا کر چھوڑوں گا۔

آئی ول لرن یو کہتے ہیں آخری ایام میں جب شاہ جہاں قید میں تھے تو انھوں نے بیٹے سے درخواست کی تھی کہ انہیں بچے پڑھانے کی اجازت بخشی جائے۔ بیٹے نے جواب دیا۔ اباجان کی ابھی تک طبیعت سے حکومت کی بو نہیں گئی۔

سجاد کے والد کی دو خصوصیات تھیں۔

ایک تو وہ بہت پڑھے لکھے تھے۔ جو زیادہ پڑھ لکھ جائے پنجابی میں اُسے گڑھیا کہتے ہیں۔ جو پڑھ پڑھ کر گڑھ جائے وہ اپنی انا کے قلعے میں محصور ہو جاتا ہے پھر گرد و پیش بیوی بچے نگاہ سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔

دوسری خصوصیت اس استاد کی یہ تھی کہ صرف ایک نقطۂ نظر سے واقف تھا۔ اپنا نقطۂ نظر۔

استاد نے باپ کو پسِ پشت ڈال دیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ سارا گھر سہما سہما رہا۔

بچوں میں اتنی جرأت پیدا نہ ہوئی کہ ماں کی محبت بھری گود میں پناہ لیں یا استاد کے خلاف اظہار احتجاج کے لیے باپ کو آواز دیں۔

اس استاد باپ کی سخت گیری کی ایک مثال سن لیجیے۔ ایک دفعہ ان کی ڈائری گم ہو گئی۔ بہت ڈھونڈی نہ ملی۔ بچوں کو کئی مرتبہ فال ان کرایا گیا۔ تلاش کر کے ڈائری پیدا کرو کا حکم چلایا گیا۔ لیکن ڈائری نہ ملی۔

اس پر بچوں کو جو سزا دی گئی وہ سرزنش کم تھی، انتقامی زیادہ۔ یعنی بچوں کے کورسز کی تمام کتابیں جلا دی گئیں۔ نہ پڑھیں گے نہ پڑھنے دیں گے۔



سخت گیر ہونے کے علاوہ سجاد کے والد رنگین مزاج تھے۔ فادر ہوسٹیلیٹی کے جذبے کی وجہ سے سجاد کے دل میں رنگین مزاجی کے خلاف ردِعمل پیدا ہوا۔ اس نے انتقاماً اخلاقی روک ٹوک پال لیے اور ساری زندگی ان کے رکھ رکھاؤ میں بسر کر دی۔

پھر بچپن میں ماحول ایسا ملا جس نے ان اخلاقی روک ٹوک کی دھار کو اور تیز کر دیا۔

والد صاحب چونکہ صوبہ سرحد میں ایجوکیشنل آفیسر تھے۔ لہٰذا سجاد کا بچپن اور نوجوانی مردان، بنوں، پشاور اور کوہاٹ جیسے سرحدی شہروں میں بسر ہوئے۔

ان دنوں صوبہ سرحد کے شہروں میں ہم جنسی فیشن میں تھی۔ خوش شکل ہونا سجاد کے لیے ایک مصیبت بن گیا۔ چاروں طرف سے سجاد پر نگاہیں اٹھیں۔ لوگ اسے یوں دیکھتے جیسے گلاب جامن ہو۔ ان نگاہوں سے خوفزدہ ہو کر سجاد نے خود پر سنجیدگی کی دبیز چادر اوڑھ لی۔ یوں رنگینی، بے تکلفی اور روانی اس پر حرام ہو گئی۔

سجاد نے بنوں سے میٹریکولیشن کیا۔ اسلامیہ کالج پشاور سے ایف اے، ویڈک بھرتری کالج ڈیرہ اسماعیل خاں سے بی۔ اے پھر کہیں اسے گورنمنٹ کالج لاہور میں جانے کا موقع ملا۔ جہاں اس نے فارسی میں ایم۔ اے کیا۔

سجاد کے کردار میں تین بنیادی خصوصیات ہیں۔ جھجک، اکیلا پن اور سنجیدگی کا تنا ہوا تنبو۔ وہ اس حد تک اکیلا ہے کہ دو کیلا ہونے کی صورت پیدا ہونے لگے تو سخت گھبرا جاتا ہے۔

جو اکیلا ہو اس میں محجوبیت کی جھلک پیدا ہو جاتی ہے۔ طبیعت کی اس محجوبیت نے اسے عشق و محبت سے محروم کر دیا۔

نہ وہ پتن جھناں کو پار کر کے کسی سوہنی سے ملنے کی آرزو رکھتا ہے نہ ہی اسے گوارا ہے کہ کوئی سوہنی پتن جھناں پار کر کے اسے آ لے۔

اس کا یہ مطلب نہیں اسے عورت سے بیر ہے۔

نہیں ایسی بات نہیں اسے عورت پسند ہے۔ بشرطیکہ وہ دور کھڑی ہو کر بات کرے اور بات میں لگاؤ کا اظہار نہ ہو۔ لگاؤ کا اظہار اسی صورت میں گوارا ہے جب لگاؤ ننگا نہ ہو۔ بلکہ

علامتوں کے پردوں میں ملفوف ہو اور اس میں تسلسل نہ ہو۔ کبھی کبھار ہو، برسبیل تذکرہ ہو۔ اگر اظہار کو اک تارا سمجھ کر بھکاری کی طرح بجایا جائے تو سجاد غصے سے بھوت بن جاتا ہے۔

سجاد صرف اکیلا ہی نہیں ازلی طور پر اداس بھی ہے۔ غم کی شدت نہیں۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑتی رہتی ہے۔

اسے ہنگامہ پسند نہیں۔ چاہے وہ ہنگامہ خوشی کا ہی کیوں نہ ہو۔ نہ ہی ہنگامہ پسند لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا گوارا ہے۔ ان حالات میں لو میرج کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ لہٰذا جب وہ تعلیم سے فارغ ہوا تو والدین نے ماموں کی بیٹی سے اس کا بیاہ کر دیا۔

شادی نے سجاد کی زندگی میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کی۔

ان دنوں شادی آج کی طرح سینہ زوری کا نہیں بلکہ خفیہ اور چوری چوری کا تعلق ہوتا تھا۔

سارا دن ماں باپ کے سامنے دولہا دلہن ایک دوسرے سے آنکھ نہیں ملاتے تھے۔ قریب نہیں آتے تھے۔ بات نہیں کرتے تھے۔ یوں ایک دوسرے سے دور رہتے جیسے جان پہچان نہ ہو۔ بہت ضروری بات ہوتی، تو دور کھڑے ہو کر، نظر بچا کر اشارہ کرتے۔ مثلاً دور سے جراب دکھائی اور پھر وہیں گرا دی۔ مطلب یہ ہے کہ اسے دھو دینا۔ ادھر دلہن نے نہ دیکھنے کے انداز سے دیکھا اثبات میں گردن نہیں ہلائی۔ کوئی دیکھ نہ لے۔ صرف آنکھ کی پتلی گھما دی۔ دھو دوں گی۔ یا ساس کو مخاطب کر کے میاں کو مطلع کیا۔ اچھا۔ امی جان۔ گل سن وچھوڑیئے کن کر نیوڑھیئے کی مصداق۔

پہاڑ سے لمبے دن کے بعد رات پڑتی تو دونوں اجنبی میاں بیوی ایک کمرے میں بند ہو جاتے۔ پھر بھی بات کرنا مشکل ہوتا۔ دلہن کو اس کی سہیلیاں سکھا پڑھا کر ڈولی میں بٹھاتی تھیں۔ خود نہ بلانا، پہلی آواز پر جواب نہ دینا۔ کبھی ہاں نہ کہنا، اشتیاق کا اظہار نہ کرنا، آرزو کو دبائے رکھنا۔ عام طور سے دولہا بڑی محنت سے دلہن کو بولنا سکھایا کرتا تھا۔

سجاد تو خود گونگا تھا وہ دلہن کو بولنا کیا سکھاتا۔

اسے تو یہ غصہ تھا کہ یہ کیا شے ہے جو میرے اکیلے پن کو داغ دار کر رہی ہے۔ گمان



غالب ہے دونوں کے درمیان صرف ایک ہی کمیونی کیشن تھی، وہ جو گفتگو سے بے نیاز ہوتی ہے۔

قدرت سجاد پر مائل بہ کرم تھی۔ ایسی بیوی ملی جو اتنی ہی منفرد تھی جتنا خود سجاد تھا۔ اتنی ہی سیلف سفیشنٹ تھی جتنا سجاد تھا۔ اتنی ہی بے نیاز تھی، جتنا سجاد تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گھر میں ایک طرف میاں نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنالی۔ دوسری طرف بیگم نے۔ درمیان میں کالے کوسوں کا دریا بہتا رہا۔

پتہ نہیں سجاد کے بچے کس پتن پر پل کر جوان ہوئے۔ اس پار یا اس پار۔ پتہ نہیں انھوں نے کالے پانیوں کو پاٹنے کے لیے ناؤ بنائی یا نہیں۔

بہر طور ایک بات یقینی ہے۔ میاں بیوی دونوں ہی مظلوم تھے۔ علیحدگی پسند تھے۔ ذاتی آزادی کو لگاؤ کی بھینٹ چڑھانے کے لیے تیار نہ تھے۔ ہر ایک کی میں اسے یوں گود میں لیے بیٹھی تھی جیسے Embryo کو بچہ دانی گود میں لیے رہتی ہے۔

یہ تعلق صرف اس لیے نبھ گیا کہ دونوں میں قوت برداشت تھی۔ دونوں جیو جینے دو کے قائل تھے۔ بیوی کے متعلق تو مجھے علم نہیں۔ ہاں سجاد میں اتنی رواداری ہے کہ دیکھ کر وحشت ہوتی ہے۔

پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے لیکن ایسا ہوتا ہے۔ فرد اکیلا ہو، اداس ہو، سیلف سفیشنٹ ہو تو ادب اور فن کے جراثیم کی افزائش شروع ہو جاتی ہے۔

یہ جو آج کل آپ ہنسوڑ ادیب دیکھ رہے ہیں جو بڑے صحت مند نظر آتے ہیں دراصل یہ ادیب نہیں جرنلسٹ ہیں جنھوں نے ادب کی قبا لپیٹ رکھی ہے۔ سجاد کو ادب کی بیماری بچپن سے ہی لگ گئی تھی۔ پھر نوجوانی میں تخلیق کے شوق نے کروٹ لی۔

۱۹۴۳ء میں رابندر ناتھ ٹیگور کی کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا۔ عنوان تھا ''رنگ ترنگ''۔ پھر اسے چھپوانے کا خبط سمایا۔ پبلشر کو مسودہ بھیجا۔ اسی سال راوی میں سیلاب آ گیا۔ رنگ ترنگ دریا برد ہو گیا۔

تخلیق کے حوالے سے ریڈیو کی ملازمت نے سجاد پر دو ظلم کیے۔ ایک تو اسے ریڈیائی

ڈرامہ کا زاویہ بخش دیا اور دوسرے پنجابی زبان پلّے باندھ دی۔

سجاد ابتدا میں ریڈیو پر پنجابی پروگرام کا انچارج تھا۔ اکثر و بیشتر اسے خود پروگرام لکھنا پڑتا تھا۔ اس لیے اس کی توجہ پنجابی ڈرامہ کی طرف مبذول ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اردو ادب ایک اچھے قلم کار کی تخلیقات سے محروم رہ گیا۔ ۱۹۵۴ء میں اس کی پہلی کتاب منظر عام پر آئی۔ یہ پنجابی ڈراموں کا مجموعہ تھا۔ عنوان تھا ''ہوادے ہوکے'' یہ ڈرامے دیہی زندگی کے مناظر پیش کرتے ہیں۔ انداز رومانٹک ہے۔ ۱۹۶۴ء میں پنجابی ڈراموں کا دوسرا مجموعہ شائع ہوا جن میں شہری مسائل کا تذکرہ تھا۔

سجاد کے پنجابی ڈراموں کا تیسرا مجموعہ ''بول مٹی دیا باویا'' علامتی کھیلوں پر مشتمل ہے جس میں گھگھو گھوڑے کا کھیل شامل ہے۔

سجاد نے زندگی میں صرف ایک عشق کیا ہے۔

اس عشق کی تفصیلات خاصی دلچسپ ہیں۔

اس نے چپ چاپ کسی کو بتائے بغیر اپنے من مندر میں ایک مورتی سجائی۔ اور سالہا سال اس کے پھیرے لیتا رہا۔ عین ممکن ہے کہ ابتدائی دور میں اس نے یہ راز خود سے بھی چھپائے رکھا ہو۔

سالہا سال گزر گئے۔ مورتی سجی رہی۔ آرتی جاری رہی لیکن دیوی پر بھید نہ کھلا اظہار کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ یہ دیوی جسے سجاد نے اپنایا تھا کوئی معمولی مورتی نہ تھی۔ وہ تو دنیائے ادب پر چھائی ہوئی گرجتی برستی بدلی تھی۔ بڑے بڑے ادیب فن کار اس کے آگے سیس نوائے بیٹھے تھے۔ وہ ظالم تو دنیائے ادب کے علاوہ بھی جگت محبوبہ تھی۔ اس دیوی میں نور کم تھا نار زیادہ تھی، وہ صحیح معنوں میں ناری تھی۔ اوپر سے ادیبہ بھی اور ادیبہ بھی پھلجھڑی ایسی جو شوخ رنگوں میں جلتی ہے اور آگ کو پھول بنانے کی شکتی رکھتی ہے۔

اس دیوی کا نام امرتا پریتم تھا۔

سجاد میں آگ پکڑنے والا مصالحہ لگا ہی نہ تھا۔ وہ صرف سلگنا جانتا تھا۔ امرتا صرف بھانبھڑ کو مانتی تھی۔ کسی کو سلگانا اس کے شایان شان نہ تھا۔



لہٰذا یہ عشق یک طرفہ رہا۔ ان جانا رہا۔ انکھیل رہا۔ اگرچہ اظہار نہ تھا۔ لیکن خط و کتابت جاری تھی۔

۱۹۴۷ء میں امرتا نے ہمکاری کے نام سے گورمکھی کا ایک جریدہ جاری کیا۔ جس کے ایڈیٹوریل بورڈ پر سجاد کا نام شامل تھا۔ یہ تعلق کیا کم تھا۔ سجاد اسی پر نہال تھا۔

خط و کتابت دیر تک جاری رہی۔ آج بھی جاری ہے۔ سجاد باقاعدہ خط لکھتا رہا۔ یہ خطوط اس قدر ٹھنڈے میٹھے تھے جیسے آئس کریم کی مشین سے نکالے گئے ہوں۔ ادھر امرتا بارود تھی۔ زندگی کو دھماکہ سمجھتی رہی بلکہ خود دھماکہ تھی۔ فتنے کی منتظر۔ اسے خبر بھی نہ ہوئی کہ یہ ٹھنڈے میٹھے خط لکھنے والا مورتی سجائے بیٹھا ہے۔

۱۹۵۱ء میں پہلی بار سجاد کے دل میں اظہار کی تڑپ پیدا ہوئی اور وہ پریم یاترا کے لیے دلی جا پہنچا۔ دبے دبے الفاظ میں حال سنایا۔

امرتا ہکی بکی رہ گئی۔

اس معصوم بے زبان پیار کرنے والے کو دیکھ کر۔ غالباً اس کی ممتا جاگ اٹھی۔

پھر دونوں نے کمیونیکیشن کا ایک انوکھا طریقہ نکالا۔

ادھر سے سجاد اپنا پنجابی ڈرامہ نشر کرتا۔ ادھر سے امرتا جواب دیتی۔ پنجاب کے سیانے کہتے ہیں دیگاں دیال گھروڑیاں دی نہیں مان۔

آپ سے کیا پردہ امرتا کے عشق میں مَیں بھی جلا ہوں۔ مشکل یہ تھی کہ اس کی چھب سہاری نہیں جاتی تھی۔ اس میں جان تھی۔ اڑان تھی۔

کالی وردی کائیں کے بس کی بات نہ تھی۔ سو دل پر پتھر رکھ کر بیٹھ رہا۔

سجاد بڑا پڑھاکو ہے، جو اکیلا ہو، اداس ہو وہ کتاب میں پناہ نہ لے تو کیا کرے۔ وہ فکشن کا دلدادہ ہے۔

فکشن میں اسے ایسے کردار پسند ہیں جو خود سے نفرت کرتے ہیں۔ مثلاً داستووسکی کا ایڈیٹ اسے ٹالسٹائے اور داستووسکی بہت پسند ہیں۔

شعر و سخن میں وہ رابندر ناتھ ٹیگور سے چلا اور بابا فرید کے اشلوک شاہ حسین اور غلام

فریدکی کافیوں تک پہنچا۔ ماڈرن پوئٹس میں اسے ذوا گو، راہی، امرتا، شریف کنجاہی اور منیر نیازی پسند ہیں۔

اگرچہ سجاد کا مذہب میں لگاؤ نہیں۔ نہ ہی وہ پیر فقیر کا قائل ہے۔ لیکن اس کے کردار میں صوفیانہ جھلک ہے۔ وہ زیادہ آرام دہ زندگی پسند نہیں کرتا۔ سادہ زندگی گزارنے کا متوالا ہے۔ ضروریات کو بڑھانے کا قائل نہیں۔

سجاد کے بہت کم دوست ہیں۔ اول تو بنا تا ہی نہیں۔ بن جائے تو نبھاتا ہے۔ مثلاً آج بھی اس کے بہترین دوست وہ ہیں جو مردان میں اس کے ہم جماعت تھے۔

زندگی کے آخری دور میں سجاد نے شدت سے محسوس کیا ہے کہ اس نے تصنیف میں اردو کو اہمیت نہیں دی اس لیے ۱۹۷۸ء میں اس نے اردو میں اپنا پہلا افسانہ لکھا۔

اب جب کہ وہ ریڈیو پاکستان سے ریٹائر ہو رہا ہے اس نے عزم کر رکھا ہے کہ بقیہ زندگی تصنیف و تالیف میں گزارے گا اور اردو ادب کی خدمت کرے گا۔

-☆-





۱۹۸۰ء

# پیاز کا چھلکا

فکر تونسوی برصغیر کے جانے پہچانے شاعر، نثر نویس، طنز نگار اور کالمسٹ ہیں۔ فکر تونسوی کی کتاب ''فکر نامہ'' کے تعارف میں کرشن چندر لکھتے ہیں۔

''فکر کے مزاح اور طنز کی کئی پرتیں ہیں۔ اسی لیے ان کے مزاحیہ کالم کا نام ''پیاز کے چھلکے'' ہے۔ وہ ادب کے صدف میں ایک آنسو کو منجمد کر کے اسے دُرِ آبدار بنا دیتے ہیں۔''

خلیق انجم فکر نامہ کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں: ''فکر میں ایک تازگی ہے۔ جدّت ہے، بوڑھے ہو گئے پر باسی نہیں ہوئے، ہر دم جوان۔''

جہاں تک فکر کی شخصیت کا سوال ہے۔ تازگی نام کو نہیں۔ گوشت کے ایک باسی ٹکڑے میں جان پڑ گئی ہے۔ سوکھا ہوا چہرہ، سہمی سہمی آنکھیں، ذرا دوڑائیں تو ''کچھ بھی نہیں'' سا انداز اور بشرے میں ڈھول ہی ڈھول۔ عمومیت کی ڈھول۔ بیسیوں بار آپ کے سامنے سے گزر جائے اور آپ کو خبر ہی نہ لگے۔ لے دے کر اس کے پاس ایک مسکراہٹ ہے۔ اس میں بھی طنز کی دھار نہیں صرف بے بسی اور کسمپرسی۔

تقسیم سے پہلے برصغیر کے ادبی حلقوں نے اس کی نظموں کے پہلے مجموعے ''ہیولے'' کی اشاعت پر اسے خراجِ عقیدت پیش کیا۔ ان دنوں فکر تونسوی ''ادب لطیف'' کا مدیر تھا اور ادب لطیف پنجابی کا امتیازی ادبی جریدہ سمجھا جاتا تھا جیسے آج کل ''نقوش'' ہے۔ فکر کی نثر نگاری پر بڑی واہ واہ ہوئی، پھر تقسیم کے بعد سارے ہند نے اس کی طنز نگاری کا لوہا مانا۔ ہندوپاک کے ادبی حلقے فکر کی صلاحیتوں کو مان گئے لیکن فکر کو ابھی تک یقین نہیں آیا کہ وہ

اونچے پایہ کا قلم کار ہے۔ اس کی گردن ابھی تک جھکی ہے۔ آنکھ چمک سے خالی ہے بد میں اندر دھنسا ہوا ہے۔ اور اس کی مونچھ لیکن ٹھہریے مونچھ تو اس کی ہے ہی نہیں۔ کبھی تھی ہی نہیں اگر ہوتی تو لٹکی لٹکی رہتی۔

فکر کے نام کے متعلق کرشن چندر کہتے ہیں۔

"میں انہیں شاعر کی حیثیت سے جانتا تھا۔ مجھے ان کے شاعر ہونے پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ صرف ان کے نام کے آگے تونسوی پر اعتراض تھا۔ مگر جب شاعروں کے نام کے ساتھ جار چوی اور جھنجھانوی جیسے القاب دیکھے تو اپنا اعتراض واپس لے لیا۔"

مجھے فکر کے تونسوی ہونے پر قطعی اعتراض نہیں چونکہ وہ ازلی طور پر تونسوی ہے۔ اگر وہ الہ آباد لکھنؤ میں پیدا ہوتا پھر بھی تونسوی ہی ہوتا۔ فقر اس کی گھٹی میں پڑا ہے۔ فقر اور ویرانگی تونسہ شریف کی ہی دو خصوصیات ہیں نا۔

البتہ مجھے اس کے نام میں فکر پر اعتراض ہے چونکہ اس کی شخصیت میں فکر کا عنصر مفقود ہے۔ وہ سوچتا نہیں صرف محسوس کرتا ہے۔ یہی اس کا المیہ ہے۔ فکر ہوتا تو مفکر ہوتا۔ بال کی کھال کھینچتا۔ کتاب و شنید کا رسیا ہوتا۔ میں نہ مانوں ہوتا، سیاسی نہ ہوتا، عالم ہوتا، اخبار نویس ہوتا، بہرحال ادیب نہ ہوتا۔ پتہ نہیں روزنامہ "ملاپ" دلی کس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ اسے اخبار میں جگہ دیے بیٹھا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے ان جانے میں روزنامہ جنگ کراچی زندگی بھر ابن انشا کو جی آیاں نوں کرتا رہا۔

جذبات نے فکر کو ادیب بنا دیا اور جذبات بھی ایسے جن میں بات کا نہیں بلکہ جذب کا عنصر حاوی ہے۔ میری دانست میں فکر دراصل جذب تونسوی ہے۔ اگر وہ فکر بنا پھرتا ہے تو بے شک بنا پھرے۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ آخر نام کے حوالے سے ہمارے ہاں بھی بہت سے نور دین اور رحمت اللہ بنے پھرتے ہیں۔ فکر کا اصلی نام نارائن تھا حیرت کی بات ہے کہ والدہ نے اس کا نام نارائن کیسے رکھا یہ تو ممکن نہیں کہ دھنپت رائے کو نارائن کی عظمت کا احساس نہ ہوتا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اپنے چوتھے بچے کی پیدائش کی خبر سن کر گھبراہٹ میں



اس کے منہ سے نکل گیا ہو "ہے نارائن" یہ کیا مصیبت ہے۔ اور بچے کا نام نارائن پڑ گیا ہو۔ ویسے فکر کی جبلت پیش نظر رکھتے تو اس کا نام داس رکھتے۔ چونکہ فکر پیدائشی طور پر داس ہے۔ خود بھی اسے احساس ہے کہ وہ داس ہے۔ مشکل یہ ہے کہ اس نے آج تک سچے دل سے تسلیم نہیں کیا کہ وہ ازلی داس ہے ورنہ اس کے دل میں اپنے داس ہونے پر دباؤ یا غصہ نہ ہوتا لیکن دباؤ یا غصہ نہ ہوتا تو طنز کے تیر کیسے چلتے۔

پیاز کے چھلکوں میں تلخی کہاں سے آتی۔ قاری آبدیدہ کیسے ہوتا۔۔۔۔ ہے نارائن تو ہی چھپے بھیدوں کو جاننے والا ہے۔ فکر اور میں پرانے دوست ہیں۔ بہت پرانے چار ایک برس ہمیں اکٹھے رہنے کا موقع ملا ہے۔ نہ ملتا تو بھی ہم دوست ہوتے۔ چونکہ ہم دونوں کی تخلیق ایک ہی خمیر سے ہوئی تھی۔ ہم دونوں داستوری کے ایڈیٹ تھے۔ دونوں نے احساس کمتری کی دلدل میں ڈوبتے ابھرتے زندگی بتائی تھی۔ ہم دونوں کو "میں تو کچھ بھی نہیں" نے کھا لیا۔ سہارا دیا، بنا دیا، دونوں ہی ڈبے پتے ٹھٹکنے کا لے میڈیا کہ۔ نہ گنتی میں نہ شمار میں۔ نہ تین میں نہ تیرہ میں۔ دونوں ہی غربت کے مارے ہوئے تھے۔ دونوں کو پیٹ بھرنے کے لیے بہت کچھ کرنا پڑتا تھا۔ دونوں کی گردنیں لگی ہوئیں۔ شانے جھکے جھکے۔ ڈرے سہمے ہوئے۔ فکر کے پاس ایک مسکراہٹ تھی۔ اب بھی ہے۔ میرے پاس وہ بھی نہ تھی۔ دونوں غصے کے جلے ہوئے۔ میرا بھڑک اٹھنے والا۔ اس کا دم گھٹنا۔ دونوں ہی ادب لطیف کے مدیر۔ وہ خیالی کا میں ہی کام میں بس یہی نام۔

اللہ میاں سے ہم دونوں کے تعلقات خراب تھے۔ فکر کی خدائی تعلق کی تفصیلات اس کی زبانی سنیے۔

"فکر جی میں لکھتا ہے میرے جنم پر دیوتاؤں نے آکاش سے پھول نہیں برسائے کیونکہ اس وقت وہ جیتنے کے راج محل پر پھول برسانے میں مصروف تھے۔ یعنی جنم ہی سے میرے اور دیوتاؤں کے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ اب تک کشیدہ ہیں۔

میں تونسہ میں پیدا ہوا۔ اگر تونسہ میں نہ ہوتا تو لاڑکانہ میں ہو جاتا۔ مجھ کو بھی

کوئی بری جگہ نہیں۔ لیکن ہر جگہ میرا باپ چودھری نارائن سنگھ کا میر منشی دھنپت رائے ہی ہوتا جس کے گھر خلاف توقع ادیب جنم لیتا اور دیوتا پھول نہ برساتے اس ٹیکنیکل بنا پر کہ میر منشی دھنپت رائے کی چھت کے نیچے ڈیڑھ سو نہیں بلکہ ڈیڑھ کمرہ ہے۔''

اگر چہ وجوہات مختلف تھیں۔ تاہم دونوں کی والدین سے ان بن تھی۔ اس ضمن میں فکر لکھتا ہے:

''میرے والد محترم کے لیے میری پیدائش کی اہمیت صرف ہندسوں تک محدود تھی۔ کیونکہ جب میری پیدائش کی خبر ان کو سنائی گئی تو ان کے منہ سے نکلا ہے۔ ''نارائن، چوتھا'' یعنی ان کے لیے میں ایک منہ تھا۔ چوتھا۔ منہ۔ جسے انہیں چوگا دینا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دیوتاؤں کے ساتھ ساتھ میرے تعلقات ہندسوں سے بھی بگڑ گئے۔۔۔ آج تک بگڑے ہوئے ہیں۔''

ناشر سے بھی ہمارے تعلقات اچھے نہ تھے۔ وہ ناشر جس کے ہم ملازم تھے۔ ظاہر میں گھی کھچڑی تھا۔ در پردہ کچھ اور۔ یہ منافقت نہ تھی۔ مجبوری تھی۔ ویسے طبعاً ہم دونوں جی حضوریے تھے۔ میں تو خیر پیدائشی طور پر اندر باہر سے جی حضوریہ ہوں۔

بدقسمتی سے فکر کے ہونٹوں پر تو جی حضور لٹک رہا تھا۔ لیکن دل کی اندرونی تہوں میں انسانی حقوق کی گرہ پڑی ہوئی تھی۔ لہٰذا بیچارہ روشنی اور اندھیرے میں لٹک رہا تھا۔ اس گرہ کی ایک جھلک ملاحظہ ہو۔ فکر بیتی میں لکھتا ہے: ''ایسا کیوں، آخر کیوں۔ کیوں تھانے دار نمبر دار کے ساتھ ایک دستر خوان پر بیٹھ کر مرغی کھاتا ہے۔ جیتو ساربان کے ساتھ کیوں نہیں۔ میں نے والد صاحب سے پوچھا، والد صاحب نے جواب دیا اس لیے کہ جیتو ساربان کے پاس صرف دو اُونٹ ہیں اور نمبر دار کے پاس تین گھوڑیاں پانچ بیل اور چھ شکاری کتے ہیں۔

ایسا ہی ہوتا ہے۔ بیٹا یہی جگ کی ریت ہے۔ نمبر دار تھانے دار ایک دستر خوان پر بیٹھ کر مرغی کھاتے ہیں۔۔۔ اور جن کے بچے باسی کڑھی کھاتے ہیں۔ مرغی ان کی فریاد نہیں



سنتی۔

یہ سن کر میں راتوں رات گاؤں سے بھاگ نکلا۔ گاؤں میں میں نے کسی کو نہیں بتایا کہ میں ایسے جگ کو بدل دوں گا۔ مرغی اور باسی روٹی کا فاصلہ مٹا دوں گا۔

اپنی محبوبہ پھاتو سے بھی میرے تعلقات بگڑ گئے جس نے کنوئیں میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی تھی۔ اس خوش فہمی میں کہ اس کی خودکشی سے تھانے دار اور نمبر دار کے دستر خوان سے مرغی بھاگ جائے گی۔''

اپنے دل میں پڑی ہوئی اس گرہ کی وضاحت فکر تونسوی اپنے مضمون تذکرہ تونسوی میں کرتا ہے لکھتا ہے:

''مرحوم فکر تونسوی اچھے خاصے انسانیت پرست تھے۔ ہر وقت انسانیت کی بربادی کا خطرہ لاحق رہتا جتنی دیر جئے بہبودی آدم کے غم میں جیے۔ اور اگر عمرِ خضر بھی مل جاتی تو بھی بہبودی آدم کرتے رہتے۔ کچھ پوری طرح تو معلوم نہیں کہ وہ کس قسم کی بہبودی آدم چاہتے تھے۔ لیکن ایک بات صاف تھی کہ انسانیت کو کافی زیادہ بلند کرنا چاہتے تھے۔ مثلاً وہ چاہتے تھے کہ چور عدالت کے سامنے جاتے ہی مان لے کہ میں نے چوری کی ہے۔ انھیں بہت سمجھایا گیا کہ یہ ناممکن ہے مگر وہ مصر رہے کہ ممکن ہے۔ صرف مرنے سے ایک ہفتہ پہلے بمشکل مانے کہ پچاس فی صد ممکن ہے۔''

خیر ان دنوں ہم دونوں فکر اور میں اکٹھے بیٹھ کر سوچا کرتے کہ کس طرح چودھری برکت علی کے بٹوے کے بند ڈھیلے کیے جائیں۔

میں نے زندگی بھر چودھری برکت علی کی سی عظیم شخصیت نہیں دیکھی۔

اس کی شخصیت میں چار بنیادی خصوصیات تھیں گرجنا، برسنا، سوواٹ، اور ہاہاہا۔ ایک بھرپور قہقہہ۔

کہتے ہیں جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں۔ کہنے والوں نے چودھری برکت علی کو نہیں دیکھا۔ ورنہ نہ کہتے۔ برسنے کے لیے چودھری کا گرجنا لازم تھا۔ اور جب وہ برستے تھے تو

کھل کر برستے تھے۔ بوند بوند نہیں۔ پہلے قصائی بن کر ڈانٹتے پھر ماں بن کر گھی کا نوالہ کھلاتے۔ دقت یہی تھی کہ چودھری ہر وقت نہیں گرجتے تھے اور ہم دونوں فکر اور میں بیٹھے دعائیں مانگتے کہ یا اللہ گرجیں۔ ہمیں ڈانٹ کھانے سے دلچسپی نہ تھی لیکن گھی کا نوالہ حاصل کرنے کا کوئی اور راستہ نہ تھا۔

اس ضمن میں فکر میری نسبت زیادہ مظلوم تھا۔ کیونکہ وہ گونگا تھا۔ بے زبان تھا۔ کمیونی کیشن کے لیے نارائن نے اسے صرف ایک مسکراہٹ دے رکھی تھی۔ جواب اثبات میں ہو یا نفی میں، غصے میں ہو یا صبر آلود، غم زدہ ہو یا مسرت انگیز۔ فکر صرف مسکرا دیتا۔ وہی ایک مسکراہٹ بے بسی اور لاچاری بھری مسکراہٹ۔

بڑا تیر مارتا تو زیر لب آدھا جملہ کہہ کر چپ ہو جاتا۔ اس کا آدھا جملہ مجھے آج تک یاد ہے۔ دبی آواز سے کہتا ''دو دن سے'' اور پھر چپ سادھ لیتا۔ وہ آدھا جملہ اس کی آنکھوں ہونٹوں اور ماتھے سے رسنے لگتا۔ جیسے کیکر کے تنے سے گوند رستی ہے۔

کئی ایک ایسے دن آتے جب فکر کی طرف دیکھتے ہی احساس ہوتا کہ ''دو دن سے۔۔۔''

چودھری برکت علی بیک وقت بزنس مین بھی تھا اور غنی انسان بھی۔ مشکل یہ ہے کہ غنا میں تسلسل نہیں ہوتا۔ فلیشز۔۔۔ ہوتی ہیں۔ پھر یہ بھی کہ فلیش کی چمک کے بعد کا اندھیر اور بھی گھپ ہو جاتا ہے۔

پتہ نہیں تقدیر کے کس قانون کے تحت فلیشز تو میرے حصے میں آجاتیں اور فکر کے حصے گھپ اندھیرا فکر اور میرے باہمی تعلقات کچھ ایسے تھے کہ اگرچہ ہم دونوں میں قرب تھا۔ لیکن فکر مجھ سے قریب تر تھا۔ میں فکر کے قریب تر اس لیے نہ ہو سکا کہ میری مَیں بڑی مضبوط تھی۔ اور مجھے خود سے دور جانے نہیں دیتی تھی۔ پتہ نہیں فکر کی مَیں اتنی لفلفی کیوں تھی۔

بہرحال ان دنوں مجھے علم نہ تھا کہ فکر مجھ سے قریب تر ہے۔ یہ بھید تو حال ہی میں کھلا۔ ملاپ کے ایک پیاز کے چھلکے نے بھانڈا پھوڑ کر خواہ مخواہ مجھ پر شرمندگی طاری کر دی۔ حالانکہ عام طور پر میں شرمندہ ہونے سے گریز کرتا ہوں۔ اُنیس نومبر انیس سو اٹھتر روزنامہ ملاپ دلّی



کے شمارے میں پاکستان سے ایک خط کے عنوان سے فکر لکھتا ہے:

''وہ ایک پتلا پیلا لمبا لفافہ تھا۔ ایسے لفافے مجھے عام طور پر سرکار کی طرف سے آتے ہیں۔ چونکہ مجھے ان لفافوں پر اعتبار نہیں رہا اس لیے میں ڈاکیے سے کہنے والا تھا۔ کہ لفافہ میرے بجائے پڑوسی کے لیٹر بکس میں ڈال دینا، چاہو تو نالی میں بھی پھینک سکتے ہو۔ اچانک میری نظر کونے پر لکھے ہوئے جلی حروف پر پڑی ''ممتاز مفتی''۔ ممتاز مفتی۔۔۔ سانس اندر کا اندر باہر کا بھی اندر رہ گیا۔ پورے تیس برس کے بعد یہ ہینڈ رائٹنگ دیکھا تھا۔ بے اختیار جی چاہا چیخ ماروں۔

تم نے سنا ممتاز مفتی کا خط آیا ہے۔ رانجی رکو۔ ڈاکیا ڈر گیا۔

رانجی یہ خط ممتاز مفتی کا ہے۔ ممتاز مفتی کو نہیں جانتے میرا یار غار تھا۔ تیس برس پہلے میں اور وہ ایک کمرے میں۔۔۔ لیکن رانجی ان سنی کر کے چلا گیا۔ حالانکہ وہ دیوالی پر بھی انعام لے گیا تھا۔ ممتاز مفتی کو جانتا نہیں اور انعام لے جاتا ہے۔

اضطراب میں مَیں الٹے پاؤں گھر لوٹ گیا۔۔۔ پپو کی ماں یاد ہے لاہور میں ہمارے گھر ممتاز مفتی آیا کرتا تھا۔

کون مفتی شفتی وہ بولی۔

جب ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کو خنجر گھونپ رہے تھے اس وقت ہم دونوں ایک کمرے میں بیٹھ کر آنسو بہا رہے تھے۔ وہ ممتاز مفتی۔۔۔ اس کا خط آیا ہے آج۔۔۔

اچھا وہ بولی لو ادھر چولہے پر دودھ جل رہا ہے۔

میں نے کہا پڑا جلے۔۔۔ وہ ہمارے ہاں بائیسکل پر آیا کرتا تھا۔ پر وہ ڈاکیہ نہ تھا۔ افسانہ نگار تھا۔ لیکن وہ اٹھ کر چلی گئی۔

اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

ضرور کوئی مبارکباد دینا چاہتا ہے۔۔۔ ہاں ہاں مبارک باد چودھری جی آج
میں بہت خوش ہوں۔ ممتاز مفتی کا خط آیا ہے۔ پورے ہندوستان کا فرض ہے
کہ مجھے مبارکباد دے۔

رانگ نمبر۔۔۔فون کا چونگا رکھ دیا گیا۔

تین منٹ کے بعد سنگ مرمر کے بنچ پر جا بیٹھا۔ میں اکیلے میں یار کا خط پڑھ رہا
تھا۔ اس دنیا کی ہر مسرت اکیلی ہے۔ کوئی کسی دوسرے کی مسرت میں حصہ دار
بننا پسند نہیں کرتا۔ کیونکہ دنیا کے پاس ٹائم نہیں ہے۔ کسی کا دودھ جل رہا ہے۔
کوئی رانگ نمبر پر فون کر رہا ہے۔ کوئی خط بانٹنے میں مصروف ہے۔"

اگر آپ کو دفعتاً یہ احساس ہو کہ کوئی آپ سے اس قدر قریب تھا۔ تو دل کو ایک دھچکا سا
لگتا ہے۔ اگر آپ کو دفعتاً محسوس ہو کہ کوئی اتنا دیالو ہے تو ندامت کی ایک رو آپ کو چاروں
طرف سے گھیر لیتی ہے۔ بہر حال فکر کے کردار کی عظمت نے مجھے کبڑا کر دیا۔

ہاں تو پھر لاہور میں فسادات شروع ہو گئے اور پنجاب بکڈپو کا دفتر جس میں بیٹھ کر ہم
کام کیا کرتے تھے اور جو سرکلر روڈ کے عین اوپر واقعہ تھا۔ اس میں باتیں ہونے لگیں۔ ہندو،
مسلمان کی باتیں۔ چودھری کا ایک قریبی عزیز جو دفتر کی ایڈمنسٹریشن کا انچارج تھا۔ اور جو
میری طرح برائے نام مسلمان نہ تھا۔ بلکہ کٹر تھا۔ اس نے دبی دبی آواز میں فکر کی سیکورٹی
کے متعلق فکرمندی کو ہوا دینی شروع کر دی۔ اس کے انداز سے پتہ چلتا تھا جیسے فکر کی
فکرمندی کی بجائے اپنی فکرمندی زیادہ ہو۔

اگر وہ اس موضوع پر بات نہ کرتا تو کسی کو یاد ہی نہ تھا۔ کہ فکر ہندو ہے، فکر ہندو تھا ہی
نہیں۔ اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، سننا سنانا، سوچنا محسوس کرنا، وہ کسی حوالے سے بھی ہندو نہ تھا۔
ہندو کے علاوہ نہ وہ مسلمان تھا، نہ عیسائی وہ کچھ بھی نہیں تھا، خالی ایک سہا ہوا انسان۔

جب بھی میں سنت نگر جاتا جہاں فکر نے ایک چوباری کرائے پر لے رکھی تھی تو ماحول کو
دیکھ کر مجھے احساس ہوتا کہ فکر ہندو ہے۔ میں کبھی اس کے گھر میں داخل نہیں ہوا تھا۔ نہ ہی
کبھی اس نے مجھے بیٹھنے کی دعوت دی تھی۔



بائیسکل واحد ذریعہ مواصلات تھا۔

بائیسکل پر میں سنت نگر کے ایک احاطے کے بڑے دروازے پر رُک کر آواز
دیتا۔۔۔فکر۔

آواز سن کر یا تو وہ نیچے اتر آتا یا کہیں سے ایک غیر لوچ دار آواز آتی۔ گھر نہیں ہے۔
اور میں لوٹ آتا۔ اس کی دھرم پتنی بھی ہندو نہیں تھی۔ نہ کبھی سامنے آئی نہ آواز میں لوچ۔

پھر چند ہی دنوں میں دفتر کے ناظم کا رویہ کچھ زیادہ ہی فکرمند ہو گیا، فکرمندی کا اظہار
کرتے وقت اس کی آواز جل ترنگ کی طرح لرزتی اور منہ سے تھوک کے فوارے اڑتے۔
اس پر میں فکر کو اپنے گھر لے گیا۔ ان دنوں میرا گھر اچھرے کے ایک کوچہ بند چوگان میں
تھا۔ اردگرد دفتر کے ناظم جیسے جذباتی مسلمان رہتے تھے۔

میری بیوی اگرچہ کٹر مسلمان ہے۔ لیکن دیہاتی عورت کی طرح اس نے اللہ کو کچھ
زیادہ حقوق دے رکھے ہیں۔ اس کی نظر میں اللہ صرف مسلمانوں کا ہی نہیں بلکہ ہندوؤں کا
بھی ہے۔ فکر کے آتے ہی وہ بہت خوش ہوئی۔ لیکن یہ خوشی چند روزہ تھی۔ پھر فکرمندی نے
اسے بھی آ دبوچا اور دفتر کے ناظم کی طرح ہم میں بھی درپردہ بلبلے اٹھنے لگے۔ فکر کے پردے
میں ہم اپنے لیے فکرمند تھے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ چند دنوں کے اندر اندر ہم نے فکر کو ہندو ریفیوجی کیمپ میں بھجوایا۔ اور
میں ایک روکھا سا ڈرا ڈرا سہا ہوا خدا حافظ کہہ کر خوشی خوشی گھر لوٹ آیا۔

تقسیم نے فکر اور میں، ہم دونوں پر بہت گہرا اثر کیا۔ مجھے مسلمان بنا دیا۔ فکر کو
کمیونسٹ۔

تقسیم سے پہلے میں روزنامہ ٹریبون پڑھا کرتا تھا۔ گاندھی کو مہاتما کہا کرتا تھا۔
پنڈت جی کو سیکولر سمجھتا تھا۔ اپنے مسلمان ہونے پر شرمندہ رہتا۔ سیاست کے متعلق
میرے ذہن کا خانہ جب بھی خالی تھا، اب بھی خالی ہے۔

میں سمجھتا تھا بٹوارے پر باؤنڈری لائن پر اس طرف مسلمان کھڑے ہو جائیں گے
اس طرف ہندو۔ مسلمان سفید جھنڈیاں ہلا ہلا کر کہیں گے مہاراج آزادی مبارک ہو۔ ہندو

سفید سفید رومال ہلا ہلا کر کہیں گے کہ خوش رہو پرسن رہو جگ جگ جیو۔ اور پھر سب مل کر بھنگڑا ناچیں گے۔ ہلڑ مچائیں گے۔۔۔ ہلڑ تو مچا لیکن اس کی سُر تال مختلف تھی۔

بدقسمتی سے میرا گاؤں ہند میں شامل ہو گیا اور مجھے وہاں جا کر اپنے عزیزوں کو لانا پڑا۔ میرا گاؤں جو لاہور سے پچاس میل کے فاصلے پر تھا۔ تقسیم کے بعد وہ پانچ سو میل دور ہو گیا۔ اس طویل سفر میں جو جو کچھ میں نے دیکھا اس سے پہلی بار مجھے پتہ چلا کہ میں مسلمان ہوں۔ اور میں نے سچے دل سے تسلیم کر لیا کہ میں مسلمان ہوں۔ اور مسلمان ہونے پر شرمندہ ہونے کی بجائے فخر سے میرا سر بلند ہو گیا۔

فکر نے جو جو کچھ لاہور میں یا لاہور سے ہند کے راستے میں دیکھا اس نے شدت سے محسوس کیا کہ ہندویت اور مسلمانیت دونوں ہی راستے کی دیواریں ہیں۔ اس لیے وہ مذہبی دیواروں سے منکر ہو گیا۔

فکر دراصل لاہور سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ ایک طویل جدوجہد کے بعد وہ گمنامی کے صحرا سے نکل کر شہرت کے نخلستان میں داخل ہوا تھا۔ تونسہ کا یہ خودرو پودا ابھی لاہور کی دنیائے ادب میں پہلی بار لہلہایا تھا کہ دیوتاؤں نے اسے بن باس دے دیا۔

دیوتا بھی بڑے تماش بین ہیں۔ پہلے ایک غریب منشی کے گھر ایک ادیب پیدا کر دیا۔ پھر جب سالہا سال کی تگ و دو کے بعد ادیب نے ادب کی دھرتی پر اپنے پاؤں جما لیے تو اس کے پاؤں تلے سے دھرتی کھینچ لی۔

فکر کی ادب دوستی بذات خود ایک حیران کن بات ہے۔ تونسہ کے ماحول میں سادگی تھی۔ محبت تھی۔ ایثار تھا۔ بے غرض رشتے تھے۔ کوئی چمک نہ تھی۔ دھمک نہ تھی۔ اس صحت مند فضا میں فکر کو ادب کی بیماری کیسے لگ گئی۔ یہ بیماری اسے ورثہ میں بھی نہیں ملی تھی۔ لیکن فکر میں اس کے آثار بچپن سے ہی نمایاں تھے۔

جب وہ تونسہ میں سکول کا طالب علم تھا تو چوری چوری ادبی پرچے پڑھا کرتا تھا۔ سکول میں تین ادبی پرچے آیا کرتے تھے، ہمایوں، شاہکار اور ادبی دنیا۔ ان دنوں یہ پرچے اردو ادب کے چوٹی کے پرچے تھے۔ بدقسمتی سے سکول کا ہیڈ ماسٹر صالح محمد خان خود شاعر تھا۔ اور ادب سے دلچسپی رکھتا تھا۔ سارے مدرسے میں صرف دو فرد تھے جو ان پرچوں میں دلچسپی رکھتے تھے۔ ایک ہیڈ ماسٹر دوسرا فکر۔ ہیڈ ماسٹر شاعر تھا فکر شاعر بننے کے لیے پر تول رہا تھا۔

دسویں پاس کرنے کے بعد وہ ملتان جا کر کالج میں داخل ہو گیا۔ لیکن ایف اے نہ کر سکا۔ والد کی وفات کی وجہ سے تعلیم رُک گئی۔ اس ضمن میں آہ! فکر تونسوی کے عنوان کے تحت فکر لکھتا ہے:

فکر تونسوی مرحوم بڑے مرنجاں مرنج واقع ہوئے تھے۔ ماں روٹی کے سوکھے ٹکڑے پانی میں بھگو کر کھلاتی تو پروٹسٹ نہ کرتے الٹا ذوق وشوق سے کھاتے۔

استادان کی تعلیمی قابلیت پر داد دیتے تو فخر کرنے کی بجائے شرما جاتے۔ ہمجولی دھکا دے کر گرا دیتے تو اس کا ذکر کسی سے نہ کرتے۔ زیادہ سے زیادہ گھر آ کر "طرز تپاکِ اہل دنیا" پر ایک نظم لکھ دیتے۔

والدین کی مالی حالت ایسی تھی کہ ان پر ترس کھا کر تعلیم ادھوری چھوڑ دی۔"

فکر کو یہ جذبہ ترس بڑا مہنگا پڑا۔ سولہ سترہ سال کی عمر میں ہی تلاش معاش کے لیے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ بہت سے کام آزمائے۔ رنگریزی، چپڑاسی، نقل نویسی، کتابت، پریس، اخبار، اندر ادب کا ٹکڑا نہ ہوتا تو کہیں ٹک کر بیٹھ جاتا۔ شب و روز عمومیت کی دھول سے اٹے ہوئے تھے۔ اندر ادب کا جگنو آنکھیں مار رہا تھا۔

۱۹۴۲ء میں شیخوپورہ کے ایک مخلص مولوی نما دوست محمد صادق نے لاہور کے ناشروں سے بات کی۔

سودا بازی کا سوال ہی نہ تھا۔ فکر کا کوئی مطالبہ نہ تھا۔ مقصود صرف ادبِ لطیف تک پہنچنا تھا۔

پھر لاہور کے حلقہ ارباب ذوق نے ان جانے میں فکر تونسوی کی نظم "تنہائی" کو سالِ رواں کی بہترین نظم قرار دیا۔ وائی ایم سی اے ہال میں حسب دستور ایک اعزازی نشست منعقد کی گئی جہاں فکر پہلی مرتبہ لاہور کے ادبی حلقوں میں پیش ہوا۔ شہرت کی ہوائی

اڑی فکر کی ہوائیاں اڑ گئیں۔ فکر حیران کہ یہ کیا ہوا۔ ادھر ادبی حلقے حیران کہ یہ کیا شے ہے جو ادیب کا روپ دھار کر سامنے آ کھڑی ہوئی ہے۔ گردن جھکائے، شانے گرائے نگاہیں گھبرائے، جذبہ کمتری سے بھرپور۔ عجز سے چور چور، ڈرا ڈرا، سہما سہما جیسے ستائش کی نہیں بلکہ سرزنش کی محفل ہو۔

اپنے ان اوصاف حمیدہ کے متعلق فکر لکھتا ہے:

"فکر تونسوی مرحوم بہت سے اوصاف حمیدہ کے مالک تھے اپنے بچے کو چپت مارتے تو بچے کی بجائے خود رونے لگتے۔ شفقتِ پدری کے سبب نہیں بلکہ اس ڈر کے مارے کہ بچہ بُرا مان جائے گا۔

پڑوسیوں سے بہت کم بولتے کہ کہیں اختلاف رائے پیدا نہ ہو جائے۔

خود کو کافی رذیل سمجھتے ویسے اصولی طور پر خودی کے قائل تھے۔"

یہ تو خیر جملہ معترضہ تھا۔

ذرا خیال فرمائیے اس قدر جدوجہد کے بعد فکر کو لاہور میں ادبی شہرت ملی تھی۔ اور اب سیاسی وجوہ کی بنا پر اسے لاہور چھوڑ کر نامعلوم اجنبی جگہوں کی طرف جانا پڑ رہا تھا۔ جب وہ مجبوراً لاہور چھوڑ کر ہند کی طرف عازم سفر ہوا تو اس کے ہاتھ میں اپنی نظموں کے مجموعے ہیولے کی ایک جلد تھی۔ یہی اس کی زندگی کی کمائی تھی۔

بدقسمتی سے اس زمانے میں ہند کو اُردو سے بیگانگی کی بو آنے لگی تھی۔ اور اردو لکھنے والوں کو مشکوک نظروں سے دیکھا جانے لگا تھا۔

پھر یہ بھی تھا کہ وہ دور شوراشوری کا دور تھا۔ شعر وسخن تو امن میں نکھرتے ہیں۔ فکر کی شاہکار نظم تنہائی کا مفہوم شوراشوری میں کیسے اُبھرتا۔ لہٰذا روٹی کے لیے جدوجہد میں شاعری کو چھوڑ کر نثر کی طرف توجہ کی۔

ہند میں پہنچ کر فکر کو از سر نو پاپڑ بیلنے پڑے۔ ریڈیو پر قصیدے گائے۔ فلمی پرچوں میں ستاروں پر جملے چست کیے۔ نیم ادبی رسالوں کو ایڈیٹ کیا۔ کمیونسٹ پارٹی کے روزنامہ "نیا زمانہ" میں سوشلزم کا جھنڈا لہرایا۔



مانگ تانگ کر اپنا ادبی پرچہ نکالا جو فیل ہو گیا۔ جدوجہد کے اس دور میں فکر بڑی شدومد سے سوشلسٹ تھا۔ ذہنی طور پر بھی اور عملی طور پر بھی۔ درحقیقت اسے سوشلزم کی تھیوری سے والہانہ لگاؤ ہے۔ اگر اُسے مروجہ سوشلزم کے "عمل" کا شعور ہوتا تو وہ یقیناً اس عرصہ میں ایک لیڈر بن چکا ہوتا اور باقی زندگی امارت بھرے سکون اور منہ زبانی جوش وخروش میں گزار دیتا۔ قصور سوشلزم کا نہیں فکر کا اپنا ہے اسے آج تک یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اگر لیڈر بننا مقصود نہیں تو پھر سوشلزم میں پاؤں دھرنے کا کیا فائدہ۔

آخر میں فکر کو روزنامہ ملاپ دِلی میں لکھنے کے لیے ایک کالم مل گیا اور وہ اطمینان سے بیٹھ گیا اور پیاز کے چھلکے کے عنوان کے تحت طنزیہ مضامین لکھنے لگا۔

فکر کی تحریر میں چار ایک منفرد خصوصیات ہیں۔

ایک تو چمک دمک نہیں۔ جب شخصیت میں ہی نہیں تو تحریر میں کہاں سے آئے۔ وہ بڑی معصومیت سے سادہ الفاظ میں سچی بات کہہ دیتا ہے۔ سچی بات کہنا آسان کام نہیں لیکن کچھ لوگ کڑوا ہوئے بغیر سچی بات کہنے کا فن جانتے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ سالہا سال کمیونسٹ رہنے کے باوجود فکر کڑوا نہ ہوا۔ کیمونزم اس کا کچھ بگاڑ نہ سکا۔ فکر کی تحریر کی سب سے بڑی خوبی بروزن خودستائی۔ خودسرزنشی ہے۔ اس میں اپنا مذاق اڑانے کی جرأت ہے۔

بہرحال فکر تونسوی کے پیاز کے چھلکوں نے ہند میں دھوم مچا دی۔ لوگوں نے آبدیدہ آنکھوں کے باوجود واہ واہ کے نعرے لگائے۔ اس پر ارباب اقتدار چونکے۔ یہ کون شخص ہے۔ کیا چاہتا ہے۔ اس کا کچا چٹھہ معلوم کیا جائے۔ چھان پھٹک کی جائے۔

چھان پھٹک کرنے والے نے اپنی رپورٹ پیش کی۔ بولا حضور یہ شخص بہبودی آدم کا مارا ہوا ہے۔ کیسی بہبودی آدم چاہتا ہے؟

اس پر چھان پھٹک کرنے والے نے وضاحت کے لیے فکر کی ایک تحریر پیش کر دی لکھا تھا:

"فکر تونسوی مرحوم نے زندگی بھر بنی نوع انسان کی خاطر کام کیا ہے۔ مثلاً نظموں کی ایک کتاب قلم بند کی مگر اس میں بہبودِ آدم کچھ زیادہ گہری ہو گئی۔

کسی آدم کی سمجھ میں نہیں آئی۔

پھر ادیبوں کی کئی ایک انجمنیں قائم کیں جو آپس میں لڑ جھگڑ کر ختم ہو گئیں۔

دو ہفتہ وار اخبار اور چار ادبی ماہنامے جاری کیے جو بنی نوع انسان کی عدم توجہی کی وجہ سے بند ہو گئے۔

ایک بار بہبودیِ آدم کے نعرے لگانے کے لیے گھر سے نکلا تو تند و تیز دھوپ کے باعث سڑک پر بے ہوش ہو گیا۔

ایک بار بہبودیِ آدم کی خاطر گرفتار بھی ہوا لیکن میڈیکل گراؤنڈ پر رہا کر دیا گیا اور آئندہ بہبودیِ آدم سے نہیں بلکہ گرفتاری سے توبہ کر لی۔

ایک مرتبہ انڈر گراؤنڈ انارکسٹوں کو اپنے گھر میں پناہ دینے کے الزام میں وارنٹ نکلے بعد میں پتہ چلا کہ الزام غلط ہے۔ دراصل ایک قرض خواہ کی شرارت ہے۔ آخر بیوی کے زیور بیچ کر قرض ادا کر دیا۔

تیسری مرتبہ گرفتار ہوا تو پتہ چلا کہ ٹیکسی والے سے تو تو میں میں کر رہا تھا۔ چونکہ وہ ناجائز کرایہ مانگ رہا تھا۔ جس کی ادائیگی بہبودیِ آدم کے منافی تھی، نتیجتاً ایک دانت ٹوٹ گیا۔ پاؤں کی ہڈی مڑ گئی اور کالر بون ٹوٹ گئی۔

اس پر ارباب بست و کشاد بہت جھلائے بولے۔ بھئی یہ تو بہبودیِ آدم کا پرچار ہے۔ جو وہ کر رہا ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ وہ یہ پرچار کیوں کر رہا ہے مقصد کیا ہے۔ خود کے لیے کیا چاہتا ہے۔

تفتیشیے نے کہا جناب فکر وہی چاہتا ہے جس کا وہ پرچار کرتا ہے۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ کیا یہ شخص احمق ہے کہ جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے۔

تفتیشیہ سر لٹکا کر کھڑا ہو گیا۔

یہ دیکھ کر صاحب بولے اگر ایسا ہی ہے تو پھر کوئی خطرہ نہیں مشہور ہو رہا ہے تو ہونے دو۔"



یوں ہند نے فکر تونسوی پر شہرت اور عزت کے دروازے کھول دیئے۔ عوام نے اس کی جے جے کار بلائی۔ سرکار زیر لب ہنس ہنس کر دوہری ہو گئی کہ ہمارے دیس میں ایک ایسا شخص بھی ہے جو خالی شہرت کا متمنی ہے۔ روکھی پھیکی شہرت۔ ملک کے سرکردہ لوگ سرکار کے اس فیصلے کے حق میں نہ تھے۔

سیاسی لیڈروں کو فکر سے شکایت تھی کہ وہ ان کی بنی بنائی عزت کو تباہ کر رہا ہے۔ چونکہ فکر نے سیاسی لیڈر کے متعلق "لیڈروں کی محفل میں" صاف صاف کہہ دیا تھا:

"جناب والا دنیا بھر کے لیڈر ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہیں۔ بالکل اسی سانچے میں جس میں بھارت کے لیڈر بے ہنگم چند ڈھلے ہیں۔ جناب والا آپ کے سب لیڈر بے ہنگم چند ہیں۔ اور معاف کیجیے آپ کی مٹی یوں پلید ہے کہ کبھی آپ ہندوستان کے لیڈر بنا دیئے جاتے ہیں کبھی اٹلی کے، کبھی سپین کے کبھی فرانس کے۔ ہر جگہ آپ کا نام بدل دیا جاتا ہے۔ کام وہی رہتا ہے۔ یعنی اپنی قوم کو اٹھانا اور دوسری قوم کو گرانا۔

میرا وشواس ہے کہ اس دنیا پر صرف درجن دو درجن بے ہنگم چند مسلط ہیں۔ جو ایک دوسرے کو گرانے میں شدت سے مصروف رہتے ہیں۔"

ہند کی لوک سدھار تنظیموں کو فکر سے شکایت ہے کہ وہ سچ بول کر ان کا بھانڈہ پھوڑ دیتا ہے۔ مثلاً لوک سدھار کمیٹی کے عنوان سے لکھتا ہے:

"شاید آپ مجھ پر شک کر رہے ہیں کہ میں لوک سدھار نہیں جانتا۔ ایسی بات نہیں بھائیو۔

دراصل دنیا کے ہر محلے میں رات کو بے تحاشا کتے بھونکتے ہیں۔ جس سے اہل محلہ پریشان رہتے ہیں۔

ہر محلے میں ایک جھگڑالو عورت رہتی ہے۔ جو خلل امن کا باعث بنتی رہتی ہے۔

ہر محلے میں دو چار آوارہ گرد نوجوان لڑکے پیدا ہو جاتے ہیں۔ جن سے محلے کا اخلاق تلوار کی دھار پر رہتا ہے۔ ہر محلے میں پانچ دس ریٹائرڈ بوڑھے بھی

ضرور رہتے ہیں۔ جو نصیحتوں کے چراغ اپنے سرہانے جلا کر بیٹھ رہتے ہیں۔
دوستو یہ سب خداداد نعمتیں ہیں اور ہم ان سے بچ نہیں سکتے۔ اگر کسی محلے کو ان نعمتوں سے محروم کر دیا جائے تو وہ محلہ نہیں رہتا۔ بلکہ جنت بن جاتا ہے اور جنت ایک اکتا دینے والی جگہ ہے۔

کوئی لیڈر نہیں چاہتا کہ گندی اور بری چیزیں ختم ہو جائیں۔ اگر ہماری کمزوریاں گندگیاں اور برائیاں ختم ہو جائیں تو سدھار لیڈر کے لیے کرنے کو کیا رہ جائے گا۔

مثلاً مسز وملا ہماری محلہ سدھار لیڈر ہیں۔ ان کا یہی کام ہے کہ محلے کی ان پڑھ عورتوں میں احساسِ کمتری جگائیں۔

قدرت کا اصول ہے جب لوگوں میں احساسِ کمتری پیدا ہو جائے تو ایک نہ ایک لیڈر پیدا ہو جاتا ہے۔

جو اس احساسِ کمتری کے ساز پر اپنا نغمہ الاپتا ہے۔"

فکر کی شخصیت کچھ ایسے عناصر سے بنی ہے کہ زندگی کے راگ میں وہ ایک بیرجت سُر کے مترادف ہے۔ بیرجت سُر راگ میں لگایا نہیں جاتا، اس سے راگ سجایا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ گائک مہاگنی ہو۔ پتہ نہیں کس مہاگنی نے یہ بیرجت سُر زندگی کے راگ میں بجا دیا۔

فکر تونسوی ایک ایسا اونٹ ہے جس کی کوئی کل سیدھی نہیں اور جو کسی کروٹ بیٹھ نہیں سکتا۔ زندگی میں اسے کچھ بھی راس نہیں آیا۔ غربت راس نہ آئی، شاعری راس نہ آئی، ادب راس نہ آیا، شہرت راس نہ آئی، مذہب راس نہ آیا، کمیونزم راس نہ آیا، کامیابی راس نہ آئی، ایسے لگتا ہے جیسے اسے ناکامی میں جدوجہد سے عشق ہے۔ ہند نے اسے شہرت اور کامیابی بخشی کر کے ناکارہ بنا دیا ہے۔

فکر تونسوی رشتوں کے لحاظ سے سراسر فیل ہے۔ جو ازلی طور پر اکیلا ہو، گونگا ہو، اسے رشتوں سے کیا تعلق۔

وہ ایک اچھا دوست نہیں۔ کیونکہ دوستی میں ایثار کی نسبت اظہار کی زیادہ ضرورت پڑتی



ہے۔۔۔ پھر یہ بھی۔۔۔ کہ ایثار تو ایک بوسیدہ چیز ہے۔ اتنی پرانی قدر ہے۔ جس پر اب "اتی" لگ چکی ہے۔ اندازہ لگائیے جو شخص مجھ سے عام دوست سے اظہار لگاؤ کرنے کے لیے چالیس سال سوچ بچار میں گزار دے وہ کسی سے کیا دوستی کرے گا۔ مجھے کنہیالال کپور سے بڑی ہمدردی ہے جسے فکر دوست بنائے بیٹھا ہے۔

فکر تونسوی بہت بڑا حسن پرست ہے۔ بشرطیکہ حسن کو پتہ نہ چلے کہ وہ اس کا پجاری ہے۔ عشق کرے گا۔ اسے بہت شوق ہے۔ بشرطیکہ محبوبہ دور سے کھڑی ہو کر بات کرے اور اظہار عشق کے لیے خطوں پر گزر بسر کرنا چاہتی ہو۔ اگر محبوبہ قریب آ جائے یا اعلانیہ بات کر دے تو فکر بھاگ اٹھتا ہے۔

بچپن اور جوانی میں اس نے دیہات کی دو لڑکیوں سے عشق لگایا ایک گوری تھی ایک سانولی۔ گوری رومان ہی رومان تھی۔ سانولی جسم ہی جسم تھی۔ دونوں کو خبردار کر دیا گیا کہ بات خط و کتابت تک محدود رہے۔ ورنہ نتائج اچھے نہ ہوں گے۔

دراصل فکر تونسوی عشق کے بہانے شاعری کی مشق فرمانا چاہتے تھے۔۔۔۔ دیہات کی لڑکیاں بیچاری کیا جانیں کہ یہ حلوائی لڈو کھانے پر لفظوں کی جلیبیاں تلنے کو کیوں ترجیح دیتا ہے۔ بیچاری جسم والی تو انگڑائیاں لے لے کر کچھ دیر اپنی ہڈیاں توڑتی رہی، پھر اس نے اپنی توجہ کسی اور طرف منعطف کر لی۔ رومان والی کافی دیر تخیل کے سہارے چلتی رہی۔ آخر میں وہ بھی شاعرانہ جلیبیوں سے اکتا گئی۔ دونوں عشق فیل ہو گئے۔ اس پر فکر نے در پردہ گھی کے دیئے جلائے۔ شاعرانہ مٹی کو نم مل گیا۔ زرخیزی اور بڑھ گئی۔ درحقیقت فکر کی محبوبہ تو شاعری تھی جو اس کے دل میں گھونگھٹ نکالے بیٹھی تھی۔

ویسے فکر کا خیال ہے کہ یہ عشق اس لیے فیل ہوئے کہ اس میں ہمت مردانہ کی کمی تھی۔ معاشرے پر اخلاقی روایات کا غلبہ تھا۔ گھر میں اقتصادی پسماندگی کا دباؤ تھا۔ سیانے کہتے ہیں کہ عشق ناسازگی حالات میں زیادہ چمکتا ہے۔ فکر تو بہت خوش قسمت تھا۔ ارد گرد ناسازگاری حالات کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔

یہ تو کنوارے عشق تھے۔ پھر فکر کا دعویٰ ہے کہ اس نے ۶۵ سال کی عمر میں بھی ایک

عشق کیا۔ محبوبہ استانی تھی۔ کنواری تھی۔ چار سال تک یہ عشق چلتا رہا۔ رومان بھی ساتھ جسم بھی نہ پھر عشق کی بے ساختگی کو زندگی کی ذمہ داریوں نے دبوچ لیا۔ محبوبہ سے کہا بی بی کسی سے شادی کرلو۔ اس کے سوا چارہ نہیں چونکہ ہمارے ہاں کی روایت ابھی زوروں پر ہے۔ اس سے مفر نہیں۔ گمان غالب ہے کہ یہ کہہ کر حافظ خدا تمہارا گنگناتے ہوئے گھر لوٹ آئے ہوں گے۔

چونکہ یہ فکر کا حلفیہ بیان ہے۔ لہٰذا مانے لیتے ہیں۔ ویسے شخصیت کے لحاظ سے فکر اس کا اہل نہیں۔ وہ جسم کو عشق میں شامل کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ جسم اس کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ نہ بھی ہو تو بھی سب سے بڑی ندامت ضرور ہے۔ اس لحاظ سے فکر ابن انشا کا ہم رنگ ہے۔ ابن انشا نے بھی عشق کی منجھدار میں اپنی کشتیاں جلادی تھیں۔ کہ نہ تو واپسی کا امکان رہے اور نہ محبوب کی طرف بڑھ کر قرب حاصل کرنے کا۔

فکر تونسوی کے عشق کے کوائف بھی انوکھے ہیں۔ وہ عشق کرنے کے لیے تیار ہے۔ بشرطیکہ اس میں صحرا نوردی کی شرط نہ ہو۔ پہاڑوں میں نہر کھودنے کی شرط نہ ہو۔ محبوب سے وصال کی شرط نہ ہو۔ اور وہ محبوبہ کو بھی اجازت نہیں دیتا کہ کچے یا پکے گھڑے پر دریا پار کرے۔

۱۹۴۴ء میں گھر والوں نے زبردستی پکڑ دھکڑ کر اس کی شادی کر دی آج کے دور میں ارینجڈ میرج کو بُرا بھلا کہا جاتا ہے لیکن بہت سی شخصیتیں ایسی ہیں جن کے سہاگ ارینجڈ میرج کے مرہون منت ہیں۔

اپنی شادی اور بیوی کے متعلق فکر لکھتا ہے:

"فکر تونسوی نے رنگ ریزی کے بعد کئی پیشے اپنائے کمپوزیٹری کلرکی، سکول ماسٹری، دکانداری، چپڑاسی گیری، طبابت اور جب کہیں کامیاب نہ ہو سکے تو تنگ آ کر والدین نے ان کی شادی کر دی۔ اگر اس وقت شادی نہ ہوتی تو سنیاس دھارن کر لیتے۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ قدرت کو ان سے بڑے بڑے کام لینے تھے۔ اس لیے ان کا بیاہ کر دیا گیا۔

پہلے محترمہ نے آتے ہی ان کی انسانیت اور شرافت پر تابڑ توڑ حملے شروع کر



دیئے۔ ہمدردی کے تحت۔"

بیوی کے متعلق فکر لکھتا ہے:

میرے خاندان کی سب سے بڑی مسمسیا میری بیوی ہے۔ وہ ساری زندگی میرے ساتھ محبت اور نفرت کے درمیان لٹکتی رہی ہے۔ میرے بعد دھاڑیں مار مار کر روئے گی کہ سر سے سایہ اُٹھ گیا۔ حالانکہ میں اس کے سر پر ہمیشہ چلچلاتی دھوپ کی طرح پھیلا رہا اور وہ مجھ پہ بجلی کی طرح کڑکتی رہی۔ میرے بعد دھوپ اور بجلی دونوں کا رول ختم ہو جائے گا اور گھرا اندھیرا چھا جائے گا۔ اسی اندھیرے سے بچنے کے لیے کہا کرتی ہے۔ بھگوان مجھے میرے پتی دیو سے پہلے اس دنیا سے اٹھا لے۔

وہ ایک دلیر عورت ہے۔ لیکن صرف میرے ایسے بزدل کے سامنے جب بزدل سامنے سے ٹل گیا تو دلیری صابون کے جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گی۔"

فکر تونسوی آج کل دلی میں مہر گل پارک میں مقیم ہے۔ کمیونزم کا اژدھا گزر چکا ہے۔ جو چالیس سال کی عمر تک پھن پھیلائے کھڑا رہا۔ اب سوشلزم کی لکیریں باقی ہیں جنھیں وہ پیٹ رہا ہے۔ سوشلسٹ سیاست والوں سے جادو کے تماشے دیکھ دیکھ کر اسے بڑے بڑے جھٹکے لگے۔ ناسازگیِ صحت اور آرام پسندی کی وجہ سے خود سے بھی مایوس ہو گیا ہے۔ لیکن تھیوری سے مایوس نہیں ہوا۔

اس کے تین بچے ہیں ایک لڑکا دو لڑکیاں۔ تینوں جوان ہیں، صحت مند ہیں۔ ادب سے کوئی لگاؤ نہیں۔

فکر شب و روز عزلت نشینی میں گزارتا ہے۔ صحت سنبھالے سے نہیں سنبھلتی۔ سنبھل جائے تو گھبرا کر چونک اٹھتا ہے۔ یہ کیا ہوا۔ اس ویرانگی میں ایک ہی نخلستان ہے۔ جینے کا واحد سہارہ۔ پیاز کے چھلکے۔ ادب کے صدف جن میں وہ اپنے آنسوؤں کو منجمد کر کے دُرِ آبدار بنائے جا رہا ہے۔

-☆-

۱۹۶۲ء

# پُراسرار

قدرت اللہ شہاب کی شخصیت کو سمجھنے کا عمل ایک ارتقائی عمل ہے جس میں تین مقام آتے ہیں۔

چند ایک روز کی رفاقت کے بعد آپ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ آپ اس کی شخصیت کو سمجھتے ہیں۔ وہ ایک سادہ، سنجیدہ، خوشگوار، ملنسار اور ہمدرد شخصیت کا مالک ہے۔

مزید قرب حاصل ہو جائے تو دفعتاً آپ محسوس کرتے ہیں کہ خوشگوار ملنسار ہونے کے باوجود اس کی شخصیت میں ایک عجیب طرح کا بُعد ہے۔ وہ قریب نہیں آتا۔ قریب آنے نہیں دیتا۔ آپ حیران ہوتے ہیں کہ یہ کیسی شخصیت ہے۔ دروازے چوپٹ کھلے ہیں لیکن اندر داخل ہونا دشوار ہے۔ آپ سوچ میں پڑ جاتے ہیں پھر آپ پر واضح ہوتا ہے کہ آپ شہاب کی شخصیت کے کچھ پہلوؤں سے ناواقف ہیں۔

اس کے بعد بھی اگر قرب قائم رہے تو ایک روز آپ پر انکشاف ہوتا ہے کہ شہاب کی شخصیت میں ایک پُراسرار عنصر موجود ہے۔ اور آپ اس کی شخصیت کے بہت پہلوؤں سے ناواقف ہیں۔

ایک روز آپ پر انکشاف ہوتا ہے کہ شہاب کی شخصیت کا ایک پہلو کسی انجانی سمت سے تعلق رکھتا ہے۔ جس کا آپ احاطہ نہیں کر سکتے۔ اس وقت قدرت اللہ شہاب آپ کے روبرو اجنبی بن کر آ کھڑا ہوتا ہے۔

یوں شہاب کو جاننے کا عمل سمجھنے سے شروع ہو کر نہ سمجھنے پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ ایک بہت انوکھی بات ہے۔ جس کا ادراک مشکل ہے اور جسے بیان کرنا بہت دشوار ہے۔



شہاب سے ملنے والے بیشتر لوگ تو پہلی ہی منزل پر رک جاتے ہیں۔ بہت کم لوگ دوسری منزل تک پہنچ پاتے ہیں اور تیسری منزل تک پہنچنا۔ شاید کوئی پہنچا ہو۔ مجھے اس کا علم نہیں۔ قدرت میں ایک میکینیکل قسم کی ”ول پاور“ ہے۔ وہ آپ کی توجہ کو باندھ سکتا ہے کہ آپ کی توجہ صرف اس حد تک آگے آئے اس سے آگے نہ جائے۔

قدرت اللہ کو میں گزشتہ چند سال سے جانتا ہوں۔ میں بھی دوسری منزل سے آگے نہیں جا سکا۔ فرق صرف یہ ہے کہ مجھے ادراک ہے کہ میں اس کی شخصیت کے صرف ظاہری پہلوؤں سے واقف ہوں۔ ”نیوکلس“ سے واقف نہیں ہوں۔

ویسے بھی اگر علم النجوم کے مطابق مشہور منجم کیرو کی بارہ شخصیتوں کے حوالے سے دیکھا جائے تو قدرت پائیسز شخصیت کا مالک ہے۔ فلکیات کی رو سے شخصیتیں آگ مٹی، پانی اور ہوا کے خواص لیے ہوئے ہوتی ہیں۔ پائیسز میں پانی کا عنصر حاوی ہوتا ہے لہٰذا اس شخصیت کے دو بنیادی خواص ہیں پردہ اور اسرار۔

مشہور منجم لنڈو پائیسز شخصیت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے:

پائیسز میں سمندر کی سی گہرائی ہے۔ زندگی اس کے لیے ایک راز ہے اور اس راز کو سینے سے لگائے رکھنا اس کے لیے زندگی ہے۔ پردے سے اسے عشق ہے۔ پردہ پوشی کا متوالا، افشائے پردہ کا دشمن۔ اپنے عزیز ترین دوست کے روبرو بھی اپنی زندگی اور شخصیت کے چند دروازے کھولنے سے گریز کرے گا۔

منجم کیتسینہ کا کہنا ہے کہ:

پائیسز کے دل میں مدو جزر کی ہلکی ہلکی لہریں اٹھتی رہتی ہیں اور احساسات کی شدت اس میں انوکھی پھرکیاں چلائے رکھتی ہے۔“

پائیسز کی چھٹی حس کے متعلق کیتسینہ لکھتی ہے:

”پائیسز میں ایک روحانی بے چینی لہریں لیتی ہے۔ جس کے تحت وہ غیر مادی حقائق کی جستجو میں لگا رہتا ہے۔ کچھ جانوروں میں چھٹی حس ہوتی ہے جس کے تحت وہ تھوتھنی اٹھا کر فضا کو سونگھتے ہیں اور آنے والے واقعات کی بو محسوس کر کے بے چین ہو جاتے ہیں۔

بو کی ایسی ہی حس پائیسن میں پائی جاتی ہے جو دوسرے لوگ محسوس نہیں کرتے ایسی بو جس میں کوئی مفہوم ہو، کوئی اشارہ ہو، مقصد ہو، مشاہدہ ہو۔

۱۹۵۸ء میں کراچی میں پہلی بار قدرت اللہ شہاب کو اشفاق احمد کے توسط سے ملا۔ دو سال میں کراچی میں مقیم رہا۔ اس دوران میں مجھے کئی بار قدرت اللہ شہاب سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ان ابتدائی دنوں میں، مجھے قدرت کی شخصیت سے متعلق چند ایک اوصاف کا پتہ چلا۔

پہلی بات یہ تھی کہ اس میں افسری کی ٹیس سرے سے موجود نہ تھی۔ حالانکہ اس وقت وہ بہت بڑے عہدے پر فائز تھا۔ چونکہ صدر پاکستان کا سیکرٹری رہا۔ رینک تو بڑا تھا لیکن صدر پاکستان کے قرب کے حوالے سے بڑے بڑے افسر اس کی عزت کرتے تھے۔ اپنی طبع کم گوئی اور سنجیدگی کے زور پر وہ افسروں سے وقت گزار رہا تھا۔ ادیبوں سے اس کا رویہ دوستانہ تھا۔

دفتر میں اس کی ذہانت اور قابلیت کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ نہایت عمدہ انگریزی لکھتا تھا۔ مختصر لفظوں میں بڑی بڑی باتیں کہہ جاتا۔ انگریزی لکھنے میں اس نے کئی ایک انعامات حاصل کیے ہوئے تھے۔

مقابلے کے امتحانات پاس کرنے میں اسے دسترس تھی اس نے پہلے اکاؤنٹس کا امتحان پاس کیا۔ پھر پراونشل سروس کا اور پھر آئی سی ایس کا۔ تینوں امتحانوں میں پوزیشن حاصل کی۔ حالانکہ اس زمانے میں کسی مسلمان کے لیے مقابلہ کا امتحان پاس کرنا بڑا مشکل تھا۔ قدرت کی یادداشت وی یو آئی تھی۔ کتاب کا صفحہ سامنے آ جاتا۔ ممتحن کو شک پڑتا کہ نقل ماری ہے۔

قدرت میں قابلیت اور ذہانت تو تھیں لیکن نہ قابلیت چمک مارتی تھی نہ ذہانت۔ دیکھنے میں یوں لگتا تھا جیسے گونگا پہلوان ہو۔ پڑھنے لکھنے سے واسطہ نہ ہو البتہ ذہنی طور پر بڑا ''الرٹ'' تھا۔ دکان میں مال تو تھا لیکن شو ونڈو کا وجود نہ تھا۔ ادیب تو تھا، جانا پہچانا ادیب تھا لیکن شخصیت میں ادیبانہ رنگ نہ تھا۔ دانشور تو تھا لیکن بات کرنے کی نسبت بات سننے کا



شوقین تھا۔ بینٹس کانشس نہ تھا۔ طبیعت میں عجز کا رنگ غالب تھا۔ غربت پہ نہ تو ناک چڑھاتا نہ معذرت خواہ ہوتا۔ دوسروں کو اتنی عزت سے بلاتا تھا کہ تو تڑاخ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لہٰذا مجھے بے تکلفی کا کوئی امکان نظر نہ آیا۔

اشفاق احمد نے قدرت کے ساتھ تو تڑاخ قسم کی گفتگو چلانے کی کوشش کی تھی۔ جواب میں قدرت نے بھی وہی رنگ اپنانے کی سعی کی۔ قدرت کی یہ کوشش بہت بھونڈی تھی۔ ظاہر تھا کہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔ قدرت کی شخصیت میں ''او'' اور ''اوئے'' کہنے کی صلاحیت موجود نہیں۔ اس کی شخصیت کا رنگ ایسا تھا کہ دوسرا آپ آپ کرنے پر خود کو مجبور پاتا۔ قدرت کی شخصیت پر محترم کی مہر لگی ہوئی تھی۔ اس کے دوست احباب افسر ساتھی ہم کار عزیز رشتے دار سب اس کا احترام کرنے پر مجبور تھے۔

دو سال کے بعد میرا تبادلہ ہو گیا۔ راولپنڈی میں صدر پاکستان کے دفتر میں میری تعیناتی ہو گئی اور میں قدرت کا ماتحت بن گیا۔ یوں مجھے قدرت اللہ کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ جوں جوں میں اس کے قریب تر ہوتا گیا توں توں مجھ میں حیرت جاگی۔ یا اللہ یہ کیسا انسان ہے۔ اس وقت مجھے یہ احساس نہ تھا کہ میں سمجھنے سے نہ سمجھنے کی طرف بہے جا رہا ہوں۔

سب سے پہلی بات جو مجھے کھٹکی یہ تھی کہ قابل ہونے کے باوجود ذہین ہونے کے باوجود قدرت اللہ میں مردم شناسی کا فقدان تھا۔ جس شخص کے متعلق میں اس سے پوچھتا جواب میں وہ کہتا بہت اچھا آدمی ہے۔ مثلاً دفتر میں ایک افسر تھا جو قدرت اللہ کی ہر تجویز کی کاٹ کرتا تھا۔ دفتر میں تمام کارکن اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے ایک روز میں نے قدرت سے اس افسر کے متعلق پوچھا۔ کہنے لگا بہت قابل افسر ہے۔ ڈسپلن کا قائل ہے اچھا آدمی ہے۔

دفتر میں ایک سیٹھ آ گیا، قدرت اللہ نے سیٹھ سے میرا تعارف کرایا۔ سیٹھ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ یہ جو تمہارا افسر ہے نا اس پر بھروسہ نہ کرنا ورنہ مارے جاؤ گے۔ میں نے پوچھا کیسے۔ بولا۔ دیکھو ہم پاکستان کا سیٹھ ہے۔ ہمارا دستور ہے کہ عید پر ہم بڑے افسروں

کو عیدی بھیجتا ہے۔ اس کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ نہ ہم سفارش کرانا چاہتا ہے نہ کوئی کام کرانا چاہتا ہے۔ ہم تو محبت کی عیدی بھیجتا ہے۔ جب یہ شہاب کراچی آیا تو عید پر ہم نے اس کو بھی عیدی بھیجا۔ اس نے ہمیں فون کیا۔ بولا سیٹھ ایک گھنٹے کے اندر اپنی بھیجی ہوئی عیدی یہاں سے اٹھا کر لے جاؤ۔ ورنہ ہم پولیس کو رپورٹ کر دے گا۔

اس پر شہاب نے کہا جب سیٹھ صاحب کی عیدی آئی تو میں گھر پر نہ تھا واپس آیا تو دیکھا کہ ایک کمرہ مٹھائی کے ٹوکروں سے بھرا ہوا ہے اور دوسرے کمرے میں کپڑے کے تھانوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔

سیٹھ بولا۔ تو ہماری فہرستیں دیکھ لے بابا۔ ہم ہر اہلکار کو اتنی ہی عیدی بھیجتے ہیں۔ تمہیں ہم نے خصوصی عیدی نہیں بھیجی تھی۔

جب سیٹھ چلا گیا تو میں نے اس سے پوچھا یہ کیا کہہ رہا تھا۔ شہاب بولا یہ سیٹھ ہمیشہ کھری بات کرتا ہے ذرا نہیں جھجکتا۔ خوب آدمی ہے۔

پھر ایک عامل قدرت اللہ سے ملنے کے لیے آ گیا۔ اس کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ حالانکہ کپڑے ٹھیک ٹھاک تھے پھر بھی احساس ہو رہا تھا کہ میلا ہے غلیظ ہے، وہ دیر تک قدرت سے عجیب سی باتیں کرتا رہا۔ چلا گیا تو میں نے پوچھا یہ کون حضرت تھے۔ کہنے لگا ایک زبردست عامل ہے۔ شیطانی قوتیں زیر کر رکھی ہیں۔ لوگوں سے علانیہ پیسے بٹورتا ہے۔ بلیک میل بھی کرتا ہے۔ لیکن لوگوں کے کام کر دیتا ہے بہت خوب آدمی ہے۔

میں حیرت میں ڈوب گیا۔ یہ کیسی منطق ہے۔ اوّل درجے کا شیطان ہے۔ رقم بٹورتا ہے۔ بلیک میل کرتا ہے۔ خوب آدمی ہے۔

افراد کے متعلق قدرت اللہ کی رائے دکھاوے کی نہیں ہوتی تھی۔ نہ ہی وہ احتیاط کی وجہ سے کمٹ منٹ کرنے سے گریز کرتا تھا۔ ظاہر تھا کہ وہ کسی کے متعلق منفی رائے قائم کرنا نہیں چاہتا۔ وہ تفریحی غیبت سے بھی گریز کرتا ہے۔

عام دستور ہے کہ شریف لوگ گھر میں چائے خانے میں۔ ریستوران میں پارک میں پلیٹ فارم پر مل بیٹھتے ہیں۔ کسی کا تذکرہ چھڑ جاتا ہے۔ شر پسندی کی وجہ سے نہیں ویسے ہی





تفریحاً۔ وقت کاٹنے کے لیے۔

اس اہلکار کی بات چھڑ جاتی ہے جو دام نہیں چام کی رشوت لیتا ہے اس معزز بڈھے کی بات چل نکلتی ہے جس کے شانوں پر کالج کی ٹیڈی سوار ہے۔

کون ہے جو ایسی معصوم گفتگو میں دلچسپی نہیں رکھتا۔

یہ قدرت کیسا آدمی ہے جو تفریحی غیبت میں بھی حصہ نہیں لیتا۔

یار دوستوں کی بات چھوڑیئے۔ گھر کی بات لیجیے۔ گھر ایک مقدس جگہ ہے۔ گھر میں فرصت کے وقت میاں بیوی دونوں مل بیٹھتے ہیں پھر پڑوسیوں کی بات چل نکلتی ہے۔ اس جوان لڑکی کا تذکرہ چھڑ جاتا ہے جس پر بڑی منہ زور جوانی آئی ہے۔ اس بڈھے پنشنر کی بات شروع ہو جاتی ہے جو بنیرے پر کھڑا ہو کر مونچھ مروڑتا ہے۔ گلیڈ آئی چمکاتا رہتا ہے۔ مقابل رہنے والے جوڑے کی خست کی بات چل نکلتی ہے۔ رشتہ داروں کی چھوٹی چھوٹی کمینگیوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

اس معصوم سی تفریح سے میاں بیوی ایک دوسرے کے قریب آ جاتے ہیں۔ رفاقت کا جذبہ بڑھتا ہے۔ لڑائی جھگڑے کے بغیر وقت کٹ جاتا ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں گھر میں ربط پیدا کرتی ہیں۔ خانہ آبادی کی ضامن بن جاتی ہیں۔

قدرت اللہ کے گھر میں ایسی کوئی بات نہ تھی۔ وہاں دوسروں کی باتیں نہیں ہوتی تھیں۔ قدرت اللہ کے گھر کے کوائف عام گھروں سے قطعی طور پر مختلف تھے۔

مثلاً قدرت کی بیگم ڈاکٹر عفت۔ ایم بی بی ایس تھیں لیکن گھر میں کوئی بیمار پڑتا تو جوشاندہ منگوایا جاتا۔ مکہ معظمہ میں حج کے دوران محترمہ کیمسٹوں کی دکانوں پر اسپغول تلاش کرتی رہیں۔ جب قدرت ہالینڈ میں سفیر تھے تو محترمہ پاکستان سے ترپھلا منگوایا کرتی تھیں۔ پانچ روپے کے ترپھلا پر چالیس روپے محصول ڈاک کا خرچ آتا تھا۔ محترمہ یوں شوقیہ نفل پڑھا کرتی تھیں جیسے آج کل لوگ وٹامن کی گولیاں پھانکتے ہیں۔

قدرت کا بیٹا ثاقب شہاب کے۔ جی میں پڑھتا تھا۔ گھر میں بھی اسے پیار سے مولوی صاحب کہہ کر بلاتے تھے۔ یہ اس کا پیٹ نیم تھا۔ عمر کے لحاظ سے مولوی صاحب کی سائنسی

معلومات بہت وسیع تھیں۔ بات بات پر مولوی صاحب کہا کرتے تھے۔ سائنس پڑھتا ہوں کوئی مذاق تھوڑا ہے۔

ایک بار قدرت پتلون کا ناپ دینے درزی کی دکان پر گیا۔ مولوی صاحب ساتھ تھے۔ قدرت نے پتلون کی موہری کے متعلق ہدایات دیں تو مولوی صاحب بولے۔ ابو اگر آپ غرارے پہنیں گے تو میں آپ کو اپنے ساتھ باہر نہیں لے کر جایا کروں گا۔

بڑی بڑی باتوں کی عظمت سے مجھے انکار نہیں۔ کردار کے اعلیٰ اوصاف کی بڑی قدر کرتا ہوں۔ بہر حال اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زندگی چھوٹی چھوٹی باتوں سے عبارت ہے اور شخصیت کی دلچسپی پھولوں سے نہیں پتیوں سے ہے۔ ٹیڑھی میڑھی شاخوں سے ہے۔ ہمارے چھوٹے چھوٹے موہوم لاگ لگاؤ، دشمنیاں، خوش فہمیاں، کج رویاں، یہ سب ایک عام آدمی کے لیے غریبانہ عشرتیں ہیں۔ یہ وہ کھونٹیاں ہیں جن پر دوستی کی گٹھڑیاں ٹانگی جاتی ہیں۔

نوردین سے میری دوستی کی وجہ یہ ہے کہ ہم دونوں کو برکت علی سے بیر ہے۔ دونوں بیٹھ کر برکت علی کے عیب گنتے ہیں۔ یار محمد کو میں نے اس لیے دوست بنایا تھا کہ وہ بھی گھر والی کے ہاتھوں مظلوم تھا۔ ہم روز ملتے تھے۔ بات گھوم پھر کر گھر والی پر آ کر رکتی۔ پھر ہمارا متفقہ فیصلہ ہوتا کہ گھر والیاں احمق ہوتی ہیں۔ ان کی باتوں کو چنداں اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ اس فیصلہ کے بعد ہم دونوں میں گھر جانے کی ہمت پیدا ہو جاتی۔ قدرت اللہ کے پاس آپ گھنٹوں بیٹھے رہیں وہ کسی برکت علی کی بات نہیں کرے گا۔ اس کی زندگی میں کوئی برکت علی نہیں جس کے عیب گنوا کر اسے لذت محسوس ہو، اس کا کوئی دوست نہیں کوئی دشمن نہیں۔

ویسے تو زندگی میں میرا بھی کوئی دشمن نہیں۔ یہ نعمت ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔ بہر حال اپنی ذاتی اہمیت پیدا کرنے کے لیے میں نے بھی دو ایک دشمن ایجاد کر رکھے ہیں۔ لیکن یہ قدرت کیسا آدمی ہے۔ یہ شخص ایسے چھوٹے چھوٹے سہاروں سے اس قدر بے نیاز کیوں ہے۔ مثلاً اسے کبھی غصہ نہیں آیا۔



چھ برس کی رفاقت میں میں نے صرف اسے ایک بار غصے میں آتے دیکھا ہے۔ شام کا وقت تھا۔ میں قدرت کے گھر میں بیٹھا تھا۔ ایک سائل آ گیا۔ اس نے اپنی بدقسمتی اور مفلوک الحالی کا تذکرہ سنانا شروع کر دیا۔ چونکہ اہل زبان تھا اس لیے چٹخارے لے لے کر بیان کرتا رہا۔ قدرت اسے تسلیاں دیتا رہا۔ گھبرائیے نہیں اللہ نے چاہا تو گزارے کی کوئی صورت بن جائے گی۔ آخر میں سائل اٹھ بیٹھا اور غصے میں بولا۔ لعنت بھیجیے ایسے ملک پر جس کی خاطر ہم تباہ حال ہوئے اور پیشتر اس کے کہ وہ جملہ ختم کرتا قدرت نے اٹھ کر اس کے منہ پر ایک زناٹے کا تھپڑ مارا اور بولا۔ گٹ آؤٹ۔

مانا کہ غصہ حرام ہے، مانا کہ وہ ایک ایسی چھری ہے جسے انسان اپنے ہی پیٹ میں بھونکتا ہے۔ لیکن اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ غصے میں آ کر آپ انسانوں کی صف میں آ شامل ہوتے ہیں۔ اس سرکار میں پہنچ کر سبھی ایک ہو جاتے ہیں۔ نہ محمود رہتا ہے نہ ایاز۔ یہ قدرت کیسا انسان ہے کہ ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنائے بیٹھا ہے۔

قدرت کا کہنا ہے کہ غصہ آتا ہے تو اسے آنے دو۔ روکو نہیں۔ نہ ہی خود میں جذب کرو۔ ردعمل پیدا نہ ہو، چھلنی بن جاؤ کہ وہ گزر جائے، قیام نہ کر سکے۔

قدرت اللہ ایک جانا پہچانا ہوا ادیب تھا، اس کے باوجود اس کی گفتگو یا رویے سے کبھی ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ اسے ادب سے کوئی تعلق ہے۔ ادب عام طور پر شخصیت پر ایک چھاپ لگا دیتا ہے۔ جو چھپائے نہیں چھپتی۔ قدرت کی شخصیت پر ایسی کوئی چھاپ نہ تھی۔

نفسیات کی رو سے ادیب کی شخصیت میں تضاد نمائش اور شدت تین بنیادی عناصر ہوتے ہیں۔

ادیب کی شخصیت فقیر خانے کے مصداق ہوتی ہے جہاں معذور شہنشاہ بستے ہیں، جہاں گونگے بولتے ہیں، اندھے دیکھتے ہیں، لنگڑے دو پاؤں پر چلتے ہیں۔

اپنے دکھ کو بھلانے اور دوسروں کی توجہ اپنی طرف منعطف کرنے کے لیے مختلف قسم کے ہتھکنڈے عمل میں لائے جاتے ہیں۔ کوئی علاج بالمثل کو اپنا کر ابوالدکھ حفیظ جالندھری کی طرح دکھ کی دکان سجا کر بیٹھ جاتا ہے۔ کوئی ثناء اللہ جٹادھاری روپ دھار کر لوہے کے

گولوں کا تماشہ دکھاتا ہے۔ اور چلا چلا کر کہتا ہے ہم ثناء اللہ نہیں۔ میراجی ہیں۔ ثناء اللہ کون تھا۔ ہم اسے نہیں جانتے۔ کوئی کالی شلوار لہرا لہرا کر کہتا ہے۔ اگر میں پنجاب پریس برانچ کے مولوی محمد حسین کو ننگی کا ناچ نہ نچا دوں تو میرا نام منٹو نہیں۔ کوئی اشفاق احمد کی طرح تلقین شاہیاں ایجاد کر لیتا ہے۔ کوئی سادھو منش انشاء کی طرح مزاح کی قبا اوڑھ کر قہقہے لگاتا پھرتا ہے۔

قدرت میں نہ نمائش تھی نہ شدت نہ تضاد۔ اس کے کردار میں نمائش کا فقدان تھا۔ اس کی تحریر میں چونکا دینے والی کوئی بات نہ تھی۔ اس کے جملوں میں توجہ طلبی کا عنصر نہ تھا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے قدرت ادب کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتا۔ اسے ایک ضمنی یا تفریحی چیز سمجھتا ہے۔

قدرت میں ایک عجیب خصوصیت تھی۔ اس نے کبھی کسی کو نصیحت نہ کی تھی۔ دوسروں کو روکنا ٹوکنا نصیحتیں کرنا بڑوں کا عام دستور ہے۔ دوسرا بات مانے یا نہ مانے چاہے گھر جا کر مضحکہ اڑائے۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ دوسروں کو نصیحت کرنا بذاتِ خود ایک خوش کن عمل ہے۔ ایک ساعت کے لیے نصیحت کرنے والے کی حیثیت پیدا ہو جاتی ہے۔ برتری کا احساس، اجلے پن کی لذت، بزرگی کا زعم، نصیحت کرنا ایک عام سی عشرت ہے۔ معصوم سی لذت۔

اگر آپ چند ساعت کے لیے اُجلے کپڑے پہن کر میلے لوگوں کو صفائی کی تلقین کریں تو یہ معصوم سی بات ہے۔ قدرت اللہ اس عوامی لذت سے سراسر منکر ہے وہ کبھی اجلے کپڑے پہن کر آپ کے پاس نہیں بیٹھے گا۔ اس نے کبھی ایسی بات نہیں کی جس سے ظاہر ہو کہ وہ دوسروں سے بہتر ہے۔ اس نے کبھی کسی کو یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے غیر مناسب ہے۔ آپ اس کے پاس بیٹھ کر شراب پئیں۔ وہ ٹوکے گا نہیں بلکہ آپ کے فعل کو چنداں اہمیت ہی نہیں دے گا۔ جیسے آپ شراب نہیں شربت پی رہے ہوں۔ آپ اس کی موجودگی میں کفر و الحاد کی بات چھیڑ دیں۔ وہ آپ سے بحث نہیں کرے گا بلکہ بڑی چالاکی سے گفتگو کا موضوع بدل دے گا۔ وہ بحث سے ہمیشہ احتراز کرتا ہے۔ اس کے نزدیک بحث



تخریبی فعل ہے۔ بحث سے کبھی کوئی قائل نہیں ہوا۔ الٹا بحث سے چھینٹے اڑتے ہیں۔ کپڑے خراب ہوتے ہیں۔

ایک روز دفتر میں ایک اعلیٰ افسر قدرت اللہ سے ملنے آ گیا۔ اس نے بڑے پتہ کی بات کہہ دی۔ کہنے لگا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ہمارے دل میں بھی پاکستان کا درد ہے۔ ہم بھی صبح شام کام کرتے ہیں۔ ملک کے لیے جان کی بازی لگائے بیٹھے ہیں۔ لیکن جب نکتہ چینی کا موقع ہوتا ہے تو لوگوں کی زبان پر ہمارا نام آ جاتا ہے اور جب واہ واہ کی محفل جمتی ہے تو لوگ شہاب شہاب کرنے لگتے ہیں۔

بے شک نیک نامی قدرت اللہ کے مقدر میں لکھی ہے۔ تمام افسر ماتحت کارکن چپڑاسی حتیٰ کہ عام لوگ قدرت اللہ کے گن گاتے ہیں۔

دفتر میں روزانہ بیسیوں لوگ قدرت اللہ سے ملنے آتے تھے، جو ملنے میں کامیاب ہو جاتے وہ خوشی خوشی گھر لوٹ جاتے جیسے مل لینا ہی تکمیل کار ہو۔ جنھیں مسلسل انتظار کے بعد ناکام جانا پڑتا تھا۔ وہ بھی اپنی ناکامی کا باعث قدرت کو نہیں سمجھتے تھے، بلکہ حالات کو مورد الزام ٹھہراتے تھے۔

دفتر میں قدرت کے نام کئی ایک خط موصول ہوتے تھے۔ ان خطوط میں عام طور پر قدرت کی تعریف و توصیف ہوتی تھی۔ اپنی تعریف پڑھ کر وہ جھینپ جاتا تھا۔ وہ ان خطوں کا جواب نہیں دیتا تھا کبھی کبھار ایسا خط بھی موصول ہوتا جس میں قدرت کے خلاف شکایات لکھی ہوتیں اس کے رویے پر کڑی نکتہ چینی ہوتی۔ ایسا خط دیکھ کر اس کے چہرے پر بشاشت کے آثار ظاہر ہوتے۔ ایسے خط وہ ملنے والوں کو پڑھنے کے لیے دے دیتا اور پھر بغیر تاخیر کے جواب لکھنے میں مصروف ہو جاتا۔

صدر گھر کے چپڑاسی قدرت اللہ پر بہت خوش تھے۔ وہ اس کے روبرو نجی باتیں کرنے سے بالکل نہ گھبراتے تھے۔

قدرت کی بیگم ڈاکٹر عفت ہر روز صبح شام دو مرتبہ صدر گھر کے گرد و نواح میں مقیم جونیئر سٹاف کے گھروں کے راؤنڈ لگاتی تھیں۔ بیماروں کو دوائیں دیتیں اور ساتھ ہی دودھ پینے

کے لیے رقم بھی۔

قدرت کی نیک نامی کو دیکھ کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ یہ سونے کا چمچہ اسے کس نے عطا کیا کہ سبھی اس کے گن گانے پر مجبور ہیں۔ حالانکہ اس میں کسی کا دوست بننے کی صلاحیت سرے سے ہے ہی نہیں۔ اس کی شخصیت میں وہ کھونٹیاں تھیں ہی نہیں جن پر دوستی کی گٹھڑی ٹانگی جا سکتی ہے۔

اوصاف ہمیں ایک دوسرے کے قریب نہیں لاتے۔ کمزوریاں لاتی ہیں، بے بسیاں لاتی ہیں محتاج کج رویاں لاتی ہیں۔ شاید اس کے جواز میں کہا جائے کہ قدرت ایک نیک آدمی ہے۔

یقین جانئے کہ میں نیک آدمیوں کی عزت کرتا ہوں۔ انھیں احترام کی نظر سے دیکھتا ہوں لیکن پتہ نہیں کیوں مجھے نیک آدمی سے عجیب سی بُو آتی ہے۔ نیک آدمی قریب آئے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس کا بند بند چلا چلا کر کہہ رہا ہو۔ ہٹو بچو نیک آدمی آ رہا ہے۔ باادب باملاحظہ ہوشیار۔

پتہ نہیں کیوں نیک آدمی میں نیکی کے اتنے ڈھیر لگ جاتے ہیں کہ آدمی دب جاتا ہے۔ بے شک قدرت اللہ ایک نیک آدمی ہے لیکن اس میں سے بو نہیں آتی اس کی آمد پر ہٹو بچو کا احساس نہیں ہوتا۔ قریب جا کر گھبراہٹ نہیں ہوتی۔

قدرت اللہ کی محبت کے کوائف بھی انوکھے تھے۔

ویسے تو ہر شخص کی محبت کے کوائف انوکھے ہوتے ہیں۔ کوئی محبوبہ کو فرشتوں کی پاکیزگی بخش کر خود پر حرام کر لیتا ہے۔ کوئی محبوبہ کو بیسوا کی حیثیت عطا کر کے خود پر حرام کر لیتا ہے۔ کوئی پھول کی خوشبو سے مستی اخذ کرتا ہے۔ کوئی پتیاں نوچنے کی لذت کو اپنا لیتا ہے۔ کوئی کلی کلی رس چوستا ہے۔ لیکن یہ دلچسپ کوائف جنس کی آمیزش سے پیدا ہوتے ہیں۔ جب محبت میں جنس کا خمیر اٹھتا ہے تو لہریں اٹھتی ہیں۔ چھینٹے اڑتے ہیں۔ جھاگ پیدا ہوتا ہے طوفان چلتے ہیں۔

قدرت جنس کی اہمیت سے منکر نہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ جنس کے شعلے کی آگ کو جذب



کر کے معدوم کر دو تا کہ صرف روشنی ہی روشنی باقی رہ جائے۔

نوجوانی کے اولین دور میں قدرت کو ایک لڑکی سے محبت ہو گئی۔ اس کی بڑی سے بڑی آرزو یہ تھی کہ محبوبہ ایک جائے نماز پر اس کے ساتھ کھڑی ہو کر نماز پڑھے۔ حیرت کی بات ہے کہ محبوبہ اس کے ساتھ کھڑی ہو کر نماز پڑھا کرتی تھی۔

عنفوان شباب میں قدرت اللہ کو ایمن آباد کی ایک ہندو لڑکی سے محبت ہو گئی۔ اس آپ بیتی کے کوائف شہاب نے ایک کہانی ''چندراوتی'' میں قلم بند کیے ہیں۔ لکھتا ہے جب مجھے چندراوتی سے محبت ہوئی تو اسے مرے ہوئے آٹھ روز ہو چکے تھے۔ چندراوتی۔ ایمن آباد کے ایوانوں کی نوکرانی کی بیٹی تھی۔ اسے ٹی۔ بی کا عارضہ لاحق تھا۔

قدرت اللہ روزانہ لاہور سے ایمن آباد ۳۲ میل کا سفر اپنے سائیکل پر طے کرتا تھا۔ محبوبہ کی مزاج پرسی کرتا پھر اس کے کپڑے تالاب پر لے جا کر انھیں دھوتا سکھاتا۔ محبوبہ کو دوائیاں پلاتا۔ اس کی دلجوئی کرتا اور پھر شام کو لاہور واپس آ جاتا۔

قدرت کی سب سے بڑی عیاشی یہ تھی کہ چندراوتی کو اپنے سائیکل پر بٹھا کر لاہور کی سیر کرائے۔

پھر اس کی زندگی میں ایک حسین و جمیل بیگم آ داخل ہوئی۔ وہ اس قدر حسین تھی کہ اس کے گھر نوجوان اور ادھیڑ عمر شوقین مزاجوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ بیگم کو عشاق کی بھیڑ لگانے سے دلچسپی تھی۔ قدرت بھی اس بھیڑ میں شامل ہو گیا اور ایسا جادو جگایا کہ بھیڑ چھٹ گئی رنگ رلیوں کی جگہ قرآن خوانی ہونے لگی۔ لیکن محترمہ آگ کو نہ تیاگ سکی۔ شعلہ عام سے ہٹ کر مخصوص ہو گیا۔ شعلوں کی شوقین روشنی پیدا نہ کر سکی۔ جب اس نے دیکھا کہ کسی صورت بات نہیں بنتی تو وہ قدرت کو اپنے شعلے سے بھسم کرنے کے لیے آگے بڑھی قدرت اپنے کپڑے بچاتا ہوا بھاگا۔ پھر یہ تعلق ایک المیہ میں بدل گیا۔

قدرت محبت میں بڑا ظالم ہے۔ وہ دیتا نہیں چھین لیتا ہے۔ محبوبہ کے شعلے کو بھسم کر کے اسے روشنی میں بدل دیتا ہے۔ ٹھنڈی روشنی جو جلاتی نہیں بلکہ منور کر دیتی ہے۔

دراصل محبت میں قدرت بہت بڑا خود غرض ہے۔ وہ محبوبہ کے شعلوں کو کام میں لا

ہے۔ اس سے حدت حاصل کرتا ہے اور پھر اس حدت کو روشنی میں بدل کر خود کو منور کر کے کسی اور سمت متوجہ ہو جاتا ہے۔

قدرت ایک انوکھا تپسوی ہے جس کی خواہش ہے کہ کوئی راج نرتکی اس کے گیان دھیان کو توڑنے کے لیے اس کے گرد ناچ ناچ کر ہار جائے اور پھر تپسوی کے چرنوں میں بیٹھ کر خود گیان دھیان میں کھو جائے اور بالآخر تپسوی سے بے نیاز ہو کر کسی اور طرف متوجہ ہو جائے۔

اس لحاظ سے قدرت ایک اتیہ چار ہے جو ازلی خواہش کا رخ بدلنے کے لیے عورت کو استعمال میں لاتا ہے۔ جوتن کی آگ کو نور میں بدلنے کے لیے انسانی شعلے کو از خود قرب کی دعوت دیتا ہے۔ وہ انوکھا فن کار ہے جو آگ کو آگ سے بجھاتا ہے ڈوبنے سے بچنے کے لیے پانی میں چھلانگ لگا دیتا ہے۔

میں نے راج نرتکیوں کو اس کے گرد جسم کا ناچ ناچتے دیکھا ہے۔ ایسی راج نرتکیاں جن کے ایک آسن کا متحمل ہونا مشکل نظر آتا تھا۔ میں نے قدرت کو ان کے درمیان بدھ بنے بیٹھے ہوئے دیکھا ہے۔

آگ کو نور میں بدلنے کی جانکاہ جدوجہد میں مَیں نے اسے سمندر کے ساحل کی تپتی ہوئی ریت پر مگرمچھ کی طرح تڑپتے ہوئے دیکھا ہے۔

بدقسمتی سے مجھے ایک ایسے ادارے میں کام کرنے کا موقع ملا جہاں شخصیت کی تحلیل و تحقیق کی جاتی تھی۔

شخصیت کے اصولوں کی روشنی میں قدرت کی شخصیت بے حد انوکھی تھی۔ مجھے اس بات کا شعور ہونے لگا کہ میں قدرت کی شخصیت کا بھید نہیں پا سکا۔ ابھی میں تذبذب کے عالم میں تھا کہ ایسے واقعات روبرو آئے جن سے میں بالکل ہی بوکھلا گیا۔

سب سے پہلے جو واقعہ پیش آیا وہ ایک عام سا واقعہ تھا۔ میرے ایک عزیز دوست میرے پاس آ ٹھہرے۔ وہ شورکوٹ کے ایک بزرگ کے بڑے قائل تھے۔ بات بات پر ان کا تذکرہ کرتے۔ انھوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں ان بزرگ کے نام ایک خط لکھوں۔ میں



نے ایک رسمی سا مختصر خط لکھ دیا۔ چند دنوں بعد جواب موصول ہوا۔ رسمی مزاج پرسی اور دعاؤں کے ساتھ ایک جملہ یہ بھی شامل تھا کہ جن صاحب سے آج کل ملتے رہتے ہیں انہیں ہمارا اسلام کہیے۔ یہ شخص دین اور دنیا دونوں ہی لوٹ کر لے گیا۔

ان دنوں ملتا تو میں صرف قدرت سے تھا۔ نہیں نہیں قدرت کی طرف اشارہ نہیں ہے۔ میں نے سوچا۔ قدرت تو جھجک کر پیچھے ہٹ جانے والا آدمی ہے۔ وہ کیا دنیا لوٹے گا۔

اس کی کیفیت تو یہ تھی کہ بڑا افسر ہونے کے باوجود دفتر میں یوں داخل ہوا کرتا تھا جیسے کوئی جونیئر کلرک جو لیٹ آیا ہو۔ وہ خود اپنی افسری پر گویا معذرت خواہ تھا جب کبھی وہ فون کرتا تو مجھے لالہ رام لال یاد آ جاتے لالہ رام لال ہمارے ہیڈ ماسٹر تھے۔ فون بجتا تو لالہ جی میز پر رکھی ہوئی پگڑی اٹھا کر سر پر رکھتے۔ ننگے پاؤں کھڑے ہو کر چونگا اٹھاتے اور کہتے جی مہاراج۔ میں لالہ رام لال بول رہا ہوں۔

صدر صاحب کے بلاوے پر قدرت کاپی پنسل اٹھا کر جاتا۔ تو ایسے معلوم ہوتا جیسے کسی جونیئر کلرک کو عارضی طور پر پی۔ اے کا کام مل گیا ہو۔ دراصل قدرت اللہ کی شخصیت میں افسر بننے کی صلاحیت کا خانہ ہی خالی تھا۔

نفسیاتی تحقیق کے ادارے کی رپورٹ میں جہاں مجھے کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ ایک خانہ ہوتا تھا جس میں لکھا تھا کیا امیدوار میں افسر بننے کی صلاحیت موجود ہے۔ افسریت کی صلاحیت کے کوائف کیا تھے۔

۱۔ حساس نہ ہو۔

۲۔ شدت نہ ہو۔

۳۔ پچھتانے کی عادت نہ ہو۔

۴۔ طبیعت میں ادبی یا فنکارانہ رنگ نہ ہو۔

۵۔ خود کو کمتر نہ سمجھے۔

۶۔ فوری فیصلہ کر سکے چاہے غلط ہی کیوں نہ ہو۔

۷۔ اس فیصلے پر یقین رکھے کہ درست ہے۔

۸۔ حکومت کی بُو ہو۔

۹۔ ترس کے جذبے سے پاک ہو۔

۱۰۔ انصاف کی بجائے ایڈمنسٹریشن کرے۔

اگر آئی سی ایس کے امتحان میں قدرت اللہ کی شخصیت کی رپورٹ مجھ سے لکھوائی جاتی تو میں لکھتا کہ امیدوار میں افسر بننے کی صلاحیت نہیں ہے میں تسلیم کرتا ہوں کہ امیدوار میں بہت ذہانت ہے لیکن اس کی ذہانت ایسی نہیں جو پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ آگے چلنے والی ذہانت افسری کے لائق نہیں ہوتی۔

قدرت اپنی ذہانت یوں چھپا کر رکھتا تھا جیسے چوری کا مال ہو۔ دانشور تو اسے ماتھے کے ٹیکے کی طرح سجائے رکھتے ہیں۔

دنیا لوٹنے کی ایک اور تفصیل بھی ملاحظہ ہو۔

سکندر مرزا کے دور میں صدر گھر میں رکشا کا داخلہ ممنوع تھا۔ لیکن قدرت اللہ روز دفتر رکشے میں آتا تھا۔ جب قدرت کا رکشا چیختا چلاّتا ہوا دھواں اڑاتا صدر گھر میں داخل ہوتا تو سکندر مرزا قلم رکھ کر بیٹھ جاتے ماتھے پر تیوری پڑ جاتی۔

ایک روز جب قدرت کے رکشے نے بہت اودھم مچایا تو وہ میٹنگ میں تھے۔ بولے کوئی ہے جو ہمیں اس رکشے سے نجات دلائے۔ یہ سن کر سارا دفتر حرکت میں آ گیا۔ مشوروں اور پیش کشوں کا تانتا بندھ گیا۔

کسی نے کہا صدر گھر میں موٹریں بے کار کھڑی رہتی ہیں۔ آپ چاہیں تو ایک آپ کے ہاں بھجوا دیں۔ دوسرا بولا۔ آپ پسند کریں تو ڈیوٹی کار آپ کو دفتر لے آیا کرے۔

پھر بات کراچی کے سیٹھوں تک جا پہنچی۔ کئی ایک سیٹھوں نے کار تحفے کے طور پر دینے کی پیش کش کر دی۔

آخر ایک کلرک کو سوجھی بولا حضور پسند کریں تو جی۔ پی فنڈ سے کار خریدنے کی عرضی لکھ لاؤں۔ حساب کتاب جوڑنے پر معلوم ہوا کہ کاٹ کٹوتی کے بعد قدرت کی نقد تنخواہ سیکوریٹی



افسر جتنی بنتی تھی۔ کلرک بولا جناب رول قانون کے مطابق آپ کار خرید سکتے ہیں۔ اور رقم قسطوں میں ادا کر سکتے ہیں۔

بہر حال نتیجہ یہ ہوا کہ قدرت نے ایک کار خرید لی۔

نہیں میں نے سوچا۔ شورکوٹ کے بزرگ کا اشارہ قدرت کی طرف نہیں ہو سکتا۔

ابھی میں سوچ بچار میں ہی تھا کہ شورکوٹ سے ایک اور خط موصول ہوا۔ لکھا تھا کیا وجہ ہے کہ آپ نے ہمارے خط کا جواب نہیں دیا۔ اور کیا آپ نے قدرت اللہ کو ہمارا سلام پہنچا دیا تھا۔ خط پڑھ کر میں حیران رہ گیا۔ کبھی خط کے مضمون کی طرف دیکھتا کبھی قدرت اللہ کی طرف۔

پھر ایک اور واقعہ ہوا۔ اسی علاقے میں ایک بڑی عابدہ خاتون رہتی تھی۔ سارے محلے والے اس کا احترام کرتے تھے۔ ایک روز خاتون قدرت کے گھر آ گئیں۔ بولی میرا ارادہ تھا کہ اعتکاف کروں۔ کئی دنوں سے سوچ رہی تھی۔ کل رات مجھے خواب میں ہدایت کی گئی ہے کہ اعتکاف کسی پاکیزہ گھر میں کیا جائے ساتھ ہی مجھے آپ کا گھر دکھایا گیا ہے۔ اس نے چاروں طرف دیکھا اور پھر اشارہ کر کے بولی۔ ہاں یہی کمرہ دکھایا گیا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو۔۔۔ خاتون کی بات سن کر مجھے حیرت ہوئی۔۔۔ پاکیزہ گھر۔۔۔ میں بار بار قدرت کے گھر کی طرف دیکھتا۔ وہ ایک عام سا گھر تھا۔ جس میں کوئی خصوصی پاکیزگی نہ تھی البتہ قدرت کی بیگم باقاعدگی سے نماز پڑھا کرتی تھیں۔

قدرت کو میں نے کبھی نماز پڑھتے نہ دیکھا تھا۔ وہ تو بعد میں پتہ چلا تھا کہ قدرت باتھ روم میں چھپ چھپ کر نماز پڑھتا ہے۔ بہر حال میں حیران تھا کہ اس خاتون کو اعتکاف کے لیے قدرت کا گھر کیوں دکھایا گیا ہے۔

راولپنڈی میں ایک روز قدرت اللہ کے نام خط موصول ہوا۔ یہ خط خوشاب کے ایڈووکیٹ کی جانب سے تھا۔ لکھا تھا میں آپ سے واقف نہیں ہوں۔ سنا تھا کہ آپ بہت اچھے آدمی ہیں مگر اولاد سے محروم ہیں۔ اس روز سے پتہ نہیں کیوں میں روزانہ بلا ناغہ تہجد کی نماز پڑھ کر آپ کے لیے دعا مانگنے لگا۔ کل رات دُعا کے دوران چند ساعت کے لیے میری

گود میں ایک بچہ ڈال دیا گیا۔ اور مجھ سے کہا گیا کہ قدرت اللہ کو یہ خوشخبری دے دو کہ اس کے ہاں ایک بچہ ہوگا۔

خونی نامناسبت کی وجہ سے اوّل تو قدرت کے ہاں بچہ ہوتا نہ تھا۔ اور اگر ہوتا بھی تو کسی نہ کسی مرحلے پر ضائع ہو جاتا۔ اس لیے قدرت نے اس خط کو چنداں اہمیت نہ دی۔

ایک سال کے بعد قدرت کے گھر بچہ تولد ہوا۔ ان دنوں بیگم لندن میں تھیں۔ جس ڈاکٹر نے آپریشن کیا اس کا بیان تھا کہ میں مذہبی آدمی نہیں ہوں۔ مشکل کے وقت کبھی خدا کی طرف رجوع کرنے کا خیال نہیں آیا۔ پتہ نہیں اس روز کیا ہوا۔ جب ڈاکٹر عفت شہاب کے بے جان بچے کو شیشے کے مرتبان میں ڈال کر مسلسل چار گھنٹے انگلیوں کی صلیب بنا کر میں دعا مانگتا رہا۔ پھر جب چار گھنٹوں کے بعد بچے میں حرکت پیدا ہوئی تو میرے منہ سے نکلا۔ شکریہ میرے خدا۔

کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ شب بیدار عابد قدرت اللہ کے لیے دعائیں مانگ رہے تھے۔ عابد خاتون کو قدرت اللہ کا گھر دکھایا جا رہا تھا۔ دہریے ڈاکٹر قدرت کے بچے کے لیے خدا سے امید لگائے بیٹھے تھے۔ قدرت اللہ کون ہے۔ پہلی مرتبہ میرے دل میں ایک سوال آ کھڑا ہوا۔

پھر بھائی جان کی بات نے اس پر مہر لگا دی۔

بھائی جان میرے بھائی نہیں بلکہ نقشبندی سلسلے کے ایک بزرگ تھے، وہ بے حد خلیق تھے نکتہ چینی سے اجتناب کرتے تھے۔ انھوں نے کبھی دوسروں کی بات میں دخل نہ دیا تھا۔

قدرت اللہ سے ان کے رسمی مراسم تھے۔

ایک روز بھائی جان کی موجودگی میں اشفاق احمد آ گیا۔ آتے ہی اس نے قدرت اللہ کا تذکرہ چھیڑ دیا اور محبت اور بے تکلفی سے قدرت کو گالیاں دینے لگا۔

بھائی جان کا منہ سرخ ہو گیا وہ اٹھ بیٹھے اور غیر از معمول غصے میں بولے، مفتی صاحب آپ انھیں سمجھا دیں۔ بیشک یہ ان کے بے تکلف دوست ہیں لیکن ہمارے سامنے ان کے متعلق ایسے الفاظ استعمال نہ کریں۔ ہم برداشت نہیں کر سکتے۔ یہ بات کہہ کر بھائی جان



کمرے سے باہر نکل گئے۔

اشفاق احمد ہکا بکا رہ گیا۔

قدرت اللہ کون ہے جس کے بارے میں بھائی جان بے تکلفی کے کلمات برداشت نہیں کر سکتے۔ میرے لیے قدرت اللہ کے اسرار پر مہر ثبت ہو گئی۔ چونکہ بھائی جان سے مجھے بے حد عقیدت تھی۔

پھر قدرت اللہ بڑی طاقتوں کی ناپسندیدگی کا شکار ہو گیا اور اسے ہالینڈ میں سفیر بنا کر بھیج دیا گیا۔

اس زمانے میں میں بیورو میں تھا۔ بیورو میں میرے ایک ہم کار دوست صفیر تھے۔ صفیر مجھے قاضی صاحب کے پاس لے گیا۔ قاضی صاحب ایک عابد آدمی ہے جس کے پاس لوگ باتیں پوچھنے کے لیے جاتے ہیں۔

قاضی صاحب میری طرف متوجہ ہوئے۔ بولے آپ کچھ پوچھیں گے۔ صفیر جھٹ سے بول اٹھا ان کے ایک دوست ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ دیکھئے کہ وہ کب واپس آئیں گے۔ قاضی صاحب نے مجھ سے پوچھا آپ کے دوست کا کیا نام ہے۔ قدرت اللہ میں نے جواب دیا۔ قاضی مراقبے میں چلے گئے کچھ دیر کے بعد انھوں نے سر اٹھایا یوں جیسے کوئی دھچکا لگا ہو۔ بولے یہ آپ نے کیا کیا۔ بکری کو شیر کے سامنے ڈال دیا۔ بھئی میں تو ایک چھوٹا سا عاجز آدمی ہوں۔

قاضی صاحب کا مطلب کیا ہے۔ کیا قدرت اللہ شیر ہے۔ میں گھبرا گیا یا اللہ یہ کیا اسرار ہے۔

قدرت اللہ کے بھید کو جاننے کے لیے میں نے فیصلہ کر لیا کہ لاہور جا کر خوشاب کے ایڈووکیٹ سے ملوں، بڑی مشکل سے میں نے ان کا مکان تلاش کیا۔ وہ مجھ سے مل کر بے حد خوش ہوئے۔ پیشتر اس کے کہ میں قدرت کا ذکر چھیڑتا، انھوں نے خود ہی بات شروع کر دی۔ بولے ایک سال سے مدینہ منورہ سے قدرت اللہ شہاب صاحب کی واپسی کی منظوری آ چکی ہے۔ پھر وہ ہالینڈ سے واپس کیوں نہیں آتے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔

ملک صاحب ایک بات بتا دیجئے۔ میں نے ایڈووکیٹ صاحب سے پوچھا۔ قدرت اللہ کون ہے۔

ملک صاحب مسکرانے لگے بولے ہمیں خود پوری طرح سے علم نہیں۔ چلیے آپ کو ایک بزرگ کے پاس لے چلتے ہیں۔ جو قدرت اللہ صاحب میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔ ہر بات میں انہیں سپورٹ کرتے ہیں۔

میو ہسپتال کے سامنے ملک صاحب ایک تنگ گلی میں مڑ گئے۔ گھوم پھر کر وہ گلی ایک مسجد پر ختم ہوگئی۔ مسجد کے صحن میں ایک چبوترے پر چار ایک پختہ قبریں بنی ہوئی تھیں۔ فاتحہ پڑھ لیجیے۔ ملک صاحب بولے۔

فاتحہ پڑھ کر باہر نکلے تو میں نے پوچھا۔ یہ کن صاحب کا مزار ہے۔ ملک صاحب نے کہا یہ یعقوب سجانی ہیں۔ جب داتا صاحب لاہور میں داخل ہو رہے تھے تو ان کا جنازہ جا رہا تھا۔ جب بھی لاہور آئیں یہاں حاضری دیا کریں۔

ارے تو کیا یہ ہیں وہ بزرگ جو ہر بات میں قدرت اللہ کو سپورٹ کرتے ہیں۔ حیرت سے میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ قدرت اللہ میرے روبرو اجنبی بن کر آ کھڑا ہوا۔ قدرت کی شخصیت پر روشنی ڈالنا میرا کام نہیں۔ میں تو اتنا بھی نہیں جانتا کہ وہ کون ہے۔

-☆-



۱۹۸۹ء

# چھوٹا

مجھے ممتاز مفتی کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا ہے۔ سیانے کہتے ہیں دو مقامات سے دیکھو گے تو ٹھیک سے نظر نہیں آئے گا۔

۱۔ دور سے ۲۔ بہت قریب سے

چونکہ ممتاز مفتی کو بہت قریب سے دیکھا ہے اس لیے غالب امکان ہے کہ ٹھیک سے نہیں دیکھا۔ لہٰذا یہ مضمون سند نہیں۔

ممتاز مفتی زندگی میں ربط سے محروم فرد ہے میل اڈجسٹڈ۔ پیدائشی طور پر چھوٹا آدمی ہے۔ بڑے آدمی سے مل کر جھجک محسوس کرتا ہے۔ گھبراتا ہے، کتراتا ہے۔

اسے کسی بنے سجے گھر میں لے جائیے۔ چلا جائے گا لیکن دل دھک دھک کرے گا، سانس رُکے گا۔ اندر ڈگ مگ ڈگ مگ ڈولے گا۔ یہ میں کہاں آ گیا ہوں۔

اسے کسی اونچے عہدے پر بٹھا دو۔ بیٹھ تو جائے گا لیکن یوں جیسے کانٹوں پر بٹھا دیا گیا ہو۔ افسروں کے ساتھ نہیں گھلے ملے گا۔ چھوٹے سٹاف کے درمیان ایٹ ہوم محسوس کرے گا۔ دفتر کے چپڑاسیوں کو سلام کرنا اس کی پرانی عادت ہے۔

افسر کے ساتھ اس کا برتاؤ یا تو جی حضوریہ ہوتا ہے اور یا کھچا کھچا۔ میانہ روی سے محروم ہے۔ جی حضوریہ تو سراسر جی صاحب۔ جناب، یس سر۔

جسے اچھا سمجھ لے پھر اس کی ہر بات میں اچھائی نظر آتی ہے لیکن دقت یہ ہے کہ جسے برا سمجھے اس میں بھی اچھائیاں نظر آتی ہیں۔ پھر اسے اس بات پر غصہ آتا ہے کہ جسے میں اچھا نہیں سمجھتا اس میں اچھائیاں کیوں نظر آتی ہیں۔

ممتاز مفتی میں شدت ہے۔ اس شدت کا قوام کچھ زیادہ ہی گاڑھا ہے۔ شین والی شدت نہیں شوئے والی شدت۔ زندگی بھر وہ شدت کو وصف سمجھتا رہا۔ اس پر ناز کرتا رہا۔ ٹھنڈے میٹھے کرداروں سے الرجک رہا۔ سمجھتا رہا کہ جس میں شدت ہے اس میں خلوص ہے سچائی ہے۔ اکاسی سال کا ہوا تو پہلی بار اس نے جانا کہ شدت وصف نہیں بلکہ عیب ہے۔ رکاوٹ ہے اور ٹھنڈے میٹھے لوگوں کے دم کرم سے زندگی ہری بھری ہے۔

یہ بات پہلے اس نے رجنیش کے منہ سے سنی۔ وہ رجنیش جو جنسی آدمی کا پرچارک ہے اور اسی وجہ سے رسوائے زمانہ ہے۔ رجنیش کی زبان میں مٹھاس تھی عجز تھا۔ بے انداز اثر تھا۔ ممتاز مفتی نے رجنیش کی بات سنی، جان لی۔ سچے دل سے مان لی۔ لیکن عمل نہ اپنا سکا۔ چونکہ شدت اس کی ہڈیوں میں رچی ہوئی تھی۔

صاحبو کسی حقیقت کو جان لینا۔ دل سے مان لینا لیکن عملی طور پر اپنا نہ سکنا یوں ہے جیسے پھانسی پر لٹک گئے۔ لٹکے رہے۔ کاش وہ شدت کو وصف ہی سمجھتا رہتا ہے۔

ممتاز مفتی کو غصہ بہت آتا ہے۔ وہ غصہ جو بھوت بنا دیتا ہے۔ دھول اڑاتا ہے۔ خود کو بھلا دیتا ہے۔

عرصہ دراز ہوا کہ اس نے جان لیا تھا کہ غصہ درحقیقت دوسرے کی خطا پر خود کو سزا دینے کا نام ہے۔ خود کو چاٹی میں ڈال کر بلوہنے کا عمل ہے۔ جان لینے کے باوجود مان لینے کے باوجود وہ آج تک خود کو چاٹی میں ڈال کر بلوہنے پر مجبور ہے۔ اس کے غصے کے کوائف منفرد ہیں۔

مثلاً آپ نے اسے کچھ کہہ دیا۔ جواب میں وہ جی ہاں جی ہاں کرتا رہا۔ گھر جا کر بیٹھے بٹھائے اسے خیال آیا کہ آپ نے تو یہ کہا تھا۔ یعنی آپ نے یہ کہہ کر اس کی توہین کی تھی۔ جواب میں اسے جی ہاں نہیں کہنا چاہیے تھا۔ دفعتاً اسے غصہ آ جائے گا۔ خون سر کی جانب یورش کرے گا۔ کنپٹیاں بجنے لگیں گی۔ ذہن میں آگ لگ جائے گی۔ ذہنی دھینگا مشتی شروع ہو جائے گی۔

اسے کبھی موقعہ پر روبرو غصہ نہیں آیا۔ لہٰذا توتو میں میں نہیں ہوئی۔ ہاتھا پائی کی نوبت



نہیں آئی۔ اس کا غصہ کمزور اور ڈرپوک آدمی کا غصہ ہے۔ بے بسی کا اظہار ہے۔

ہاں اگر ذہنی دھینگا مشتی کے فوراً بعد آپ سامنے آ جائیں تو روبرو اظہار ہو جائے گا۔ شوں سے غصہ کی بوتل کھل جائے گی۔

عورت کے متعلق ممتاز مفتی کا رویہ کھٹ مٹھا ہے جسے انگریزی میں لو، ہیٹ ریلیشن شپ کہتے ہیں۔

اس میں ایک ریڈار قسم کا ریسیور لگا ہوا ہے۔ قرب و جوار میں عورت آ جائے تو وہ ٹک ٹک کرنا شروع کر دیتا ہے اور اگر آنے والی بانکی نار ہو تو ٹھاؤں ٹھاؤں کرنے لگتا ہے۔

ممتاز مفتی کو ہر عورت سے عشق ہے بلا لحاظ رنگ اور خدوخال۔ چٹے سفید رنگ پر تو اس کی جان نکلتی ہے۔ دقت یہ ہے کہ اگر خاتون زیادہ ہی قریب آ جائے تو وہ ڈر کر بھاگ اٹھتا ہے۔ یہ لو۔ ہیٹ ریلیشن شپ اس لیے پیدا ہوا کہ بچپن میں جس خاتون سے وہ شدت سے متاثر ہوا تھا۔ وہ اس کی سوتیلی ماں تھی۔ اور وہ بڑی حسین خاتون تھی۔

پیدائشی طور پر ممتاز مفتی کو فینٹسی کی بیماری لاحق ہے۔ وہ خالی الذہن ہونے کی کیفیت سے محروم ہے۔ اس پر عائد ہے کہ وہ اپنے ذہن میں کسی خیال کے دہی کی پھٹکی ڈال کر اسے بلوہتا رہے۔ اس کی فینٹسی شیخ چلی کی طرح امید افزا یا خوش کن نہیں ہوتی۔ اس میں تلخی ہوتی ہے۔ چڑچڑ ہوتی ہے۔ غصہ ہوتا ہے۔ شرمندگی ہوتی ہے۔ جنس ہوتی ہے۔

جنسی فینٹسی سے بچنے کے لیے اس نے شیخ چلیت کا سہارا لیا۔ پہلے کرائیڈن سے سڈنی تک ہوائی جہاز چلاتا رہا۔ پھر دس اوورز میں ساری ام سی سی کو آؤٹ کرتا رہا۔ پھر اس نے ایک ایسی شعاع ایجاد کر لی جو ایٹمی ری ایکٹروں کو جام کر دیتی تھی۔ اور وہ ہوائی جہاز پر سوار ہو کر دنیا بھر کے ایٹمی ری ایکٹروں کو جام کرنے میں مصروف رہا۔

ممتاز مفتی ازلی طور پر اکیلا ہے۔ اکیلے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو جان بوجھ کر التزاماً الگ رہنا پسند کرتے ہیں۔ محفل لگ جائے تو ڈوبتے نہیں۔ تیرتے رہتے ہیں۔ دوسرے وہ جو محفل سے گھبراتے ہیں۔ اکیلے میں سالم محسوس کرتے ہیں۔ محفل میں ادھورے۔

ممتاز مفتی دوسری قسم کا اکیلا ہے۔ جب بھی دروازہ بجتا ہے تو وہ چونک جاتا ہے۔ کوئی آ نہ جائے۔ کسی کو ملنے اوّل تو جاتا ہی نہیں۔ اگر جائے تو راستے میں ان جانے میں دعائیں مانگتا جائے گا کہ صاحب خانہ گھر پر نہ ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ اگر محفل لگ جائے تو اس کی گھبراہٹ دور ہو جائے گی اور وہ محفل میں ڈوب جائے گا۔

اگر آپ ممتاز مفتی کو ایک کمرے میں بند کر دیں جہاں اس کی ضروریات اسے ملتی رہیں تو بے شک چھ مہینے کے بعد آ کر دروازہ کھولیں۔ ممتاز مفتی یوں ہشاش بشاش بیٹھا ہوگا جیسے ابھی ابھی روز گارڈن کی سیر کر کے آیا ہو۔

اس نے زندگی بھر نہ باقاعدہ ورزش کی ہے نہ سیر کی ہے۔ پچھلے دنوں ڈاکٹر نے کہا آپ بوڑھے ہو گئے ہیں آپ کو چاہیے کہ باقاعدہ روزانہ سیر کریں۔

مفتی نے کہا ڈاکٹر صاحب سوچ لیجیے کیونکہ میں نے زندگی بھر کبھی سیر نہیں کی۔ ڈاکٹر نے کہا ضرور سیر کریں۔

مفتی نے دس دن سیر کی پھر وہ بیمار پڑ گیا۔ دو مہینے پڑا رہا۔ ٹانگوں میں درد آج تک نہیں گیا۔

مفتی مہمان نوازی سے بڑا الرجک ہے۔ ظاہر ہے کہ جو ڈرتا ہو کہ کوئی آ نہ جائے وہ مہمان نوازی کیا کرے گا۔ وہ اکثر مہمان سے چائے یا ٹھنڈا پوچھنا بھول جاتا ہے۔ مہمان رخصت ہو جائے گا تو اسے یاد آئے گا کہ او ہو چائے کا تو پوچھا ہی نہیں۔ لوگ انتظار کرتے ہیں کہ مہمان آئے۔ تو کھانا کھائیں۔ مفتی انتظار کرتا ہے کہ کب مہمان جائے تو کھانا کھائے۔

مفتی نے عمر بھر کوشش کی ہے کہ اس کا برتاؤ ایسا نہ ہو جو معزز لوگوں کا ہوتا ہے۔ گھر میں اس نے کبھی خود کو ہیڈ آف فیملی نہیں سمجھا اسی وجہ سے اس کی تحریر میں شوخی ہے۔ بے تکلفی ہے۔ چھیڑ ہے۔ اس نے کبھی غور سے خود کو آئینے میں نہیں دیکھا۔ وہ آئینہ سامنے رکھے بغیر شیو کرتا ہے۔ اگر کبھی اتفاقاً آئینہ دیکھ پائے تو اسے دھچکا لگتا ہے۔ ارے میں یہ ہو گیا۔



اس غیر معزز رویے کے نقصانات بھی ہیں جو برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ مثلاً ۸۴ سال کی عمر کے باوجود گھر میں اسے ایسی پوزیشن حاصل نہیں جسے قابل رشک کہا جا سکے۔

گھر میں کوئی بھی اس سے خوش نہیں۔ بیوی بیچاری بڑی دکھی ہے۔ میاں نے کبھی اکیلے میں بیٹھ کر بیوی کی دکھ سکھ کی باتیں نہیں سنیں۔ کبھی اس کی شکایات پر دھیان نہیں دیا، یہاں تک کہ پڑوسن کی بے حیائی کی بات پر بھی کان نہیں دھرا۔

گھر میں کسی کو ادب خصوصاً اس کی تحریروں سے دلچسپی نہیں۔ بیوی کہتی ہے کیوں خواہ مخواہ جھوٹی کہانیاں لکھ لکھ کر اپنی عاقبت خراب کر رہے ہو۔ ایک انٹرویو میں صحافی نے اس کی بیوی سے پوچھا۔ آپ کے میاں میں کوئی خوبی ہو گی جو آپ کو پسند ہے۔ جواب میں بیگم نے کہا۔ کوئی ہو تو بتاؤں نا۔ کوئی ہے ہی نہیں۔

دراصل مفتی کو توجہ دینے کے لیے وقت نہیں ملتا۔ اسے بہت کچھ لکھنا پڑتا ہے۔ کچھ ہانڈی روٹی کے لیے کچھ ادب کے لیے۔ جو وقت بچتا ہے وہ ہومیو پیتھی کھا جاتی ہے۔

اللہ سے مفتی کے تعلقات ادلتے بدلتے رہے ہیں۔ بچپن میں وہ اللہ سے خوف زدہ رہا۔ سمجھتا تھا کہ اللہ نے ایک بھٹی جلا رکھی ہے، ہاتھ میں سونٹا پکڑ رکھا ہے۔ جو بھی آتا ہے اسے سونٹا مار کر بھٹی میں ڈال دیتا ہے۔

پڑھ لکھ کر وہ اللہ سے منکر ہو گیا۔ بلکہ اس کی بے ادبی کرنے میں لذت حاصل کرنے لگا۔ جب وہ پچاس سال کا ہوا تو ایک بزرگ نے اس پر رقت طاری کر دی۔ پتہ نہیں کیا ہوا۔ اس کا رُخ بدل گیا۔ بیٹھے بٹھائے بے وجہ بدل گیا۔ اسے ڈال ڈال پات پات میں اللہ نظر آنے لگا۔ آج کل وہ حیرت میں ڈوبا ہوا ہے کہ اللہ اس پر اس قدر مہربان کیوں ہے۔ قدم قدم پر اس کی مدد کیوں کرتا رہتا ہے۔

فرصت کے وقت وہ اللہ کو پاس بٹھا کر اس سے باتیں کرتا رہتا ہے۔ کام کی باتیں نہیں۔ ادھر اُدھر کی، گپ شپ، اللہ تجھے پتہ ہے آج مجھے ایک لڑکی کا خط موصول ہوا ہے۔ بڑی بانکی لڑکی کا۔ لکھتی ہے جو تو ایلی ہے تو میں بھی ایلین ہوں۔ آج کل مفتی کی کہانیوں میں اللہ زبردستی آ گھستا ہے۔ مفتی میں عقیدے کا فقدان ہے عقیدت کی بھرمار ہے۔

اللہ نہ کرے کہ مفتی کو آپ سے عقیدت ہو۔ ہو جائے تو آپ زچ ہو کر رہ جائیں گے چونکہ مفتی کو شکر گزاری کی بیماری لاحق ہے۔ قدرت اللہ شہاب کو عمر بھر شکایت رہی کہ وہ مفتی کی عقیدت کا شکار ہے اور اس لیے مظلوم ہے۔

مفتی کو ادیب ہونے پر فخر نہیں ہے۔ بلکہ معذرت ہے۔ اس نے کبھی نہیں چاہا تھا کہ ادیب بنے۔ اتفاق سے بن گیا۔ تالی بجی، پھر تالی کا ایسا چسکا پڑا کہ آج تک لکھنے پر مجبور ہے۔

مفتی کو اردو نہیں آتی۔ اس نے کبھی اردو ادب کا مطالعہ نہیں کیا۔ جب اس نے لکھنا شروع کیا تو اہل زبان بڑے ناراض ہوئے۔ انہوں نے شور مچا دیا مفتی کو زبان نہیں آتی بند کرو۔ لکھنا بند کرو۔ وہ سچ کہتے تھے واقعی مفتی کو زبان نہیں آتی تھی۔ وہ کہتے رہے، مفتی لکھتا رہا۔ اس نے لکھ لکھ کر اپنی زبان خود وضع کر لی۔ اب لوگ کہتے ہیں مفتی کے لکھنے کا انداز منفرد ہے تو اسے یقین نہیں آتا چونکہ اب بھی اسے زبان نہیں آتی۔

مفتی نے لکھ کر ادب پر کوئی احسان نہیں کیا نہ ہی خدمت کی ہے۔ الٹا ادب نے مفتی پر احسان کیا ہے کہ اسے اہمیت عطا کر دی ہے۔ زندگی بے مصرف نہیں رہی۔

وہ سوچنے والے ادب کو ادب نہیں مانتا۔ کہتا ہے ادب جذبہ ہے سوچ نہیں۔ ادب کا مقصد انسان میں مثبت جذبات جگاتا ہے ہمدردیاں پیدا کرنا ہے۔ انسان کو انسان کے قریب تر لانا ہے۔ سوچ کو جذبے میں بھگو کر پیش کرنا ہے۔ اگر تحریر میں تاثر نہیں، اگر وہ قاری میں جذبے کی بھیگ پیدا نہیں کرتی تو بے کار ہے۔

مفتی کہتا ہے کہ اللہ نے مجھ میں ایک کمپیوٹر لگا رکھا ہے پتہ نہیں اسے اللہ کی دین سمجھوں یا عذاب۔ اس کمپیوٹر نے میری زندگی حرام کر رکھی ہے۔ یہ کمپیوٹر میری ہر بات پر اپنی کمنٹ دیتا رہتا ہے۔ اگر میں آپ سے کہوں کہ آپ مجھے بہت یاد آتے ہیں تو وہ چیخ کر کہے گا کیوں جھوٹ بول رہا ہے۔ اگر میں کہوں کہ میں نے ایک اچھی کہانی لکھی ہے تو وہ بولے گا۔ کیوں خود نمائی کر رہا ہے۔ محفل میں کوئی بات کروں تو کہتا ہے کیوں نمائشی باتیں کرتا ہے۔ کھانے کو ناپسند کروں تو چلاتا ہے، ناشکرا، ناشکرا۔ اس کمپیوٹر کی مسلسل نکتہ چینی کی وجہ سے



میں اپنی تحریروں میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ مجبوری ہے۔

ممتاز مفتی نے بڑی محبتیں کی ہیں۔ لیکن بڑی دیر کے بعد اسے اس حقیقت کا شعور ہوا کہ دراصل اسے محبت کرنے کے عمل یا کیفیت سے محبت تھی۔ محبوب سے نہیں۔ "بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے" کی کیفیت سے محبت تھی۔ محبوب کی اہمیت تو تھی لیکن ضمنی۔

اس کے لیے محبوب میں چند اوصاف کا ہونا لازم ہے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ رنگ گورا ہو۔ خدوخال اہم نہیں عمر رسیدہ ہو۔ غیار ہو اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ محبوب میں ہرجائیت کی واضح جھلک بلکہ دھونس موجود ہو۔ مفتی کسی نیک یا وفادار خاتون سے محبت نہیں لگا سکتا۔ آج کل کی لڑکیاں اسے اپیل نہیں کرتیں۔ محبت لگانا ایک فن ہے۔ یہ کھٹی مٹھی لڑکیاں بھلا کیا جانیں کہ محبت کیا شے ہے۔

مفتی کے نزدیک محبوب میں ممتا کا ہونا ضروری ہے، ممتا بھرے لگاؤ کے ساتھ بے وفائی کی دھونس کا ہونا بھی لازم ہے۔ اسے طوائف قسم کی عورت سے بڑی دلچسپی ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ اس کی کہانیوں میں طوائف کا بڑا تذکرہ ہوتا ہے۔

مفتی کا کہنا ہے کہ محبت میں چار مرحلوں سے گزرنا ضروری ہے ورنہ آپ کے کردار کی تکمیل نہیں ہو گی:

۱۔ کسی سے ٹوٹ کر محبت کرنا۔
۲۔ کامیابی، کہ محبوب دل و جان سے تمہیں اپنا لے۔ تخت پر بٹھا کر مورچھل کرے۔
۳۔ پھر لات مار کر تخت کے نیچے گرا دے۔ تذلیل کرے۔
۴۔ اور آخر میں آپ محبوبہ سے بے نیاز ہو جائیں۔ وہ تمہاری یادوں سے ہی خارج ہو جائے۔ زخم مندمل ہو جائے یوں جیسے کبھی لگا ہی نہ تھا۔

مفتی کے نزدیک کردار کی تکمیل کے لیے ان چاروں کیفیتوں سے گزرنا ضروری ہے۔

-☆-